مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں



خواجہ غلام السیدین

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

ذکیہ جمیل

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

• خواجہ غلام السیدین

ذکرِ جمیل

• صالحہ عابد حسین

ناشر : خواجہ غلام السیّدین ٹرسٹ

بار اول : ۱۹۷۴ء

طباعت : جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی

سرورق : انوار انجم

قیمت : ۳۰ روپے

ناشر : سیّدین میموریل ٹرسٹ
جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۲۵

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔۲۵

● مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

خواجہ غلام السیّدین

عزیز سیّدین

● ذکرِ جمیل

صالحہ عابد حسین

دیباچہ

خواجہ غلام السیدین نے اپنی یہ خود نوشت سوانح کئی برس پہلے لکھنی شروع کی تھی مگر صد حیف کہ وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ جتنی لکھی تھی وہ بھی اس حالت میں نہ تھی کہ بغیر نظرثانی کے شائع کی جا سکتی۔

گذشتہ دنوں ڈیڑھ، پونے دو سال سے وہ میرے گھر کے برابر اپنے نئے گھر میں آ کر رہنے لگے تھے۔ پہلے اوکھلا سے نئی دہلی میں ہفتہ میں دو ایک بار ان سے ملنے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ہفتہ میں کم سے کم ایک دفعہ وہ بھی میرے پاس چند گھنٹے کے لئے آ جایا کرتے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد دن میں ان کے گھر کے کم سے کم تین چار چکر تو میرے ہو جاتے۔ صبح ٹہلنے جاتی تو ان کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتی کہ جاگ رہے ہیں یا نہیں، جاگتے ہوتے تو ذرا دیر کو مل کر خیر خبر پوچھ کر چلی آتی۔ پھر گیارہ بجے دن کو یا میں جاتی یا وہ خود آتے۔ اسی طرح شام اور رات کو۔ جب ان کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ کبھی دن میں بھی، اور شام کو روزانہ آتے اور ہم اکٹھے ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب میں جاتی تو دیکھنے کی کوشش کرتی کہ اگر وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھے لکھ رہے ہیں تو میں چپکے سے واپس چلی جاؤں۔ مگر محبت کرنے والوں کے دلوں میں جو لاسلکی لگی ہوتی ہے وہ ان کو باخبر کر دیتی دروازہ کھلا ہوتا تو میز پر بیٹھے بیٹھے یا دروازہ کھول کر، دونوں بانہیں پھیلا دیتے۔ اور میں اس مقدس سینے سے لگ کر دنیا کی ہر دولت پا لیتی۔ وہ کاپی بند کر دیتے یا کاغذات پر

سادہ کا غذ رکھ دیتے اور مسکرا کر کہتے "پھر آ گئی ـــ کام نہیں کرنے دے گی تو!" میں کبھی کہتی جانے کب سے کام کر رہے ہیں۔ اچھا ہے میرے بہانے ذرا سا آپ کو آرام مل جاتا ہے کبھی اپنے کو مجرم محسوس کرتی کہ انہیں کتنے کام کرنے ہیں اور میں اس وقت بھی نازل ہو جاتی ہوں۔" آپ کام کیجئے بھائی جان میں تو بس ذرا یوں ہی دیکھنے آ گئی تھی ـــ میرا بھی بہت سا کام پڑا ہے۔"

"اب تو آ گئی ہے تو کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

"جی ـــ یوں کہئے آپ خود بہانہ ڈھونڈ رہے تھے کام چھوڑنے کا!" ایک دلنواز مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر جاتی۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگتے۔ کبھی کبھی وہ اداسی کے لہجے میں کہتے "کام تو ہوتا ہی نہیں!" علاوہ دو کتابوں کی تصنیف کے ان کو اور بھی بہت سے کام رہتے تھے۔ جن میں بہت سا وقت تو خطوں کے جواب دینے ہی میں گذر جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی دوسری کتابوں کے نوٹس وغیرہ ترتیب دینا چاہتے تھے، لاتعداد خطوں کو ترتیب دینے کی کوشش تھی جس میں کبھی کبھی میں ان کی مدد کر دیتی۔ مگر سب سے زیادہ فکر ان کتابوں کی تھی جس میں ایک تو یہی خود نوشت سوانح "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" ہے اور دوسری "اسلام مذہب امن" انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ آخری سفر اب دور نہیں اور اس سے پہلے یہ کتاب مکمل ہونا چاہئے۔ سفر جس کے لئے وہ ہر وقت تیار تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ خود نوشت سوانح کئی سال پہلے انھوں نے لکھنی شروع کی تھی لیکن ان کو وقت نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ ہمیشہ دوسرے کام ان کا وقت لے لیتے تھے۔ مجھے سخت اشتیاق تھا کہ بھائی جان کی آپ بیتی کو جلد مکمل ہوتے دیکھوں۔ اکثر ان سے تقاضا کرتی۔ کبھی وہ بات مذاق میں اڑا دیتے کبھی سنجیدگی اور افسردگی سے کوئی ایسا جملہ کہہ دیتے جس سے یہ محسوس ہوتا کہ انہیں امید نہیں کہ یہ کتاب مکمل کر سکیں گے۔ اگر مجھے دیکھ کر جلدی سے کاپی بند کر دیتے تو میں سمجھ جاتی کہ یہ آپ بیتی تھی۔ میں دیکھنے پر اصرار کرتی تو کاپی دراز میں بند کر کے کچھ شرارت کچھ تضحیک

کے انداز میں مجھے دیکھتے مطلب یہ ہوتا کہ اب کیا کرے گی؟ لیکن کبھی کبھی انھوں نے اس کا کوئی حصہ مجھے سنایا بھی۔ خواجہ سجاد حسین کے بارے میں جو لکھا ہے وہ مجھے پڑھ کر سنایا۔ امّاں سے متعلق جو حصہ ہے وہ تو انھوں نے میرے ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ بھی کر دیا ہے جب میں پوچھتی کہ آخر آپ نے کہاں تک لکھا ہے تو مبہم سا جواب دے کر ٹال دیتے۔ وہ پنسل سے لکھے ہوئے مسودہ کو اسی زمانے میں نظر ثانی کر کے قلم سے لکھ رہے تھے۔ خاندانی حالات اور شخصیات کے بارے میں بعض وقت مجھ سے سوالات بھی کرتے تھے۔ انتقال سے چند ہفتے پہلے مجھ سے کہا "کچھ پڑھے گی؟" میں نے کہا "دل وجان سے۔" انھوں نے کچھ الگ کاغذوں پر لکھا ہوا ایک مسودہ مجھے دیا۔ یہ انھوں نے اپنے بھائی بہنوں کے بارے میں لکھا ہے ... یہ حصہ دراصل کتاب کی تکمیل کے وقت، بہت آخر میں جا کر آتا، لیکن ایک دن جانے کیا خیال آیا، شاید یہی سوچا ہو کہ آپ بیتی تو مکمل ہو نہیں سکے گی ـــ اسی لئے یہ حصہ لکھ ڈالا اور مجھے پڑھنے کو بھی دیا کہ شاید مجھے یاد رہ جائے کہ یہ آپ بیتی میں شامل کرنا ہے۔

کتنی بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ زندگی بڑی ظالم، بڑی سخت جان ہے۔ لیکن ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو زندگی کے ظلم وستم اور اس کے بعد کے دنوں میں اپنی سخت جانی کا پورا اندازہ ہوا کہ جس ہستی کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، جس کی ایک دن کی جدائی بھی دوبھر ہوتی ہے۔ اس کا دائمی فراق دیکھنا پڑا اور پھر بھی کسی نہ کسی طرح جینا پڑا، زندگی کے تقاضے پورے کرنے پڑے۔ دل کے محیطِ گریہ ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی لب آشنائے خندہ رہے۔ اب معلوم ہوا کہ فراق کے کرب اور فراق کی لذّت ہی کا نام زندگی ہے ؎

گرمئ آرزو فراق، شورشِ ہائے وہو فراق
موت کی جستجو فراق قطرے کی آبرو فراق

سچ پوچھئے تو فراق کے یہ جان لیوا دن میں نے اس کتاب کے سہارے کاٹے ہیں۔ ان کی وفات کے تیسرے دن ۲۱ر دسمبر کو میں ان کے کمرے میں ان کی میز کے سامنے کھڑی

تھی کہ بہت سی کتابوں اور کاپیوں کے درمیان مجھے یہ جانی بوجھی پرانی ڈائریاں نظر آئیں جن پر مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ بیتی لکھا کرتے تھے۔ یہ اُن کی آپ بیتی کا پہلا اور دوسرا مسودہ تھا۔ میرے تڑپتے دل کی تسکین کا آخری ذریعہ۔ میں چپ چاپ ان کو لے آئی اور اگلی کئی راتیں ان کو پڑھنے میں کاٹ دیں۔ وہ کتاب جسے مجھے چھونے کا حکم نہ تھا، جسے وہ چاہتے تھے کہ مکمل کرنے کے بعد ہی مجھے پڑھنے کو دیں ... آج وہ کاپیاں میرے ہاتھ میں تھیں!! دل اور دماغ دونوں نے کہا صرف یہ کام — ان کا کام — تجھے زندگی کی صلیب اٹھانے کی طاقت دے سکتا ہے۔

گذشتہ سال بھر میں نے اس کتاب پر کام کیا ہے۔ ان کا خط بہت خوبصورت اور بہت باریک تھا اور گذشتہ چند سالوں میں تو اور بھی چھوٹا چھوٹا لکھنے لگے تھے اور اسکا پڑھنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کتاب پڑھنے کے مجھے اندازہ ہوا کہ عابد صاحب کی مدد کے بغیر میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ ان کو پڑھوانا ضروری تھا، ان سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں، مشورہ کرنا تھا۔ کسی طرح دس بارہ دن، رات کے وقت میں ان کو یہ مسودہ سناتی رہی۔ جب زخم تازہ ہو تو اس وقت ذرا سی ٹھیس تڑپا دیتی ہے۔ جس طرح اس کو سنایا اور سنا گیا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ دوسری منزل اس کو صاف کرنے کی تھی۔ انگریزی الفاظ اور جملے انھوں نے بہت جگہ استعمال کئے ہیں ان کا پڑھنا اور بھی مشکل تھا۔ بیشتر جگہ انگریزی لفظوں اور جملوں کے ترجمہ پر سوالیہ نشان تھا کہ وہ اکثر عابد صاحب سے اور کبھی کبھی مجھ سے بھی، پوچھ کر یا محاورہ ترجمہ کرنے کے لئے سوالیہ نشان کر دیا کرتے تھے۔ کہیں جگہ خالی چھوڑ دی ہے اور سوالیہ نشان لگا دیا ہے، کہیں لکھتے لکھتے دو تین صفحے چھوڑ دیے ہیں۔ شاید وہاں کچھ اور لکھنا چاہتے تھے۔ جگہ جگہ خطوں کے لئے یا کسی کتاب کے اقتباس کے لئے جگہ چھوڑ دی ہے ...... ان سب کو پُر کرنا آسان کام نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح عابد صاحب کی مدد سے یہ ہفتخواں

میں نے سر کیا اور اس منزل سے گزر گئی۔

میں نے بیشتر جگہ انگریزی جملوں اور لفظوں کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مگر جہاں کہیں انگریزی لفظ باقی رکھنے ضروری محسوس ہوئے ہیں، رہنے دیے ہیں۔ خالی جگہوں کو زیادہ تر پُر کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے ان کے خطوط اور کاغذات کو چھاننے کی ضرورت پڑی۔ لیکن بعض چیزیں نہیں ملیں یا یہ یقین نہ ہو سکا کہ وہ کیا بات کہنا یا کیا واقعہ بیان کرنا چاہتے تھے۔ وہاں ایک یا آدھا جملہ عبارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے نکال دینا پڑا ہے۔ دو چار جگہہ لفظوں کو بدلا ہے۔ وہ مجھ سے (از راہِ محبت و قدر دانی) کہا کرتے تھے "تو جہاں سے چاہے میری عبارت درست کر سکتی ہے ..." عبارت میں دخل در معقولات کی گستاخی تو نہیں کر سکتی تھی، البتہ کہیں کہیں لفظوں کی ترتیب بدلنے یا خالی جگہ پُر کرنے کی جرارت کی ہے۔ خطوط وغیرہ کے اقتباسات دینے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے لیکن بعض جگہ ناکام رہی۔ سب سے سخت وقت مجھ پر وہ ہوتا تھا جہاں لکھتے لکھتے انھوں نے جگہ چھوڑ دی ہے ـــ جانے وہ کیا کیا لکھنا چاہتے ہوں گے؟ یہ احساس میرے لئے جاں گزا ہوتا۔ کبھی بیسیوں صفحے نقل کرتی چلی جاتی اور دل و دماغ یہ دھوکہ کھاتے رہتے کہ وہ سامنے بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ علمی، ادبی باتیں، گہرے خیالات، زندگی کے تجربات! کبھی میں حال کی پتھریلی چٹان سے ماضی کی جنّت میں کھو جاتی جب کشمیر میں ہم اور وہ ساتھ ساتھ سیر کرتے تھے، اسکول دیکھنے جاتے تھے، لوگوں سے ملنے جاتے تھے، اُن سے دل بھر کر باتیں کرتے تھے ـــ اور کبھی آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، لکھنا ناممکن ہو جاتا یہ احساس کہ یہ سب کاغذ کے پرزے ہیں... یہ باتیں کرنے والا اب نہیں ملے گا۔ مگر میرے دل میں ایک لگن تھی کہ جیسے بھی ہو، اپنی محدود صلاحیتوں اور خراب صحت کے باوجود مجھے اس کام کو مکمل کرنا ہے ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ بے بہا مسودہ یوں ہی پڑا رہ جائے

سیدین صاحب اس آپ بیتی میں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ یہ ایک مستقل کتاب ہوتی

جس میں ان کے قیمتی تجربات، ان شخصیتوں کا مفصل ذکر جو ان کو بہت عزیز تھیں۔ جن سے انھوں نے کچھ حاصل کیا تھا، موجودہ حالات پر اپنے خیالات کا اظہار، اور انھوں نے دنیا بھر کے جو تعلیمی سفر کئے ہیں ان کا بیان اور خدا ہی جانے اور کیا کچھ وہ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ صرف اپنی چالیس سال کی زندگی کے حالات ہی لکھ پائے۔ مگر اس کو پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے پیش نظر "آپ بیتی" لکھنا نہ تھا۔ اپنے پر نانا حالیؔ کی طرح ان میں حد سے زیادہ انکسار اور خود پوشی کی تھی۔ اپنا ذکر انھوں نے برائے نام آٹے میں نمک کے برابر کیا ہے کہ وہ اپنے حالات کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ انسان جب اپنی کہانی خود لکھے تو کیا کچھ نہیں کہہ سکتا؟ اور سیدین صاحب نے اپنی شخصیت پر کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہوتی تو وہ لوگوں کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوتی مگر یہ ان کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھا۔ جہاں ان کی تعریف یا قابلیت کا ذکر بالکل ہی ناگزیر ہو جاتا ہے، وہاں وہ "حسن اتفاق" یا "غلط فہمی" یا "بر بنائے حسن ظن" وغیرہ جیسے جملوں کا استعمال کر کے معذرت سی کر لیتے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں یہ صفت جو سیدین کی اہم خصوصیت ہے، کتنی کمیاب ہے۔

سیدین صاحب نے "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" کے بابوں کی ایک فہرست بنائی تھی جن میں سے صرف تین باب وہ مکمل کر سکے۔ کاپی میں ایک الگ کاغذ پر یہ فہرست اس طرح مرتب کی گئی ہے:۔

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

۱۔ ایک گذرا ہوا خواب ——— پانی پت

۲۔ باز گو از نجد و از یاران نجد ——— علی گڑھ

۳۔ اگر فردوس بر روئے زمین است ——— کشمیر

۴- ....

۵- کان نمک ...... حکومتِ ہند

(علاوہ معمولی معنی کے یہاں وہ لوگ بھی تھے جو زندگی کو نمکینی بخشتے ہیں)

۶- مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن دوست میری زندگی میں عورتوں کا مقام

چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ ما رسید!

۷- دنیا میرا گاؤں ہے ___ غیر ملکوں کی سیر اور کام

۸- غبارِ خاطر ___ میرا دیس، میری دنیا (تنقیدی)

۹- مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا ___ میری کتابیں

۱۰- تعلیم کا شغل

۱۱- سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب (زندگی پر نگاہ بازگشت)

۱۲- ہندوستان اور پاکستان (ریڈیو پر چھیڑ چھاڑ)

جن عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں، شناساؤں، بچوں اور عورتوں کا وہ ذکر کرنا چاہتے تھے اور ان کی زندگی و سیرت پر روشنی ڈالنا چاہتے تھے ان کی ایک مکمل فہرست بھی مسودہ میں نتھی مجھے ملی ہے۔ فہرست بنانے کا خیال شاید اس لئے آیا ہوگا کہ ہزاروں دوستوں اور شناساؤں میں انتخاب تو بہرحال کرنا تھا۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ان تین بابوں میں آچکا ہے۔ لیکن بہت سے ایسے ہیں جن پر وہ اور زیادہ لکھنا چاہتے تھے۔ کسی باب میں ان کا نام آیا ہے تو یہ لکھ دیا ہے کہ مفصل ذکر بعد میں آئے گا۔ ان میں ان کے عزیز ترین دوست ذاکر صاحب، عابد صاحب قدسیہ زیدی بھی ہیں۔ اور ان کی محبوب بیوی عزیز جہاں بھی ___ عزیز سیدین کے بعد انھوں نے خط کی صورت میں صرف ایک مضمون ان پر لکھا تھا۔ جس کا ایک ایک لفظ محبت، خلوص اور گہری دوستی میں ڈوبا ہوا ہے۔

میں ان حضرات کے نام نیچے درج کر رہی ہوں جن کا وہ ذکر کرنا چاہتے تھے۔ فہرست کے حاشیہ پر شہروں اور مقامات کے نام کے حروف بھی درج ہیں، اُنہیں میں چھوڑ رہی ہوں۔

فہرست یوں ہے:۔

گاندھی۔ نہرو۔ آزاد۔ سروجنی نائیڈو۔ ذاکر۔ پانیکار۔ عابد۔ زیدی۔ راس مسعود۔ گوپالاسوامی۔ بی، این راؤ۔ کھیر۔ ضیاء الدین۔ اثر۔ تجمل حسین۔ علی گڑھ کے اساتذہ علی گڑھ کے ساتھی۔ مختار حامد علی۔ منظور۔ محمود۔ آغا سید ابراہیم۔ بشیر الدین نیر۔ لئیق احمد سرور حسن۔ رشید صدیقی۔ احمد عباس۔ اظہر۔ خواجہ غلام الثقلین۔ خواجہ سجاد حسین مولانا حالی خواجہ غلام السبطین۔ نواب مہدی نواز جنگ۔ بعض شاگرد (داؤد۔ فضل حق) سید محمد مستحسن زیدی۔ شاہ عالم خاں۔ کے، پی، ایس، سرمہیشور ورما۔ عبداللہ یوسف علی۔ سید رضا حسین (اجمیر) علی یاور جنگ۔ مشتاق۔ زرینہ۔ قدسیہ۔ دلیو کارانی۔ عزیز۔ دختران۔ مصداق۔ باجی۔ لیلا۔ اماں۔ مجی۔ سیدہ۔ پھوپھیاں۔ لیڈی مسعود۔ کرشنا۔ ہیلن کیلر۔ گِل پٹرک .... برہم ناتھ دت۔ میاں بشیر احمد۔ بخاری۔ بیگم شاہنواز۔ ملک راج آنند۔ ترلوک سنگھ۔ راما چندرن۔ چمن لال کپور۔ ہرلش چندر۔ جھا۔ ڈاکٹر رے۔ سردار ہردیال سنگھ (سکاؤٹ تارا دیوی) دیاس۔ جے۔ پی۔ نائک۔ جھوار۔ سنت رام۔ مجید۔ شیریں۔ بوا فیروزی۔

ابواب کی فہرست اور اشخاص کی لسٹ پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ اگر مکمل ہو جاتی تو کس پایہ اور درجے کی کتاب ہوتی۔ لیکن جو تھوڑا سا حصہ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی اپنی جگہ بڑا پر اثر، دل چسپ، مفید اور پایہ کی چیز ہے اور اسی لئے اس پر اتنی محنت کر کے چھپوانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یوں تو سیدین صاحب جن لوگوں کا ذکر کرنا چاہتے تھے ان میں سے بہت کم کے بارے میں لکھ پائے مگر سب سے بڑی کمی عزیز سیدین کے ذکر

کی ہے جو ان کی سب سے محبوب ہستی تھیں۔ اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لئے، میں نے یہ کیا ہے کہ سیدین صاحب کے اس خط کے جو انھوں نے "یادِ عزیز" میں ان کے نام لکھا تھا، کچھ حصے درج کر دیے ہیں۔

سیدین صاحب کے مسودوں میں ان کی کئی ڈائریاں مجھے ملی ہیں۔ جن میں زیادہ تر ان کے متعدد سفروں کے حالات ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس کتاب میں ضمیمہ کے طور پر انہیں شامل کر دوں مگر پھر احساس ہوا کہ یہ کچھ بے جوڑ سی چیز ہو جائے گی۔ اس لئے کہ وہ تو خود ایک مبسوط کتاب بن سکتی ہے۔ بشرطِ زندگی ان کے یہ سفرنامے (یا روزنامچے) "دنیا میرا گاؤں" کے نام سے انشاء اللہ آئندہ مرتب کروں گی۔

البتہ سیدین صاحب کی زندگی اور سیرت پر خود میں نے کچھ لکھا ہے اور وہ حصہ دوم میں "ذکرِ جمیل" کے نام سے، اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اس کتاب کے مکمل نہ ہونے پر جو تشنگی محسوس ہوتی ہے اس کی تھوڑی سی تلافی ہو سکے۔

صالحہ عابد حسین

سنہ ۱۹۷۲ء

تمہید

کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص کم سے کم ایک اچھی کتاب لکھ سکتا ہے۔ یعنی خود اپنی زندگی کی کہانی۔ مجھے اس میں بھی شبہ ہے۔ اس کے لئے ایک ضروری شرط تو یہ ہے کہ زندگی میں واقعتاً کچھ باتیں، کچھ واقعات، کچھ کامیابیاں، کچھ ناکامیاں قابلِ ذکر ہوں۔ مگر بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی میں بظاہر معمول یا خلا کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ یا اگر ہوتا ہے تو وہ اس کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ صلاحیت دوسری شرطِ لازم ہے۔ اگر ایک معمولی آدمی بھی اپنی زندگی کی بالکل صحیح اور سچی تصویر کھینچ سکے اور اس میں واقعیت کا رنگ بھر کر دکھا سکے تو اس میں معنویت اور دل کشی پیدا ہو سکتی ہے۔ کارلائل نے لکھا ہے کہ "کسی انسان کی زندگی کے حالات بھی اگر انہیں ایمانداری کے ساتھ لکھا جائے ایک HEROIC نظم کے مانند ہیں خواہ وہ قافیہ کی پابند ہو یا نہ ہو۔" لیکن یہ صلاحیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اور صلاحیت کے علاوہ اس کے لئے غیر معمولی جرأت کی ضرورت ہے۔ اکثر لوگوں کی زندگی میں بہت سی باتیں، خیالات، جذبات، نفسی گتھیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو وہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا، اور اگر موقع ملے تو ان کے سامنے اپنی ایک مثالی، غیر حقیقی تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا اصلیت سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہوتا۔

جب میرے دل میں اس کتاب کو لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو میں اس کے جواز کے لئے اس مفروضہ کلیہ کا سہارا نہیں لے سکا۔ نہ زندگی میں ایسے کارنامے ہیں جن کا بیان کرنا دنیا کی نجات کے لئے ضروری ہو! نہ بیان کی وہ قدرت کہ اس کے نشیب و فراز، اس کی محرومیوں اور کوتاہیوں، اس کی خوشیوں اور تھوڑی بہت کامیابیوں اور اس کی پوشیدہ کمزوریوں کو استادانہ مہارت کے ساتھ بے نقاب کر سکے۔ کیوں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندازِ بیان کا اعجاز مواد کے کھوکھلے پن کو سنبھال لیتا ہے۔ پھر اس کتاب کے لکھنے کا جواز کیا ہے؟ میری خواہش یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ میں بیشتر اپنی زندگی کے حالات بیان کروں۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کی کچھ داستان سناؤں جن سے گذشتہ ساٹھ سال میں مجھے سابقہ پڑا ہے جن کی صحبت سے میں نے فیض اٹھایا ہے، جن میں سے بعض کی زندگی میں میں نے ان قدروں کا جلوہ دیکھا ہے جن کی بدولت انسان کبھی کبھی اپنے ابتدائی زندگی کے کیچڑ سے نکل کر آسمان کی رفعت تک جا پہنچتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو یہ خوش قسمتی نصیب ہو تو اس کا فرض ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق اس میں دوسروں کو شریک کرے ورنہ روزِ قیامت (اگر روزِ قیامت آنا ہے) اس سے سوال کیا جائے گا۔

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ پس چرا با دیگراں نسپردۂ

ہر آدمی کا سابقہ بعض بے اصول اور کم ظرف لوگوں سے بھی پڑتا ہے۔ لیکن بالعموم یہی بہتر ہے کہ ان کو حافظہ کا بار نہ بنایا جائے۔ ان کا ذکر اگر کرے بھی تو محض اس وجہ سے کہ ان کی کوئی پبلک اہمیت ہے یا تھی۔ ذاتی پرخاش کی بنا پر نہیں۔

بعض بزرگوں اور دوستوں کی سیرت اور فکر کا ذکر میں نے اپنی ایک سابقہ تصنیف "آندھی میں چراغ" میں کیا ہے۔ اس کتاب میں کسی حد تک اس سلک مروارید کو جو میرے نصیب میں آئی ہے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں دوسروں کی نظر میں اس کی قدر کیا ہو لیکن میرے لئے وہ زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ ہے۔ اس میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے

اپنے زمانے میں اپنی ذات کا نقش چھوڑا اور ایسے بھی جو پردۂ عدم سے باہر نکلے ایک مختصر سی مدت کے لئے، اور پھر اسی پردے میں پناہ لی۔ دنیا ان سے بالکل واقف نہیں ہو سکی لیکن خود میری زندگی میں (اور زندگی کو بنانے والے کی نگاہ میں) ان کی بھی بعض اعتبار سے ایسی ہی اہمیت ہے جیسے مشاہیر کی۔ کیوں کہ ان کی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھا اور شریف انسان بننے کے لئے کسی شخص کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی زندگی گویا پبلک پلیٹ فارم پر گذارے۔ ہر حیثیت کے آدمی کے لئے یہ ممکن ہے (گو آسان نہیں) کہ وہ کسی حد تک اپنی زندگی میں ایک شاہکار کی شان پیدا کر سکے۔ مجھے عمر بھر (نہ معلوم کیوں) اچھی قدروں کی تلاش رہی ہے اور خواہ ان کو اپنایا ہو یا نہ اپنایا ہو، جہاں کہیں ان کا جلوہ دیکھا ان کو سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا جب کبھی یہ بندگانِ خدا میری زندگی میں داخل ہوئے، وہی کیفیت ہوئی جس کو شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ؎

لختے بہ داز دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دلِ صد پارۂ خویشم

بس شاعر میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ اس کا اشارہ غالباً محبوبانِ خوش جمال کی طرف تھا لیکن میرے بازار میں جمال صرف جمالِ صورت ہی نہیں بلکہ جمالِ سیرت اور جمالِ کردار پر بھی مشتمل رہا ہے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ میں غالباً ۱۹۶۱ء میں کسی کانفرنس کے سلسلے میں بیروت گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک دوست کی دعوت پر لڑکیوں کے ایک ہائی اسکول کی سالانہ تقریب میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ جہاں ان کو وزیرِ تعلیم امتحان میں کامیابی کی سندیں تقسیم کر رہے تھے، اسی اہتمام کے ساتھ جس طرح ہمارے ہاں یونیورسٹیوں میں ڈگریاں تقسیم کی جاتی ہیں یا کی جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں بیروت میں پہلی بار بین الاقوامی حسن کا مقابلہ ہو رہا تھا جس کا اخباروں میں، عوام میں، خصوصاً

میں بہت چرچا تھا اور ظاہر ہے کہ اسکول کی لڑکیاں اس میں بہت دل چسپی لے رہی تھیں۔ جب وزیر تعلیم اپنی تقریر کر چکے تو اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے نہایت فصیح عربی میں ایک تقریر کی جس کا موضوع تھا "جمال کیا ہے؟" اس میں انھوں نے بتایا کہ آج کل جو مقابلہ ہو رہا ہے اس میں تم سب لڑکیوں کو بہت دل چسپی ہے اور یہ ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جمال محض خد و خال کی درستگی اور عارض کی شگفتگی تک محدود نہیں۔ ان چیزوں کی اہمیت بھی ہے لیکن ان میں کوئی پائیداری نہیں۔ عمر گذرنے کے ساتھ ان کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ مگر جمال کی ایسی شکلیں بھی ہیں جن پر عمر گزراں کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اور زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ ان میں جمالِ سیرت شامل ہے، جمالِ عمل شامل ہے، جمالِ اخلاق شامل ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اس تقریر سے حاضرین خاصے متاثر ہوئے۔ (خواہ وہ اثر پائیدار نہ ہو)

خیر تو اس کتاب کے لکھنے کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اپنے اس نگار خانے میں سے بعض محبوب ہستیوں کو آپ سے متعارف کراؤں۔ اور چوں کہ ان کو علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ ایک مربوط طریقے پر پیش کرنا مقصود ہے، لہٰذا میں نے گویا ان کو اپنی زندگی کا ایک جزو بنالیا ہے۔ اگرچہ یہ ایک حد تک گستاخی ہے۔ لیکن اس طرح بہتر طریقے سے ان کی شیرازہ بندی کرنا ممکن ہوگا۔

ان دلنواز شخصیتوں کو میں محض اپنے حافظے کے آئینہ میں نہیں دکھانا چاہتا۔ حافظہ تو کبھی بھی شاید بہت اچھا نہ تھا اور اب کہ عمر کی آخری منزل ہے میں نے اس پر بھروسہ کرنا کم کر دیا ہے۔ لہٰذا چاہتا ہوں کہ حافظہ کی مدد کے لئے ان میں سے بعض کے خطوں سے کام لوں۔ زندگی بھر ہزاروں خط موصول ہوئے جن میں سے بہت سے تو وقت کے ساتھ ضائع ہو گئے۔ بعض کو خود ضائع کر دیا اور کئی ہزار ابھی تک محفوظ ہیں جن سے

بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہوتی ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جن کا حوالہ دینے میں مجھے بہت تامل ہوگا۔ کیوں کہ اندیشہ ہے کہ انہیں اظہارِ خودستائی کا ذریعہ نہ سمجھا جائے۔ اس بارے میں مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ جب کوئی دوست یا عزیز کسی کو خط لکھتا ہے تو وہ بالعموم اس کی جانی بوجھی خرابیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب نہیں کرتا (سوائے ایسی صورت کے کہ دونوں میں شدید مخالفت ہو) بلکہ اکثر اس کا دل بڑھانے کے لیئے اس کی جھوٹی سچی تعریف ہی کرتا ہے۔ لہذا ان میں اگر کوئی تعریفی پہلو پایا جائے تو اس کو اس عذر کی بنا پر بھول جانا چاہیئے اور عذر کو جھوٹا انکسار نہ سمجھا جائے تو کرم ہوگا۔

شاید یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس کتاب کا نام جو پہلے ذہن میں آیا بہت سے اچھے ناموں کی طرح اس "کا سلسلہ نسب" بھی غالب سے ملتا تھا۔ غالب کے اس شعر سے:

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بتوں کی تصویریں اور حسینوں کے خطوط آپ کی خدمت میں پیش ہیں اور یہی گھر کا سامان ہے۔ ان کے علاوہ جو کتابیں یا مضمون لکھے یا تقریریں کیں وہ "گھر کے سامان" میں شامل نہیں۔ وہ یا تو محض اظہارِ خودی کا ایک ذریعہ تھیں جن کا غالباً وقت کے حافظہ پر کوئی بار نہ ہوگا، یا ان لوگوں کا مال ہے جنھوں نے ان کو پڑھا، یا سمجھا، یا اپنایا۔ میرا ان پر کوئی حق نہیں رہا۔ ہاں اس گھر کے سامان میں ایک چیز اور شامل ہے جس کو دکھانا مشکل، بہت مشکل ہے۔ لیکن وہ ہر انسان، ہر باشعور انسان کی زندگی کا جزو ہوتی ہے۔ وہ ہے اس کی قدریں، اس کی امنگیں اس کی آرزوئیں، اس کی جستجوئیں، اس کے آسمان کے وہ ستارے جن کی مدد سے وہ اپنی کشتی کو کھینے اور اس کا رخ متعین کرنے کی

کوشش کرتا ہے۔ جن کو وہ بہت سخت تلاش اور تلخ تجربوں کے بعد حاصل کرتا ہے اور کبھی کبھی جب تحریصیں راستے میں حائل ہوتی ہیں تو انھیں کھو بھی دیتا ہے ۔ اور پھر جب تائید الٰہی حاصل ہوتی ہے تو دوبارہ پا بھی لیتا ہے۔ یہ وہی دولت ہے جس کی طرف اقبال نے اپنے ساقی نامہ کے ان دل نشین شعروں میں اشارہ کیا تھا:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
میرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

اور اسی دولت کا ذکر آزاد نے اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے جس کو قید و بند میں بھی کوئی ان سے نہیں چھین سکا جب وہ احمد نگر قلعہ میں نظر بند تھے تو انھوں نے اپنے ایک خط میں نواب صدر یار جنگ کو لکھا تھا (یہ وہی خط ہیں جو رہائی کے بعد "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہوئے) : " زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا چھن گیا تو کیا مضائقہ ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی نہیں چھین سکتا، سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔ انسان کا اصلی عیش دماغ کا ہے جسم کا نہیں.....
یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سروسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ وہ ہم سے باہر نہیں خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔"

میں اس قسم کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا جو آزاد و اقبال ہی کو زیب دیتا ہے ہاں میرے دل میں اس دولت کی قدر بہت ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں

کیا ہندوستان میں، کیا ہندوستان سے باہر، عام طور پر لوگوں کی نظر میں داخلی زندگی اور دل و دماغ کی اہمیت بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ وہ خارجی، مادّی چیزوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، ان سے دل بہلاتے ہیں، تفریح کے لئے مشینوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ خود کچھ کرنے کے بجائے، اپنی قوتوں کو ظاہر کرنے کے بجائے، دوسروں کو کچھ کرتا دیکھ کر، انفعالی طور پر مسرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ہی طرح کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر، جن کی زندگی اکثر کھوکھلی اور بے معنی ہوتی ہے، وہ اپنی تنہائی کے احساس کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بہت مشکل ہو گیا ہے کہ خود اپنی صحبت کو برداشت کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری تعلیم اور سماج کو اس خارجیت کو دور کرنے کی فکر کرنا چاہئے جو زندگی میں روز بروز زیادہ راہ پاتی جاتی ہے، جو سینما اور فٹ بال اور گھڑ دوڑ کی کشش کو محسوس کرتی ہے۔ لیکن خانقاہ اور غار حرا کی معنویت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور کچھ لوگ جو اس طرف مائل بھی ہیں ان کو بطور ایک پناہ گاہ کے اپناتے ہیں، ان سے حقیقی فیض حاصل نہیں کر پاتے۔ حالانکہ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے انسانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ اب سے کئی ہزار برس قبل یونانی مفکر ایپک ٹی ٹس (EPICTETUS) نے کہا تھا کہ "جب تم دروازے بند کر کے اپنے کمرے کو تاریک کر لیتے ہو تو کبھی یہ نہ کہو کہ تم اکیلے ہو۔ کیوں کہ در اصل تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہارا خدا تمہارے اندر ہے۔ تمھاری عقلِ خداداد (GENIUS) تمھارے اندر ہے اور ان کو یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کیا کر رہے ہو روشنی کی ضرورت نہیں۔" اسی بات کو ہمارے معاصرین نے بھی اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIOT) نے کہا ہے:-

"انسان انسان نہیں جب تک وہ سماج کا ایک فرد نہ ہو اور وہ سماج کا

فرد نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس سے علیٰحدہ بھی ایک شخصیت کا مالک نہ ہو۔ اس کی سماج کی رنگینیت اور اس سے علیٰحدگی کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ زندگی میں بعض ایسے لمحات آتے ہیں (شاید سب لوگوں کی زندگی میں نہیں) کہ اس کو تمام دوسرے لوگوں سے علیٰحدگی کا اس قدر شدید احساس ہوتا ہے کہ اس کا بوجھ اسے کچل دیتا ہے۔ اس وقت مجھے رحم آتا ہے اس شخص کی حالت پر جو اپنے ساتھ اپنی کمینگی اور اپنی بے مصرف زندگی کے احساس کے ساتھ تنہا ہو۔ تنہا ہو بغیر اپنے خدا کے!"

میرے ایک اور پسندیدہ انگریزی مصنف پریسٹلے (PRIESTLEY) نے بھی اس بات کو ایک اور طریقے پر بیان کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۶۱ء میں نیو سٹیٹسمین (NEW STATESMAN) میں چھپا تھا:

"دوستو، آؤ، چند منٹ کے لئے ہم خارجی دنیا پر آنکھیں بکالنا بند کر کے اپنے من کے اندر کی دنیا پر نظر ڈالیں جو مجنونانہ خود پسندی، لالچ، شک، حسد اور نفرت سے بھری ہوئی ہے۔ کاش ہم اپنے احتجاجی جلسے اپنے اندر کی تاریک گلیوں میں بند کر سکتے اور وہیں اپنے سفید جھنڈے بلند کر سکتے۔ چند روز ہوئے میں ایک دانشمند کی تصنیف پڑھ رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا، انسان کو خود اپنے بارے میں شک کرنا چاہئے، دوسروں کے بارے میں نہیں، دنیا کتنی بدل جائے اگر اس کے سیاسی لیڈر روزانہ گھنٹہ بھر، آدھے گھنٹے یا دس منٹ بھی اس بات پر غور کرنے میں صرف کر سکیں۔"

مغرب میں شاید اس حقیقت کا احساس بہت مدت کے بعد دنیا کے بدلتے ہوئے اور انسان کو کستے ہوئے حالات کو دیکھ کر از سرِ نو پیدا ہوا ہے۔ لیکن مشرق کی تہذیب کا تو یہ ایک پرانا اور مستقل جزو ہے۔ تنہائی کا احساس اور اس کی اہمیت، احتسابِ نفس کا مطالبہ اور داخلیت کے مقام کا اعتراف۔ اور اس تنہائی میں وہ اپنی خداداد قوتوں کی شیرازہ بندی کر کے، زندگی کی صلاحیتوں کو سمیٹ کر روزمرہ

کے معمولات اور مکروہات سے کچھ عرصے کے لئے آزاد ہو کر، اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی معنویت کا سراغ پا سکتا ہے۔ اور اگر خدا کی توفیق شاملِ حال ہو تو اس کا رشتہ ابدی اقدار سے جوڑ سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب انسان نے خدا کے حضور میں شکایت کی کہ تیری دنیا میں میرا کوئی رفیق، مونس اور ہم زبان نہیں۔

شدم بہ حضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرّہ آشنایم نیست
جہاں تہی زِ دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است، ولے درخورِ نوایم نیست

تو اس نے انسان کے ساتھ ہمدردی نہیں کی۔ اس کو مظلوم نہیں سمجھا، اس کو اس آفت سے نکالنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ:

تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

اس کے لب پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور بس۔ مطلب یہ تھا کہ اے بے خبر تو ہماری مصلحت سے واقف نہیں اور یہ نہیں سمجھتا کہ یہ بھی تیرے لئے ایک نعمت ہے۔ زندگی کا تانا بانا دراصل تنہائی اور ہجوم دونوں کے میل سے تیار ہوتا ہے بشرطیکہ تنہائی میں یہ نہ بھولے کہ وہ سماج کا ایک لازمی جزو ہے اور ہجوم میں اسے یہ یاد رہے کہ اس کی اپنی ایک انفرادیت ہے جس کو وہ کسی داموں بیچ نہیں سکتا۔ جب اس کی زندگی ہنگاموں سے لبریز ہو، اس وقت بھی سکون اور تنہائی کا ایک مرکز ہونا چاہئے جس میں وہ ضرورت کے وقت، چاروں طرف کے شور و غوغا سے بچ کر پناہ لے سکے اور اپنے اندر کی قوتوں کو مجتمع کر کے پھر دنیا کے کاموں میں حصہ لے سکے۔ ورنہ دن اور رات معمول کی غلامی میں گذر جاتے ہیں اور انسان کی خودسے

ملاقات نہیں ہو پاتی۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ خیال کے رشتوں کا بھی عجیب حال ہے۔ دراصل کہہ یہ رہا تھا کہ جب بتوں کی تصویریں اور حسینوں کے خطوط آپ کی نذر کر دیئے اور جو کچھ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کیا ہے (اگر وہ کسی قابل ہے) دوسروں کی نذر ہو چکا تو اپنے پاس کیا رہ گیا ہے سوائے انہیں چند آدرشوں اور قدروں، امیدوں اور آرزوؤں کے، جن کی خوبی یہ ہے کہ وہ تقسیم اور نشر و اشاعت سے کم نہیں ہوتیں بلکہ شاید ان کی وضاحت اور معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کی کچھ اشاعت تحریروں اور تقریروں میں کی ہے اور شاید اس کتاب میں بھی ان سے باز نہ رہ سکوں۔ مجھ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

شیخ جی محفلِ رنداں میں بہت آئے گئے — خو سے لاچار تھے، کچھ وعظ بھی فرمائے گئے
آخرش دار، سے وہ اس طرح نکلوائے گئے — پا بدستِ دگرے، دست بدستِ دگرے

جب اس وقت یہ حال تھا تو اب تو یہ خو بالکل ہی خلافِ فیشن ہو گئی ہے لیکن کیا کروں کہ میرے لئے ہر بدلتے فیشن کا ساتھ دینا ممکن نہیں۔

اسی زمانے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وعظ و نصیحت سے کوئی فایدہ نہیں اور وعظ و نصیحت کے الفاظ ہی ایسے ہیں اور ایسے متن میں استعمال ہوتے ہیں کہ ان کی طرف سے ایک عام بدظنی پھیلی ہوئی ہے جس کے لئے ایک حد تک ایک جواز بھی ہے کیوں کہ

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

جب قول و فعل میں، کلام اور عمل میں فصل پیدا ہوتا ہے تو قول اور کلام کا اعتبار اٹھ جاتا ہے اور اس ریاکاری کے خلاف قدرتاً احتجاج کیا جاتا ہے لیکن اس کا یقیناً

یہ مطلب نہیں کہ اچھے خیالات اور اچھے آدرش بے معنی ہو گئے ہیں، اور ان سے احتراز کرنے یا شرمانے کی ضرورت ہے۔ ان کا پرچار کرنا تو نہ صرف ہر شریف آدمی کا حق بلکہ فرض ہے، بشرطیکہ وہ خود بھی ان پر عمل کرے۔ صرف زیبِ داستان یا زیبِ تقریر و تحریر کے لئے انھیں استعمال نہ کیا جائے۔

آپ دیکھیں گے کہ باوجود اس کتاب کے لئے "گھر کا سامان" نام تجویز کرنے اور اس کا جواز پیش کرنے کے، میں نے اس کا یہ نام نہیں رکھا۔ کیوں؟ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن شاید یہ خیال تحت الشعور میں ہو کہ جو شخص کتاب کو نہ پڑھے گا وہ اس نام کو سمجھ ہی نہ پائے گا اور شاید بہتر ہے کہ کم سے کم کتاب کا نام واضح ہو۔ چنانچہ مجھے ایک سادہ سا نام مل گیا جس کا ماخذ بھی ایک جانا بوجھا شعر ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں   مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

پہلا مصرعہ تو ایک لحاظ سے ہر انسان پر صادق آتا ہے، جس کو کبھی نہ کبھی ایک سنگین تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر اس وقت میرا مافی الضمیر دوسرے مصرعہ میں پنہاں ہے۔

خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا

بعض لوگ اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ اس وقتِ سعید خود موجود تھے اور انھوں نے اس کی تقریبوں میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ دنیا کے لئے اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ فلاں شخص، فلاں دن، فلاں مہینے، فلاں سال میں فلاں وقت پیدا ہوا۔ پیدا ہونا تو برحق ہے اس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے ؟ اور میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو پیدا نہ ہوا ہو۔ لیکن اس کی تفصیلات کا کوئی کیا بنائے ؟ شاید ہوتا یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی زبان سے سن کر بچوں کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ خود ان کی یاد کا کمال ہے کہ انہیں اپنے بچپن کے حالات، اتنی چھوٹی سی عمر سے یاد ہیں (یہاں ان لوگوں کا ذکر مقصود نہیں جو اپنی گذشتہ پیدائش کے حالات اور زندگی کے کارناموں سے بھی واقف ہوتے ہیں) میں نے اتنا ضرور سنا ہے کہ جب میں پیدا ہوا تو صبح کے تقریباً چار بجے کا وقت تھا، اور وقت کا تعین اس طرح کیا جاتا ہے (گھڑیاں تو اس زمانے میں عام استعمال میں تھیں نہیں) کہ جب "یہ خوشخبری" میرے دادا خواجہ غلام عباس کو سنائی گئی تو وہ نمازِ تہجّد میں مشغول تھے جو صبح کو پو پھٹنے سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ اس سے مجھے، بعد میں، اندازہ ہوا کہ وہ ایک سحر خیز اور عابد انسان تھے۔ مجھے وہ مطلق یاد نہیں لیکن جب میں نے ان کی ایک مختصر سوانح عمری "حیاتِ ابدی" پڑھی جو ان کے

انتقال کے بعد میرے چچا خواجہ غلام الحسنین نے لکھی تھی، تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی سیرت اور خوبیوں کے انسان تھے۔ بہرحال سوائے ان "ودّ" والوں کے جو جنم پتری پر نظر رکھتے ہیں اور پیدائش کے وقت دن اور تاریخ سے غیب کا حال معلوم کر لیتے ہیں، دراصل عام لوگوں کے لئے پیدائش کے وقت کا تعین کوئی خاص معنی نہیں رکھتا کم سے کم میرے لئے نہیں۔ مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال کا کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ البتہ اب سوچتا ہوں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرے یہ سال غالباً محبت اور ہمدردی کی گود میں گزرے اور مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے کبھی غیر محفوظ ( ) ہونے کا وہ احساس نہیں ہوا جو بعض بچوں کے لئے عمر بھر ایک مصیبت اور آزمائش بن جاتا ہے۔ بلکہ شاید ضرورت سے زیادہ حفاظت میں رکھا گیا جس کی وجہ سے مجھ میں وہ خود اعتمادی بہت دیر میں پیدا ہوئی جو بچوں میں عمر کے ساتھ ساتھ اپنی بساط کے موافق رسہ کشی کرنے سے پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ میرے والدین اور سب عزیز خصوصاً میری والدہ بہت محبت شعار تھیں اور اپنی اولاد کے لئے اپنا وقت، اپنا آرام، اپنی ذاتی ضروریات ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ سنی سنائی روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن میں جن کھیلوں اور شرارتوں میں بچے عام طور پر حصہ لیتے ہیں ان میں، میں، پوری طرح شریک نہیں ہوا۔ میرے والدین کو کبھی مجھ سے یہ شکایت نہیں ہوئی کہ میں نے ان کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہو بلکہ (افسوس ہے) دوسرے بچوں کے لئے مجھے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ میں اس عمر میں یقیناً ایک PRIG رہا ہوں گا جو اس وقت کی روایات کے مطابق اچھا سمجھا جاتا تھا۔ "اچھے" بچے نقریباً ہر بات میں اپنے بزرگوں کی نقل کرتے (اور مجھے خوبی تقدیر سے بزرگ ایسے ملے تھے کہ ان کی

تقلید کرنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔) ان کی زبان اور لہجے میں بات چیت کرنے کی کوشش کرتے، ان کے آدابِ نشست و برخاست اختیار کرتے، بے سمجھے نظمیں یاد کرتے جو فخریہ انداز میں بے چارے آنے والے مہمانوں کو سُنائی جاتیں۔ قرآن شریف بہرحال بغیر معنی کے پڑھتے اور بحیثیت مجموعی اپنی جسمانی عمر کے معیار سے بڑھ کر زندگی کا ایک خاص انداز اختیار کرتے اور ان چیزوں پر ان کو شاباش ملتی۔ یہ وہ صورتِ حال تھی جو یقیناً روسو کو ناپسند ہوگی۔

اس زمانے میں عام طور پر اس اختلاف اور کشمکش کا شعوری احساس بہت کم تھا جو اب نوجوانوں اور بالغوں کی نسل میں پیدا ہوگیا ہے۔ اور جس کو "دو نسلوں کی کشمکش" کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے زمانے کے لئے ایک خاصا پریشان کن اور فکر انگیز مسئلہ بن گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پرانا طریقہ تمام تر اچھا تھا۔ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ بچے جن کو اپنی انفرادیت کے اظہار کا موقع نہ ملے گا، جو اپنے بزرگوں کے سایہ عاطفت میں اس طرح تربیت پائیں گے جیسے چھوٹے چھوٹے پودے کسی درخت کے سائے میں پلتے ہیں، لیکن انہیں پھلنے پھولنے کا پورا موقع نہیں ملتا، وہ یا تو ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ یا بڑے ہو کر محض "جی حضوری" بننا چاہیں گے جنھیں خوشامد اور نقل کے ذریعہ اپنے سے بڑے افسروں کو خوش کرنے کی فکر رہتی ہے تاکہ ان کی ترقی کا راستہ صاف ہو جائے۔ یا پھر بطورِ مخالفانہ ردِ عمل بزرگوں کی اچھی روایتوں کو بھی قبول کرنے سے انکار کردیں گے۔ شاعر نے تو مدت ہوئی کہہ دیا تھا ؎

با من میا دیزائے پدر، فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نکرد

آج کل کے نوجوانوں اور ان کے والدین یا دوسرے بزرگوں کے درمیان

ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں بولتے، ان کا اندازِ فکر اور عمل ایک دوسرے سے مختلف ہے، وہ بظاہر کوئی مشترک قدریں نہیں رکھتے جس کی وجہ سے ان میں باہمی مفاہمت کا پیدا ہونا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ بھی ایک خطرناک صورت حال ہے۔ کیوں کہ زندگی کی بنیادی حقیقت اور اس کی کامیابی کا راز مفاہمت میں پوشیدہ ہے مسلسل مخالفت اور کش مکش ایک مریضانہ کیفیت ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ وہ نہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بزرگ خود کو عقل و دانش کا اجارہ دار سمجھ لیں اور نہ اس طرح کے نوجوان ان کی ہر بات کو غلط جانیں اور انہیں یہ یقین ہو جائے کہ سچائی اور سمجھ بوجھ صرف ان کے حصے میں آئی ہے اور مدتوں تک ان پر تسلط کرنے کے بعد، اب ان کے بزرگوں کو چاہیئے کہ وہ بالکل ہتھیار ڈال دیں۔ بدگمانی کا انداز ساری صورتِ حال کو مسخ کر دیتا ہے۔ زندگی میں (بدقسمتی یا خوش قسمتی سے) بڑھاپے اور جوانی دونوں کا ایک مقام ہے اور ان میں سے کسی کو بھی ہم نکال باہر نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ اس میں پہل بڑی عمر کے لوگوں کی طرف سے ہونی چاہیئے کیوں کہ ماضی میں شاید زیادتی ان کی طرف سے ہوئی ہے اور ان میں دھیرج اور سمجھ بوجھ کا مادّہ بھی زیادہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں بزرگوں کا ادب (جس میں عزیز اور استاد دونوں شامل تھے) ہمارے ماحول میں اس قدر رچا ہوا تھا کہ بغیر ان کی اجازت کے کوئی معمولی سا بھی نیا کام کرنے میں تامل ہوتا تھا۔ میں شاید ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور میرے چھوٹے چچا خاندان کے سرپرست تھے۔ مجھے اس زمانے میں سائیکل چلانے کا شوق پیدا ہوا لیکن اس عمر میں بھی از خود اس کو سیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی! چنانچہ ایک پرچہ (بزبان انگریزی) اپنے چچا کو لکھا اور ان کی باضابطہ اجازت حاصل کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس بارے میں سب

گھروں میں اتنا ہی غلو تھا لیکن اس سے اس وقت کی عام آب و ہوا کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اگر بزرگ کسی بات پر بچوں کو ڈانٹتے یا سزا دیتے تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ بچوں کے دل میں اس کے خلاف احتجاج کا جذبہ بیدار نہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں استادوں کے ساتھ ذاتی مراسم اور تعلقات کا امکان ہی نہ تھا۔ رشتہ ادب کا تھا یا خوف کا، پسند کا یا ناپسند کا۔ میں پانی پت کے جس اسکول میں پڑھتا تھا اس کے ہیڈ ماسٹر ایک بہت شریف اور اس زمانے کے معیار کے مطابق قابل آدمی تھے۔ ایک لمبا ٹرکش کوٹ پہنتے، سر پر ہمیشہ ایک کریم رنگ کی پگڑی باندھتے اور میں نے ہمیشہ انھیں اسی لباس میں دیکھا تھا۔ ایک دن میں کسی کام سے تیسرے پہر کے وقت ان کے گھر گیا اتفاق سے اس وقت ان کے سر پر دستار نہ تھی اور کس قدر دھچکا لگا تھا مجھے یہ دیکھ کر کہ ان کا سر گنجا تھا۔ البتہ اسکول کے آخری دو سالوں میں خوش قسمتی سے ایک ایسے ہیڈ ماسٹر سے سابقہ پڑا جنھوں نے نہ صرف استاد و شاگرد کے رشتہ کا ایک نیا تصور میرے ذہن میں جگایا بلکہ معلم کا ایک نیا معیار دکھایا۔ یہ صوبہ سرحد کے ایک نوجوان شاہ عالم خاں تھے جنھوں نے بعد میں اپنے صوبے کے ڈائرکٹر تعلیمات کی حیثیت سے شہرت پائی ان کا پانی پت آنے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ مولانا حالی کے انتقال کے فوراً بعد میرے نانا خواجہ سجاد حسین نے ان کے نام پر ایک مدرسہ "حالی مسلم ہائی اسکول" کے نام سے قائم کیا۔ اس وقت تک پانی پت میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا۔ ان میں تعلیمی اور سماجی خدمت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی ملازمت سے قبل از وقت سبکدوش ہو کر اور پنشن لے کر (جس کی وجہ سے انہیں خاصا مالی نقصان ہوا) پانی پت میں آ بیٹھے اور خود کو اسکول کے لئے وقف کر دیا اور تقریباً تیس سال تک، اس قدر ایثار اور جانفشانی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگے رہے کہ اس کی اگر کوئی مثال میرے ذہن میں آتی ہے تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی جامعہ کی خدمت ہے (کیا کیا پاپڑ نہیں

بیلے انھوں نے اس جدوجہد میں۔ ستر بچھتر برس کی عمر میں بھی وہ جھولی گلے میں ڈال کر گھر گھر جاتے، اور گھر والوں نے ہفتہ میں جس قدر آٹا یا رقم دان کی تھی، اس کو جمع کرکے لاتے اور آٹے کو فروخت کرکے اس کی رقم اسکول پر صرف کرتے۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کیا نہ کہوں!) خیر تو انہیں اس نئے اسکول کے لئے ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت تھی، جو اس کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکے اور برائے نام مشاہرہ پر کام کرنے کو تیار ہو۔ خواجہ صاحب برسوں تک صوبہ سرحد میں انسپکٹر جنرل تعلیمات رہے تھے اور شاہ عالم خاں کے خاندان اور خود ان سے بخوبی واقف تھے۔ جو اس وقت ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ میں ایم۔اے۔ اور ایل۔ایل۔بی۔ میں تعلیم پاتے تھے۔ انھوں نے شاہ عالم خاں سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا اور اس ہونہار اور شریف نوجوان نے بغیر کسی تامل کے اپنی تعلیم کو ادھر میں چھوڑ کر، اس پیش کش کو خود قبول کر لیا۔ اور جب تک خواجہ صاحب نے خود انہیں مجبور نہیں کیا کہ وہ علی گڑھ واپس جاکر اپنی تعلیم کو مکمل کریں، وہ وہاں سے نہیں ہلے۔ انھوں نے اپنے قیام کے دوران میں نہ صرف تمام طلبہ بلکہ شہر کے تمام لوگوں، ہندوؤں، مسلمانوں کی تسخیر قلب کرکے دکھادی۔ انھوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پہلی مرتبہ یہ محسوس کرایا کہ استاد ایک شفیق دوست، ایک خوش مزاج، بذلہ سنج ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔ ان میں تعلیم دینے کی صلاحیت خداداد تھی۔ انھوں نے کسی قسم کی پیشہ ورانہ ٹریننگ نہ پائی تھی۔ وہ سیدھے کالج سے پانی پت کے ایک چھوٹے سے اسکول میں آئے تھے۔ لیکن وہ طلبہ کا مزاج پہچانتے تھے، ان سے گہری ہمدردی اور محبت رکھتے تھے، ان کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ ان کا دماغ روشن اور شگفتہ تھا اور طبیعت میں بے ساختہ ظرافت تھی۔ پھر ان کی دلکش پر شباب شخصیت، ان کا روشن ناک نقشہ، پٹھانوں کا وہ مخصوص رنگ جس میں سفیدی اور سرخی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں، یہ سب

چیزیں ہم طلبہ کے لئے بالکل نئی تھیں جو عام طور پر استادوں کو ایک خشک اور معمر روپ میں دیکھنے کے عادی تھے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک اپنے محترم اور محبوب استاد سے بہت خوش گوار اور دوستانہ تعلقات قائم رہے ہیں۔ اگرچہ اب امتدادِ زمانہ نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور ملاقات بہت کم ہوتی ہے کیونکہ اب وہ پاکستان میں ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ صوبہ سرحد کے اچھے آدمی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ بُروں کا ذکر نہیں۔

بچپن کی یادوں میں جو اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں، ایک محبوب یاد خواجہ الطاف حسین حالی کی ہے۔ ان کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی دس سال کی ہوگی۔ لہذا میں اس وقت ان کی شاعرانہ عظمت اور اہمیت کو تو کیا سمجھتا، لیکن جب میں ان سے ملتا (اور تقریباً روز ہی ملتا تھا)۔ تو یہ احساس ہوتا کہ ایک بہت ہی شفیق اور فرشتہ صفت انسان سے مل رہا ہوں، (یہ لفظ تو اس وقت نہ جانتا تھا لیکن فرشتہ کا کچھ ایسا ہی شعور میرے ذہن میں تھا۔) ہمارا اور ان کا مکان بالکل پاس پاس تھا، اپنے ہی دو عزیزوں کے مکان سے ہوتے ہوئے، کھڑکی کے راستے ان کے ہاں پہنچ جاتے۔ ایک اوسط درجے کے مکان کی اوپر کی منزل میں ان کا قیام تھا گرمی میں اچکن پہنتے اور جاڑے میں روئی کا دگلہ۔ گلے میں، شاید زکام سے حفاظت کے خیال سے ایک رومال باندھتے تھے۔ گھر میں کرتا اور کھُلے پائنچوں کا پاجامہ پہن کر بیٹھتے۔ ہر آنے والے کے ساتھ خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو بہت محبت کے ساتھ ملتے اور ملایمت سے گفتگو کرتے۔ کسی کو، جو ان سے پہلے پہل ملتا، محض ان کو دیکھ کر یا باتیں سنکر یہ گمان کبھی نہ گزرتا کہ وہ ایک عظیم شاعر، ادیب اور نقاد کے حضور میں بیٹھا ہے اور کیسے گزر سکتا تھا جب خود ان کو کبھی ایسا خیال نہ آیا ہوگا۔ ان میں ایک بے ساختہ اور خداداد انسانیت کا ملکہ تھا جو دوسروں کی انسانیت کا خود بخود احترام کرتا اور جس کی

بنیاد ایک قدرتی احساس مساوات پر قائم تھی۔ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کا چہرہ نہ صرف ان کی سیرت کا آئینہ ہے۔ بلکہ ان کی سیرت ہی نے ان کے چہرے کو ڈھالا ہے۔ اور اس میں محبت، ہمدردی، وقار اور بزرگی کے رنگ بھرے ہیں۔ بچوں اور عورتوں سے ہمیشہ خاص محبت اور شفقت سے ملتے اور ان کا حال پوچھتے۔ اگر ان کا کوئی مسئلہ ہوتا تو اُس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر گھر میں پھل یا بسکٹ ہوتے تو ہمیشہ ان کی خاطر کرتے۔ میں نے سنا ہے (اور شاید کہیں پڑھا بھی ہے) کہ جب میری والدہ کا بچپن کا زمانہ تھا تو انھوں نے قرآن شریف اور اُردو پڑھنا تو سیکھ لیا تھا لیکن اس زمانے کے دستورِ جہالت کے مطابق لکھنا سیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ شاید دلیل یہ تھی کہ لڑکیاں لکھنا سیکھیں گی تو مردوں کو نامہ محبت نہ لکھنے لگیں (گویا جاہل عورتوں اور مردوں نے تو کبھی عشق و محبت کے کھیل کھیلے ہی نہیں) بہرحال میری والدہ کو لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور انھوں نے اس کو سیکھنے کا یہ طریقہ نکالا کہ کوئلہ کو قلم بنا کر رات کے وقت اردو کی کتابوں سے عبارت نقل کرتیں۔ ایک دفعہ خوبیِ اتفاق سے حالتِ جرم میں پکڑی گئیں اور بہت ڈانٹ پڑی۔ یہ ڈانٹ ابھی جاری ہی تھی کہ مولانا حالی گھر میں تشریف لے آئے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ میری بچی کو کیوں ڈانٹا جا رہا ہے؟ میری پرنانی نے جرم کی نوعیت بیان کی۔ انھوں نے بچی کو اپنی گود میں بٹھایا، پیار کیا اور اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا "میری بچی لکھنا ضرور سیکھے گی اس کو کوئی منع نہ کرے۔" پھر کس کی مجال تھی کہ مخالفت کرتا۔ چنانچہ والدہ نے اپنے زمانے کے اعتبار سے اچھی تعلیم حاصل کی اور نہ صرف خود حاصل کی بلکہ اپنے بچوں، نوکروں اور محلے کے لڑکے اور لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی رہیں۔ مطلب یہ کہ اگر حالی نے بروقت دست گیری نہ کی ہوتی تو شاید وہ نیم جاہل ہی رہ جاتیں۔

عورتوں پر مردوں نے تاریخ کے تقریباً ہر دور میں جو زیادتیاں اور مظالم

کئے ہیں اور ان کے انسانی حقوق کو جس طرح پامال کیا ہے اس کا مولانا کو شدید احساس تھا۔ جس کے لئے انھوں نے غالباً اسلام کی تعلیم کو سرچشمہ الہام بنایا تھا۔ اپنی بعض بہت ہی موثر اور دل نشین نظموں میں انھوں نے عورتوں کی پرزور وکالت کی ہے جیسے "بیوہ کی مناجات" اور "چپ کی داد"۔ ممکن ہے مجھے عورتوں کے ساتھ جو ہمدردی ہے اور ان کا جو احترام میرے دل میں ہے وہ میں نے کسی حد تک ان سے ورثے میں پایا ہو۔ اور ان سے مثال میں سیکھا ہو اور اس جذبہ کو تقویت اس بات سے ملی کہ مجھے خوش نصیبی سے زندگی میں بہت سی ایسی عورتوں سے سابقہ پڑا جو دراصل اس محبت، ہمدردی اور احترام کی مستحق تھیں۔

ان کی انسانیت اور محبت کے اور بھی کئی مظاہرے دیکھنے میں آئے جن میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے ایک نواسے تھے جن کو بچپن ہی سے مرگی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ جس زمانے میں میں نے انھیں دیکھا ان کی عمر شاید تیس پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ زود رنج اور تنک مزاج واقع ہوئے تھے۔ ذرا کوئی بات خلافِ مرضی ہوتی تو گھر سے نکل جاتے اور بعض دفعہ اس حالت میں مرگی کا دورہ پڑ جاتا اور کہیں سڑک پر گر پڑتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر سے غائب ہو گئے اور جب مولانا حالی کو معلوم ہوا (جن کی عمر اس زمانے میں شاید ۷۵ سال کے لگ بھگ ہوگی) تو وہ خود انکی تلاش میں نکلتے، گلیوں اور سڑکوں اور شہر کے باہر باغوں میں تلاش کرتے اور انکو ہوش میں لاکر یا منا کر واپس لاتے۔ کسی اور کے اصرار کا اس مردِ خدا پر اثر ہی نہ ہوتا تھا

مولانا حالی کی وفات، میرے لئے موت کا پہلا شعوری تجربہ تھا۔ اس سے پہلے میری یاد میں ایسا واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ میں نے اسے اپنی سمجھ کے مطابق ایک آفاقی حادثہ سمجھا، جیسے آسمان میں سورج چھپ گیا ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اب کبھی روشنی نہ ہوگی۔ شاید اس کا جو گہرا ردعمل عام لوگوں پر دیکھا اس کا یہ اثر ہو۔

ساتھ ہی بچپن کے تقاضے سے دل میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ اب کبھی کھیلنے کا موقع نہ ملے گا، کسی چیز کو خریدنے کو پیسے مانگیں گے تو نہ دیئے جائیں گے۔ زندگی کا معمول بدل جائے گا.... یہ بہت بعد میں جاکر اندازہ ہوا کہ وقت ایسا سنگ دل اور اس کے مطالبات اس قدر اٹل ہیں کہ انسان بڑے سے بڑا حادثہ جھیل جاتا ہے اور خواہ کوئی فرد انفرادی طور پر اس کا کتنا ہی گہرا اثر لے، وقت کی جبیں پر شکن نہیں پڑتی۔ غالب خستہ کے بغیر کوئی کام بند نہیں ہوتے۔ وقت تو گویا دریا یا سمندر کی سطح ہے کہ اس پر چھوٹی سی کنکری پھینکو یا بڑا سا پتھر، کچھ لہریں نمودار ہوں گی اور تھوڑی دیر میں سمندر کے بطن میں غائب ہوجائیں گی۔

دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد

خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

لیکن اس "پندارِ خس" میں بھی ایک گہری حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ اس عالم کائنات میں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے باشعور اور دماغ سے آراستہ ہستی ایک ہی ہے۔ انسان اور ہر فرد کی ایک مخصوص شخصیت ہے۔ اس پر جو ذہنی اور جذباتی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں وہ کائنات کے لئے اہم ہوں یا نہ ہوں، اس کے لئے ان کی اہمیت مسلم ہے۔

اب حالی بو علی شاہ قلندر کی درگاہ کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اور اس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں قتل و غارت کا حشر برپا ہوا تو مغربی پاکستان کے شرنارتھیوں نے جذبہ انتقام میں پانی پت کے بیشتر قبرستان بھی اکھاڑ دیئے۔ یہ شاید حالی کی روحانیت کا فیض تھا کہ ان کی قبر ان چند قبروں میں سے ہے جو محفوظ رہیں۔ قبر کی حفاظت اس شخص کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی جو اس میں دفن ہے۔ کیوں کہ جسم تو خاک ہے خاک میں مل جاتا ہے اور روح جو اصل حقیقت ہے قبر میں دفن نہیں ہوتی کسی اور مقام پر پہنچ جاتی ہے۔

ہاں اس کی حفاظت پس ماندگان کا فرض ہے۔ اگر قبر اپنے کسی بزرگ یا قوم کے کسی محسن کی ہے تو اس کی عزت کرنے میں ہم دراصل اپنی تہذیب کا احترام دکھاتے ہیں۔ اور ان کی بے حرمتی کرنے میں اپنی بدتہذیبی اور بے حسی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بات صرف قبروں تک محدود نہیں بلکہ مسجدوں، مندروں، گوردواروں، گرجاؤں سب پر صادق آتی ہے کہ وہ سب کے سب خدا کا گھر ہیں۔ جو خدا کے گھر کی بے عزتی کرتا ہے وہ دلوں کو بھی توڑنے میں باک نہ کرے گا کہ بالآخر تو اس کا گھر انسان کا دل ہے۔

جب میں اس زمانے کی تہذیب کے بارے میں سوچتا ہوں، کم سے کم جیسی ایک چھوٹے سے قصبے میں پائی جاتی تھی، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک گذرا ہوا خواب ہے جو کبھی واپس نہ آئے گا۔ گذشتہ پچاس برس میں زندگی اور تہذیب کے خدوخال کس قدر بدل گئے ہیں۔ شاید اس قسم کا احساس ایک حد تک ہر نسل کو ہوتا ہوگا لیکن بعض اعتبار سے ہماری نسل ان سے بہت مختلف ہے۔ اس نے جاگیردارانہ نظام کو اس کے عروج کے زمانے میں دیکھا اور پھر (بظاہر) اس کو دم توڑتے دیکھا، اس نے دو عالمی جنگوں کے بحران کا تجربہ کیا، اس نے ہندوستان کو آزادی کی لڑائی لڑتے، آزادی کو حاصل کرتے، اور پھر اس کو اپنی ہی بداعمالیوں سے تقریباً کھوتے دیکھا۔ اس نے ہندوستان میں گاندھی جی کے دور کا معجزہ دیکھا، نہرو کی قیادت میں نئے سماجی اور اقتصادی سماج کو آتے دیکھا اور دنیا کی بہت سی قوموں کو مغرب کے سیاسی تسلط سے آزاد ہوتے دیکھا۔ اس نے دنیا میں کمیونزم اور سوشلزم کو سر اٹھاتے دیکھا اور دیکھتے دیکھتے ان کی گرفت دنیا کے تہائی حصے پر مستحکم ہوئی، لیکن باوجود ان انقلابی تبدیلیوں کے انسان، نوعِ انسان کا شکاری ہی رہا۔ اقبال کے لفظوں میں رومی اور شامی کے انداز بدلتے رہے اور مقام شبیری

ایک حقیقتِ ابدی تو رہی لیکن اس کی چھاپ انسانوں کے دل اور دماغ پر نہ لگ سکی۔ اس نے دنیا میں ایٹمی انرجی کا آغاز دیکھا، ایٹمی بم کی شیطانی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اور تیسری عالمگیر ایٹمی جنگ کو دنیا کے سر پر منڈلاتے دیکھا اور کس نسل نے دنیا میں اسقدر انقلابوں کو آتے دیکھا ہوگا جنھوں نے زندگی بنیادوں اور اس کے روایاتی مفروضول اور مانی ہوئی قدروں کو بالکل الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس زمانے میں جب انسانوں اور خیالات کی نقل و حرکت تقریباً روشنی کی رفتار سے ہونے لگی ہے۔ پانی پت کا کلچر جس کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور جس کے سائے میں پرورش پائی تھی، جوں کا توں قائم رہتا؟ اس طوفان کا اثر اس کی خاموش اور مقابلتاً پرسکون زندگی پر بھی پڑا۔ جی چاہتا ہے کہ اس تہذیب پر بھی ایک مختصر سی نظر بازگشت ڈالوں!

میں نے جب پانی پت میں جنم لیا وہ بیس پچیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس میں دو تہائی آبادی مسلمانوں کی اور ایک تہائی ہندوؤں کی تھی سکھ خال خال تھے اور بطور نظر بٹو کے چند عیسائی بھی پائے جاتے تھے۔ ان کے باہمی تعلقات بحیثیت مجموعی خوش گوار تھے۔ اور میری یاد میں ان میں کبھی کوئی سنگین جھگڑا نہیں ہوا۔ کبھی کبھی محرم یا رام لیلا یا کسی اور تہوار کے موقع پر کچھ جھڑپ ہو جاتی تھی مثلاً جب مسلمان اپنے تعزیئے لے کر کسی سڑک پر سے گذرتے اور پیپل کے درخت کی کوئی شاخ تعزیئے کے راستے میں حائل ہو جاتی۔ اس کا ایک واضح اور معقول حل یہ تھا کہ یا تو شاخ کو تراش دیا جائے یا تعزیہ کو ذرا ٹیڑھا کر کے گذار دیا جائے۔ لیکن پہلی صورت میں ہندو دھرم کی ہار ہوتی تھی اور دوسری صورت میں مذہب اسلام کی شکست۔ لہٰذا دونوں طرف سے دھرنی کی جاتی۔ پولیس کو آ کر کچھ تادیبی کارروائی کرنی پڑتی کبھی کبھا تھوڑی سی مار پیٹ ہو جاتی اور بس۔ لیکن اس میں شہر کے "شرفا" کھلم کھلا کم شریک ہوتے۔ معاملہ زیادہ تر

"عوام" تک محدود رہتا۔ اس کے علاوہ مخالفت کا ایک اور موقع اس وقت پیدا ہوتا جب ہندو کوئی اپنا جلوس نکالتے اور اصرار کرتے کہ وہ مسجدوں کے سامنے بھی باجا بجاتے گذریں گے۔ مسلمان اس پر اعتراض کرتے اور ضلع کے حاکموں سے مطالبہ کرتے کہ جلوس کا وقت اور راستہ ایسا مقرر کریں کہ نماز کے اوقات میں جلوس اس طرف سے نہ گزرے یا خاموشی سے گذر جائے۔ اس وقت ان مسلمانوں کی بھی ملی غیرت جوش میں آجاتی جو شاید ہی مسجد میں جاکر نماز پڑھتے ہوں۔ ضلع کے حاکم کبھی ایسا کر دیتے، کبھی اگر اوپر سے اشارہ ملتا تو از راہِ شرارت نہ کرتے اور پھر ذرا ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی اور ایک ہی خدا یا بھگوان کے نام لیوا اس کے نام کی عزت کے لئے آپس میں لڑ پڑتے۔ مسئلہ یہ بھی آسان تھا لیکن ناک کا معاملہ (خصوصاً مذہبی ناک کا) ذرا نازک ہی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ جھگڑے بھی ہم جیسے امن پسندوں کو بہت افسوسناک اور قابلِ شرم معلوم ہوتے لیکن اس کے بعد، تقسیم کے موقع پر اور اس سے پہلے اور بعد میں بھی، جو کچھ چشمِ فلک اور چشمِ انسان نے دیکھا اس کے مقابلے میں تو حرکتیں مہذب معلوم ہوتی ہیں۔

اس زمانے میں ہندو مسلمانوں کے آپس کے تعلقات بعض لحاظ سے آج کل کے تعلقات سے بہت مختلف تھے۔ آج یہ دونوں بالعموم ایک دوسرے سے بے تکلفی سے ملتے ہیں، ساتھ کھاتے پیتے ہیں، آپس میں بیاہ شادی بھی عام ہو چلی ہے سوسائٹی میں ملتے ہیں تو عموماً بڑے خلوص کا اظہار کرتے ہیں مگر ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کو قدرت نے دراصل فراخ دل اور روشن دماغ سے آراستہ کیا ہے، رواداری کی نعمت سے نوازا اور تعصب کی لعنت سے بچایا ہے، یا ان لوگوں کے سوا جن کو سرے سے مذہب میں کوئی دلچسپی ہی نہیں، نہ اس کے ظواہر پر عامل، نہ اس کی معنویت سے واقف! عام طور پر لوگ منھ کے سامنے اور پیٹھ کے پیچھے اور دو مختلف روپ دکھاتے ہیں۔ بلکہ شاید میں نے یہ غلط کہا کہ "ان لوگوں کو چھوڑ کر جو مذہب میں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے"

لطف یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی جب کوئی مذہبی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو بعض دفعہ بہت زور شور سے اس میں پیش پیش رہتے ہیں تاکہ ان کو نیتا تسلیم کیا جائے۔ وہ ایک دوسرے کی برائی کرنے، ان کی مخالفت کرنے، ان پر جھوٹے الزام لگانے، ان کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ اور جب اجتماعی ہسٹیریا کا بھوت ان پر مسلط ہو جاتا ہے تو انسانیت کی ساری شرطوں اور حدود، و آداب کو بھلا کر حیوانوں کے درجے سے کہیں نیچے گر جاتے ہیں۔ ایک انگریز شاعر نے کہا تھا:۔ "اور میرا دل یہ خیال کر کے لرز اٹھتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔" برخلاف اس کے میں نے بچپن میں دیکھا تھا کہ بہت سے ہندو اور مسلمان جو اپنی بعض تنگ نظرانہ روایتوں اور برسوں کی عادتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ کھانے پینے میں چھوت چھات برتتے تھے (خصوصاً کسی نامعلوم مصلحت سے کیلی چیزوں کے کھانے میں!) جن کے نزدیک، جو شادی دو مختلف مذہب والوں میں ہوتی ایک گناہ کا درجہ رکھتی تھی، نہ صرف روزمرہ کی زندگی محبت اور میل جول سے بسر کرتے تھے، بلکہ دُکھ سکھ، شادی اور غمی اور باہمی لین دین کے معاملات میں ایک دوسرے کا خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹاتے۔ ہندو کے گھر شادی ہوتی تو اکثر اس کے مسلمان دوست اور پڑوسی اس میں اس طرح شامل ہوتے جیسے قریب ترین عزیز ہوں۔ صبح سے شام تک انتظام میں شریک رہتے اور رات کو اپنے گھر میں جا کر کھانا کھاتے یا صاحب خانہ ان کے لئے علیحدہ کھانا تیار کراتا۔ یہی حال ہندوؤں کا تھا۔ ممکن ہے میں نے غیر شعوری طور پر ذرا مثالی تصویر پیش کی ہو لیکن بحیثیت مجموعی میرا یہی تاثر ہے۔ رسم و رواج میں اختلاف ہو مگر دل بٹے ہوئے نہیں تھے۔ اور جب کبھی لڑائی جھگڑا بھی ہوتا تو کچھ عرصے کے بعد پھر میل ملاپ ہو جاتا۔ اب دل ان دنوں کو ڈھونڈتا ہے اور نمرود کی خدائی سے بھاگ کر خدا کی خدائی میں پناہ

لینا چاہتا ہے مگر اس کا پتہ نہیں ملتا۔

پانی پت کے ساتھ ہمارا تعلق کوئی سات آٹھ سو برس پرانا ہے جب غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ہمارے بزرگ ہرات سے یہاں آکر بسے تھے۔ انھیں بادشاہ وقت نے جاگیریں "معافی" میں دی تھیں۔ اب ان کی شکل جاگیروں کی تو نہیں رہی تھی لیکن خاندان کی مختلف شاخوں کے پاس زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے جس میں وہ خود کاشت کرتے تھے یا بٹائی پر کراتے تھے اور زیادہ تر کاشت کاری کی آمدنی سے اپنا خرچہ چلاتے تھے۔ میرے والد کے زمانے میں بعض لوگوں نے حکومت کی ملازمت بھی شروع کر دی تھی۔ اگرچہ خود انھوں نے اور میرے چچاؤں نے انگریزی حکومت کی ملازمت نہیں کی۔ (ضمناً یہ "فخر" مجھے بھی حاصل رہا ہے) اس زمانے میں مسلمان "شرفا" میں تجارت کرنا خلاف شان سمجھا جاتا تھا۔ دفتر کی معمولی نوکری یا مال گذاری کے محکمہ میں گرداوری کرنا خلاف شان نہیں تھا لیکن چیزوں کو بیچنا اور خریدنا تو "بنیوں" کا کام تھا جو "میاں" لوگوں کو زیب نہیں دیتا تھا۔

اس نامعقول روایت کو میرے دادا خواجہ غلام عباس نے پہلی مرتبہ توڑا۔ انھوں نے نہ صرف اس خیال کا پرچار کیا کہ تجارت روزی کمانے کا ایک معقول طریقہ ہے بلکہ محلہ انصار میں اپنے دوستوں اور ہم چشموں کی رائے کے خلاف، بلکہ باوجود ان کی مخالفت کے، کپڑے کی ایک دوکان کھول لی اور خود اس پر بیٹھنا شروع کیا اور لوگوں کے طنز وطعن کی پروا نہیں کی۔ (کچھ سوشل ریفارم کا مرض ہمارے خاندان میں ہمیشہ رہا ہے) اور اس وقت تک دوکان چلاتے رہے جب تک مخالفت ختم نہیں ہو گئی اور بعض دوسرے مسلمانوں نے بھی ان کی تقلید میں دکانیں نہیں کھول لیں۔ اس واقعہ سے ان کی سیرت کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرے

والد اور چچاؤں میں جو غیر معمولی اخلاقی جرأت پائی جاتی تھی وہ بھی ایک حد تک اُن سے میراث میں ملی تھی یا ان کی مثال اور تربیت کا فیض تھا۔ ان کی فیاضی اور انسان دوستی کی چند معتبر روائتیں میں نے بھی سنی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اعتبار سے اچھے خاصے افسانوی انسان تھے جن کی مثالیں اس زمانے میں بھی ملتی ہیں لیکن کم۔ ایک مرتبہ وہ نماز پڑھنے محلہ کی مسجد میں گئے اور فارغ ہو کر گھر جانے والے تھے کہ کسی فقیر نے ان سے کہا کہ میاں میرے پاس پہننے کو کپڑے نہیں بس یہی چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔ انھوں نے فوراً بغیر تامل اپنے کپڑے اتار کر اسے دے دیئے اور خود ایک دوست سے تہمد مانگ کر باندھ لیا۔ ایک دوسرے موقع پر کسی سائل نے (جو ان کی شہرت سے واقف تھا) نماز صبح سے واپسی کے وقت، جنوری کی سردی کا حوالہ دے کر ان سے درخواست کی اپنی رضائی مجھے دید یجئے۔ انھوں نے رضائی اس کے حوالے کی اور خود ٹھٹھرتے ہوئے گھر واپس آئے (اور غالباً اپنی بیوی کا لیکچر سُنا ہو کہ آپ میں عقلِ دنیا دار کی بہت کمی ہے)

آبادی چونکہ تھوڑی تھی اس لئے بالعموم قبصے میں رہنے والے ایک دوسرے کو جانتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک ہی جماعت یا طبقے کے لوگ ایک دوسرے سے واقف تھے ان میں جو سماجی اور اقتصادی دیواریں حائل تھیں ان کو واقعاً کم لوگ عبور کر پاتے تھے۔ دولت مند لوگ تو بہت کم تھے، اور جو تھے ان کی بلکہ ان کی دولت کی پرستش نہیں کی جاتی تھی۔ لوگوں کو عام طور پر یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا حسنِ کرشمہ ساز آسانی سے خِرد کو جنوں اور جنوں کو خرد بنا سکتا ہے۔ زیادہ روپیہ اگر تھا بھی تو تاجروں اور بنیوں کے پاس، لیکن اس طبقاتی سماج میں ان کی سماجی حیثیت "شُرفا" کے مقابلے میں کم تھی۔ نہ صرف ان کے مقابلے میں بلکہ اس وقت تک استاد اور اہلِ علم بھی، عام طور پر ان سے اونچے سمجھے جاتے تھے اور علم کا ہاتھ

ہر وقت دولت کے سامنے پھیلا نہ رہتا تھا۔ لیکن متوسط طبقے اور مزدوروں، محنت کشوں، ہاتھ سے کام کرنے والوں میں خاصا فصل تھا۔ آج کا سا نہیں کہ اوپر کے طبقہ والوں کو بعض دفعہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان کے گردوپیش دوسرے لوگ کس طرح زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ ضرورت کے وقت، اس زمانے میں، یہ لوگ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ لیکن ان میں سماجی میل جول بہت کم تھا۔ ذاتی ملازمین کی تعداد بہت ہوتی تھی لیکن ان کو تنخواہیں بہت کم ملتی تھیں۔ مثلاً عورتوں کو دو روپے اور مردوں کو پانچ روپے ماہوار (لیکن یاد رہے کہ اس زمانے میں پانچ روپے میں بھی زندگی کسی طرح گزر جاتی تھی جو اب پچاس روپے میں بھی نہیں گزرتی)۔ اکثر شریف گھرانوں میں ان ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا تھا اور ان کو ایک معنی میں (جس میں احساس تفاخر بھی شامل تھا) خاندان کا جزو سمجھا جاتا تھا۔ گھر کی عورتیں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرتیں۔ اس طرح اس طبقاتی تقسیم میں، جو جاگیردارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوئی تھی ایک حد تک نرمی اور لچک بھی تھی اور اس کا اظہار زیادہ سخت اور قابل الزام شکلوں میں نہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ اس نظام کی تائید نہیں کیوں کہ اس بہتر سلوک کا انحصار تمام تر افراد کی طبیعت پر تھا۔ وہ چاہتے تھے تو نیچے کے طبقوں کے ساتھ اچھا سلوک، نہ چاہتے تو برا سلوک کرتے اور کوئی مضبوطی کے ساتھ ان کا ہاتھ نہ پکڑ سکتا تھا۔ اس بہتر سلوک کا انحصار کسی مسلمہ چارٹر پر نہ تھا جس میں بنیادی انسانی حقوق کو سیاسی طور پر متعین کیا گیا ہو۔ اس وقت ایسے بھی نامبارک لوگ تھے، خصوصاً بڑے زمینداروں میں جو نیچے کے طبقے کے لوگوں کو نہ اپنا جیسا انسان سمجھتے تھے نہ ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ اب مہاتما گاندھی کی تحریک اور دوسرے عالمی اثرات کی وجہ سے اس صورت حال میں کافی فرق پڑا ہے۔ اور مساوات حقوق کے اصول

کو ہمارے دستور میں لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن دستور میں لکھنا آسان اور دلوں پر لکھنا مشکل ہے اور اب بھی باوجود دستوری تبدیلیوں کے، ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہر شریف ہندوستانی کو اپنا سر شرم سے جھکانا پڑتا ہے۔ چنانچہ ابھی کوئی دو سال ہوئے، ایک معمولی الزام پر ایک ہری جن لڑکے کو جلا دیا گیا۔ ایک با اثر جگت گرو نے اپنی حالیہ تقریر میں اس بات پر اصرار کیا کہ چھوت چھات ہندو دھرم کا لازمی جزو ہے اور وہ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس بیان کے خلاف کافی احتجاج ہوا۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کہاں تک اسکے محرکات سیاسی اغراض تھے اور کہاں تک انسانی حقوق کا اعتراف تھا۔ چونکہ ابھی تک ایسے واقعات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں اس لئے قوم کی پیشانی سے اس کلنک کا ٹیکہ دور کرنا اور پرچار و اشاعت کے ساتھ ساتھ مجرموں کو قرار واقعی سزا دینا بھی ضروری ہے۔

اگر انسان کو خدا پر ایمان ہو تو زندگی میں اس کا شکر ادا کرنے کے لئے (اور کبھی کبھی ادب کے ساتھ شکوہ کرنے کے لئے بھی!) بہت سے مواقع مل جاتے ہیں۔ شاید سب سے اہم چیز جس کے لئے میں اپنے خدا کا شکر گذار ہوں یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہ کر سکتا تھا۔ میں یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کیوں کہ یہ نعمت مجھے بغیر کسی استحقاق کے ملی۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر بچے کو چاہئے کہ پیدا ہونے سے پہلے اپنے خاندان کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرے۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایک دولت مند یا کم سے کم خوش حال خاندان میں پیدا ہونا چاہئے کہ اس کے بغیر زندگی کو بنانا اور سنوارنا ممکن نہیں۔ میں نے جس خاندان میں جنم لیا وہ کسی حیثیت سے دولت مند خاندان نہ تھا۔ شاید خاندان میں کبھی دولت

رہی ہو؛ لیکن اب زمینیں تقسیم ہوتے ہوتے اور شاید اس کے افراد کی افتادِ طبع کی وجہ سے، اس کی مالی حیثیت ایک ایسے شریف گھرانے کی رہ گئی تھی جو نہ اتنے محتاج تھے کہ زندگی کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکیں۔ نہ اتنے دولت مند کہ عیش وعشرت کی بے کار زندگی گزار سکیں۔ ان میں اکثر افرادِ کاسبہ تھے جو اپنی محنت سے روزی کماتے تھے، زراعت یا تجارت، یا وکالت یا کسی اور معقول ذریعے سے۔ بعض ایسے تھے جن میں علم کی طلب اور تلاش کا جذبہ وافر تھا اور حُسنِ سیرت کی دولت۔ قصبے کی زندگی میں اور اس کے باہر بھی، ان کی عزت دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ علم اور شرافت کی وجہ سے کی جاتی تھی۔ اس کی ایک مثال حالی کی ذات ہے جن کا ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی چند اور افراد ہیں جن سے متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ میں کہیں صورت حال کو حقیقی انداز میں نہیں تصوراتی انداز میں تو نہیں پیش کر رہا ہوں ؛ لیکن دل اور دماغ بظاہر خلوص کے ساتھ شہادت دیتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

اس فہرست میں سرِعنوان شاید میری والدہ (مشتاق فاطمہ) کا نام آنا چاہئے کہ سب سے پہلے میں نے انھیں کی صحبت سے فیض اٹھایا اور انہیں کو ایک نیک، شریف، محبت شعار اور خدمت گذار زندگی کا پیکر تراشتے دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگوں کا ذاتی تجربہ ماں کے اثر کی گہرائی اور گیرائی کی تصدیق کرے گا۔ یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ وہ مولانا حالی کی پوتی تھیں۔ اور انھوں نے بہت کچھ اپنے دالد اور چچا اور والدہ سے (جو مجھے یاد نہیں) ورثہ میں پایا تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محض وہ ورثہ ان کی شخصیت کی مکمل تفسیر نہیں کر سکتا۔ ہمارے خاندان میں اور بھی بہت سی شریف خواتین تھیں جنھوں نے کم وبیش وہی ورثہ پایا اور اسی ماحول میں تربیت پائی تھی لیکن وہ ان کے پائے کو نہیں پہنچ سکیں

اس میں ان کے مزاج اور طبیعت کو، ان کے خدا داد توازن کو، ان کی محبت کے اعجاز کو بہت دخل تھا، جس کے خزانے فطرت نے ان کے اندر ودیعت کیے تھے۔ پھر خوبیِ قسمت سے ان کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی جو انھیں کے خاندان سے تھے اور جنھیں قدرت نے فخرِ خاندان کا مقام بخشا تھا۔ میری والدہ نے اعلیٰ تعلیم نہ پائی تھی۔ انھوں نے اردو اور تھوڑی سی فارسی پڑھی تھی۔ قرآن شریف اور بعض مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ عربی نہ جانتی تھیں لیکن باقاعدہ کلام مجید پڑھتے پڑھتے اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ دیکھتے دیکھتے اتنی مہارت ہوگئی تھی کہ مطلب ایک حد تک نکال سکتی تھیں۔ مراثی انیس اور مولانا حالی اور بعض دوسرے شاعروں کی شاعری سے بھی واقف تھیں اور اس زمانے میں جو چند کتابیں خاص طور پر عورتوں کے لیے لکھی گئی تھیں، جن کا خاص موضوع پند و نصیحت یا امورِ خانہ داری کی تعلیم ہوتا تھا، وہ بھی انھوں نے اپنے شوق سے پڑھی تھیں۔ انگریزی بالکل نہ جانتی تھیں۔ بس یہ تھا ان کا علمی سرمایہ اور آج کل کی مروجہ تعلیم کے مقابلے میں (جس میں کم سے کم انگریزی زبان کے مدرسوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اور لڑکے اسکول ہی کے زمانے میں انگریزی ادب اور ترجمہ کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب کا مناسب اور نامناسب شاہکار پڑھ لیتے ہیں) یہ بھی کوئی سرمایہ ہے! لیکن علم کوئی گھاس کا گٹھا نہیں جس کو ترازو میں تولا جا سکتا ہے کہ سیر بھر گھاس کے اتنے دام اور دو سیر گھاس کے اس سے دو چند! اور نہ کتابی علم اور کالج کی تعلیم اور دل و دماغ کی تہذیب، ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس علم کے بغیر بھی بعض دفعہ انسان تہذیب کے خزانے تک پہنچ جاتا ہے اس کے باوجود بھی اس سے محروم رہ سکتا ہے۔ میں نے زندگی میں دونوں قسم کے نمونے دیکھے ہیں۔ علم تو ایک عجیب جنس ہے جو انسان کی سیرت اور

قدروں کے ساتھ مل کر ایک کو عرش پر پہنچا سکتی ہے اور دوسرے کو تحت الثریٰ میں گرا سکتی ہے، مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ ایک کنجی ہے، جس سے جنت کا دروازہ کھول سکتے ہیں مگر اس سے دوزخ کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کون سے اثرات ہوں گے ان کے بچپن میں جنھوں نے ان کے سیرت کے سونے کو جِلا دے کر کندن بنایا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد انسانی زندگی کا پہلا تصور جو میرے ذہن میں تیار ہوا انھیں کے طفیل تھا اور انھیں کا پرتو۔ اس کے بعد زندگی کے ڈرامے نے بہت سے ناپاک اور ناجارک کردار بھی پیش کئے (اگرچہ خوبیٔ تقدیر سے ان کے ساتھ بہت قریب یا بہت طویل سابقہ نہیں پڑا) لیکن وہ اس نقشِ اوّل پر غالب نہ آسکے۔

کیا دیکھا میں نے ان کی ذات میں؟ آپ کو صفات کی ایک فہرست میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس لئے وہ پیش نہیں کروں گا۔ لیکن ہر شریف آدمی کو شرافت کی جھلکیوں میں دلچسپی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو اس قدر بے نفس ہوں جیسی وہ تھیں۔ یہ بے نفسی جو بہت سی خوبیوں کی کان ہوتی ہے، صرف اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کے ساتھ تعلقات ہی میں ظاہر نہ ہوتی تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی سیرت کا تانا بانا، اس کے تاروں سے بنایا گیا ہے اور اس کا اظہار ان کے ہر قسم کے سماجی تعلقات میں ہوتا تھا۔ اولاد کی محبت تو ہر ماں کے دل میں ہوتی ہے اور وہ ان کے لئے ایثار کرنے کو تیار رہتی ہے۔ لیکن ان کی محبت اور شفقت عام ہو کر اپنی پوری دنیا پر چھا گئی تھی۔ وہ ہر غریب اور محتاج شخص کی امداد، ہر بیمار کی تیمارداری، ہر ستم رسیدہ کی دل جوئی اس آمادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کرتیں گویا یہ اس کا احسان ہے کہ انھیں خدمت کا موقع دیا۔ باوجود اپنے شوہر کے انتقال کے بعد تنگ دست ہونے کے، ان کی

خیرات کا یہ عالم تھا کہ ہر ضرورت مند کے لئے ان کا دستِ کرم کشادہ رہتا، اس شان کے ساتھ کہ داہنے ہاتھ سے جو دیتیں اس کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہوتی۔ اگر خاندان میں یا قصبے میں ان کے جاننے والوں میں کوئی جھگڑا یا اختلاف ہوتا تو وہ ہمیشہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس کو طے کرانے کی کوشش کرتیں۔ عورتیں آتیں اور اپنے دکھ درد اور پریشانیوں کا بار ان پر ڈال دیتیں اور وہ نہایت عالی ظرفی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس بار کو اٹھا لیتیں۔ ان کا جذبۂ انصاف اس قدر شدید تھا کہ اگر کسی معاملے میں غیر حق پر ہوتے تو اپنوں کے مقابلے میں وہ ان کی حمایت کرتیں۔ اور اس حق دوستی کے تلخ نتائج کی پروا نہ کرتیں۔ اگر ان کے بچوں میں سے کبھی کوئی نوکر کے ساتھ بدتمیزی کا سلوک کرتا تو وہ ہمیشہ اصرار کرتیں کہ وہ اس سے معافی مانگے۔ اس زمانے میں، جیسا میں نے ذکر کیا ملازم عام طور پر بہت کم تنخواہ پر بھی مل جاتے تھے۔ اس لئے باوجود بعض اوقات تنگ دستی کے بھی ان کے گھر میں دو تین ملازم ضرور رہتے تھے۔ میری یاد میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس سے کبھی کوئی ملازم ازخود نوکری چھوڑ کر گیا ہو، خواہ دوسرے لوگوں نے اسے کتنی ہی زیادہ تنخواہ دینی چاہی ہو۔ وہ ان سے دل سوزی اور شفقت سے کام لیتیں، ان کے دکھ درد کی خبر رکھتیں، ان کے بچوں کو خود پڑھاتیں، موقع ہوتا تو ان کی شادی کی تجویز اور اس کا اہتمام کرتیں اور کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ ان کے خاندان کا ایک فرد نہیں ہے۔ ان کے سدھائے ہوئے اور ان کی صحبت کا فیض اٹھائے ہوئے بعض ملازم، آج پینتالیس سال کے بعد بھی جب ہم لوگوں سے ملتے ہیں تو اتنی محبت اور (کیا لفظ استعمال کروں؟) وفاداری کے ساتھ ملتے ہیں جس کا یقین ان لوگوں کو نہ آئے گا جن کو اس کا تجربہ نہیں ہوا۔

میرے والد کی زندگی میں ہماری آمدنی اوسطاً کوئی چار پانچ سو روپے ماہوار کی ہوتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد وہ مدت تک ڈیڑھ سو روپے سے نہیں بڑھی۔ لیکن ان کی قناعت کا یہ عالم تھا کہ نہ پہلی حالت پر نازاں تھیں نہ دوسری حالت میں افسردہ۔ اس وقت بھی غریبوں اور محتاجوں کی مالی امداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں اور اس وقت بھی مقدور بھر (بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ) اپنے سے زیادہ فکر تھی ان لوگوں کی جو زیادہ ضرورت مند تھے۔ ان کے پانچ بچے تھے۔ اور سب والد کے انتقال کے وقت کم عمر۔ میری عمر کوئی گیارہ سال کی تھی۔ اور میری بڑی بہن مجھ سے تین چار سال بڑی تھیں۔ باقی تین مجھ سے چھوٹے تھے معلوم نہیں وہ کس سلیقے اور کفایت شعاری سے صرف کرتی تھیں کہ انھوں نے اپنی طرف سے بچوں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا ہاتھ تنگ ہے اور بچوں کی جائز ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ جب میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوا تو وہ ہمیشہ اتنے خرچ کا انتظام کردیتی تھیں (جس میں بروقتِ ضرورت میرے چچا خواجہ غلام السبطین ہمیشہ ہاتھ بٹانے کو تیار رہتے تھے) کہ کفایت بلکہ خاصے آرام کے ساتھ میری بسر ہوجاتی تھی، اگر کبھی میں نے زیادہ روپیہ طلب کیا (اور دو تین بار ایسا ہوا) تو ان کی پیشانی پر شکن نہیں پڑی۔ حالانکہ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس کا فراہم کرنا بہت دشوار ہوا ہوگا۔ جب نقد روپیہ موجود نہ ہوتا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنا زیور گروی رکھ دیتی تھیں۔ یا فروخت کردیتی تھیں اور ہماری مانگ پوری ہوجاتی۔ شاید یہ چیز ہندوستانی والدین کے لئے غیر معمولی نہیں (یا نہیں تھی) لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ انہیں بندگانِ خدا میں سے تھیں جو قدرتاً ایسا کرتے ہیں اور انھیں نہ ستائیش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلہ کی پروا۔

ایک اور بات جو میں نے ان سے سیکھی، شعوری طور پر، لیکن اس سے زیادہ

غیر شعوری طور پر وہ یہ تھی کہ کام زندگی کی قیمت ہے۔ اور اس کے معنی اسی میں پنہاں ہیں۔ فرصت اور عیش و عشرت کی زندگی ان کی لغت اور عمل میں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ کام کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ صبح کے چار بجے اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھتیں، قرآن شریف کی تلاوت کرتیں، پھر صبح کی نماز سے فارغ ہوتیں۔ اس کے بعد اپنے بچوں، اور دوسرے عزیزوں کو جگاتیں (محبت کے ساتھ تحکم کے ساتھ نہیں) کہ وہ بھی اُٹھ کر ادا نماز پڑھ لیں۔ اتنے عرصے میں وہ کبھی خود اور کبھی کسی کی مدد سے ناشتہ تیار کرتیں اور جب بچے حوائجِ ضروری سے فارغ ہوتے ناشتہ تیار ملتا۔ اس کے بعد وہ دن بھر کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں جن میں سے شاید سبھی کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہوتا۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، یا اس کی دیکھ بھال کرنا، نوکروں اور پڑوسیوں کو لکھانا پڑھانا، مریضوں کی دیکھ بھال (جو اس زمانے میں آج سے بہت زیادہ وقت لیتی تھی۔ کیونکہ بیماریاں زیادہ عام تھیں اور کوئی خاندان ان سے خالی نہ تھا) اور ان سب کے علاوہ جیسا میں نے ذکر کیا، عزیزوں اور پڑوسیوں کے جھگڑے جن کا سلجھانا اور حل کرنا اکثر ان کے حصے میں آتا تھا۔ بھلا اس قسم کی مشغولیتوں کے ہوتے وہ کب آرام سے بیٹھ سکتی تھیں یا بیٹھنا چاہتی تھیں۔ وہ اس مٹی سے نہ بنی تھیں جو آج کل کثرت کے ساتھ انسانوں کے بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ اور جس کے بنے ہوئے بت اگر شام کو کلب ہو آئیں یا دو تین پارٹیوں میں شریک ہو جائیں تو ان کی تھکان کے ساتھ، تعزیت کرنی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا کافی حصہ، اور آخری چند سال تمام تر ایسی بیماریاں اٹھاتے گذرا، جن کا علاج اس زمانے میں تو آسان ہو گیا ہے، لیکن اس وقت خصوصاً چھوٹے چھوٹے قصبوں کے اسپتالوں میں ممکن نہ تھا۔ لیکن معلوم نہیں خدا نے ان کے نحیف جثہ میں کیسا بہادر دل اور ان کی سیرت میں کیسا آہنی عزم رکھا تھا کہ میں نے شاید ہی کبھی انھیں قسمت یا قدرت کی شکایت کرتے سنا ہو۔ انسانوں کی خدمت اور

ان سے محبت کے جذبہ کی برکت سے خدا کے دوسرے نیک بندوں کی طرح ان میں قوتِ عمل اور قوت برداشت کے سوتے اندر سے پھوٹتے رہتے تھے۔ ان کی زندگی سے میں نے یہ انمول حقیقت سیکھی کہ خدا کی رضاجوئی کا بہترین راستہ اس کے بندوں کی خدمت ہے۔ یو۔این۔او۔ کے سکریٹری جنرل ہمرشولڈ نے اپنی نوٹ بک میں لکھا ہے کہ:۔

"ہمارے زمانے میں مقام تقدس تک پہنچنے کا راستہ عمل کی دنیا سے ہو کر گذرتا ہے۔"

اس نے تو اس حقیقت کو دنیا بھر کا ادب اور فلسفہ پڑھ کر اور قومی اور بین الاقوامی اداروں میں اعلیٰ ذمہ دارانہ حیثیت سے کام کرنے کے بعد پایا تھا لیکن سوچتا ہوں کہ میری والدہ پانی پت کی محدود فضا میں رہ کر بغیر کسی خاص تعلیم اور عالمی تجربہ کے اس گہری صداقت تک کیسے پہنچ گئیں۔

قدرت کی فیاضی نے حسنِ اتفاق سے میری بیوی کو بھی محبت اور خدمت کے اسی جذبہ سے مالا مال کیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری والدہ کو عمر طبعی نصیب ہوتی تو ان کو یہ دیکھ کر بہت خوشی اور اطمینان ہوتا۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس جذبے کا ایک حصّہ اپنی دادی اور اماں کی طرف سے میری لڑکیوں کو بھی ورثے میں ملا ہے۔

میرے والد کا انتقال میری کمسنی ہی میں ہو گیا تھا جب میری عمر کوئی گیارہ سال کی تھی۔ مجھے ان کی صحبت میں زیادہ مدت گذارنے کا موقع نہیں ملا۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں دستور کے مطابق ہم لوگ سارے وقت ان کے ساتھ لکھنؤ، میرٹھ وغیرہ نہ رہتے تھے جہاں وہ وکالت کرتے تھے بلکہ سال میں کچھ وقت وطن میں گذارتے، کچھ ان کے ساتھ۔ لیکن ان کی یاد ان کی شخصیت، ان کی سیرت کی خصوصیتیں (جس حد تک میں

انھیں سمجھ سکتا تھا) میرے حافظے میں واضح طور پر موجود ہیں ۔ ان کے خیالات، عقاید اور کارناموں کے مطالعے کا موقع تو ان کی تحریروں کو پڑھ کر بہت مدت بعد ملا لیکن اس کم فہمی کی عمر میں بھی مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں ۔ شاید اس تاثر میں اس بات کو بھی دخل ہو کہ ان کے چھوٹے، بڑے دوست، عزیز، ساتھ کام کرنے والے اور موکل سب ان کی بہت عزت کرتے تھے اور میں نے کبھی کسی کو ان کی ذاتی بُرائی کرتے نہیں سُنا، اگرچہ بہت سے لوگ ایسے تھے (بالعموم رجعت پسند) جو ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات سے اختلاف کرتے تھے ۔ میں نے ان کے بارے میں عرصہ ہوا ایک مختصر سی کتاب "مردِ درویش" کے نام سے لکھی تھی جس کا ایک حصہ نظرثانی کے بعد، میری مقالاتؒ حال کی تصنیف "آندھی میں چراغ" میں شائع ہوا ہے ۔ اس لئے میں یہاں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا ۔ ہاں ان کا تھوڑا سا ذکر اس لئے کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ان کے فیضِ صحبت سے براہِ راست اور ان کی تصانیف سے بالواسطہ کیا حاصل کیا ۔

۱۹۱۳ء کی گرمی کی تعطیل میں ہم لوگ میرٹھ میں تھے ۔ میں اس زمانے میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا ۔ والد نے مجھ سے کہا کہ میرے کتب خانے کی فہرست تیار کرو ۔ ان کا ایک کافی بڑا کتب خانہ تھا جس میں اس قدر مختلف قسم کی کتابیں تھیں کہ مجھے آج بھی تعجب ہوتا ہے ۔ مشرق و مغرب کا ادب، فلسفہ، تاریخ قانون، سائنس، مذہب، علم کلام، تفسیر، تراجم، نفسیات، اقتصادیات سب ان کے کتب خانہ اور ان کے دماغ میں اچھے پڑوسیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہتے تھے ۔ یہ کسی دولت مند کا کتب خانہ نہ تھا جس میں اچھی اچھی مجلّد کتابیں جمع کر لی گئی ہوں ۔ اس میں بلا استثنا، ہر کتاب پڑھنے کے لئے خریدی گئی تھی اور پڑھی

گئی تھی۔ یہ شوق انھیں علی گڑھ کالج کی تعلیم کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ کتب خانہ سے ہر روز ایک کتاب مستعار مانگ کرلے جاتے اور اگلے دن واپس کر دیتے۔ مولانا شبلی نے جو کتب خانہ کے مہتمم تھے، ان سے پوچھا کہ صاحبزادے کتابیں پڑھتے بھی ہو یا محض کتب خانے سے لے جاتے ہو اور واپس کر دیتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ جناب پڑھتا ہوں۔ مولانا نے چند کتابوں کے بارے میں سوال پوچھے تو انھیں معلوم ہوا کہ واقعتاً انھوں نے ہر کتاب کو غور سے پڑھا تھا۔ مطالعہ میں ان کا مذاق اُس قسم کا تھا جیسا قدیم زمانے کی اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں اکثر ہوتا تھا جو علم کی دنیا میں دیواریں نہیں کھڑی کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے نئی مغربی تعلیم میں بھی اپنی طبیعت کے تقاضے کی وجہ سے اس روایت کو قائم رکھا (شاید انھیں کے اثر سے غیر شعوری طور پر مجھ میں بھی یہ بات پیدا ہو گئی)۔ کالج کے زمانے میں، اور اس کے بعد بھی بہت مدت تک ان کی یہ شہرت تھی کہ وہ اپنی نسل کے سب سے زیادہ شوقین، ذہین اور مطالعہ کرنے والے طالب علم تھے۔ جب وہ کوئی مضمون یا کتاب لکھتے تو انہیں بالعموم اس کے لئے خصوصی طور پر مطالعہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ مطالعہ تو ان کا برابر جاری رہتا تھا اور جو کچھ پڑھتے وہ ان کے ذہن میں محفوظ رہتا جس کو وہ حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ بہرحال کتب خانہ کی فہرست تو جیسی تیار ہوئی ہو، لیکن مجھے یہ فائدہ پہنچا (اور شاید یہی ان کا مقصد رہا ہو) کہ مجھے اس بہانے کئی ماہ تک اچھی کتابوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ فہرست کم بنائی، پڑھا زیادہ اور بہت سے مصنفین سے سرسری واقفیت ہو گئی۔ مطالعہ کی جو عادت پڑی وہ گویا عمر بھر کا روگ بن گئی۔ لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کروں کہ اس میں وسعت زیادہ رہی اور انتخاب

مقابلتاً کم۔ خیر تیسرے یا چوتھے، یا دسویں درجے کے ناول اور افسانوں کا شوق تو کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ تعجب ہی رہا کہ بعض لوگ کیسے اپنی فرصت، بلکہ اپنی عمر عزیز کا ایک کافی حصہ ایسی کتابوں، بالخصوص ناولوں کو پڑھنے میں ضائع کر دیتے ہیں جن سے نہ انھیں دنیا کا فائدہ ہے نہ آخرت کا، جن میں اکثر جھوٹے جذبات، جھوٹی محبت اور شہوت کے افسانے ہوتے ہیں یا قتل و غارت اور تشدد کی داستانیں۔ گویا وقت خدا کا ایک عذاب ہے جس کو ان لوگوں پر نازل کیا گیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس وقت کو کاٹ دیں۔ بری کتاب کو پڑھنے کی سب سے بڑی خرابی یہ نہیں کہ وقت بے کار ضائع ہوتا ہے بلکہ یہ کہ گریشم کے اقتصادی قانون کے مطابق بُری کتابیں اچھی کتابوں کو زندگی سے نکال دیتی ہیں۔ "عریاں" کتابیں پڑھنے کے بعد لوگ نہ صرف اچھی کتابوں میں دل چسپی نہیں لیتے بلکہ اور زیادہ عریاں کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں... خیر اس قسم کی کتابوں میں تو مجھے کبھی کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی (اگرچہ میں نے کبھی کبھی ان کا اثر دیکھنے کے لئے ان کو پڑھا ہے اور بالعموم آخر میں یہ محسوس ہوا ہے جیسے کوئی تلخ یا بدمزہ چیز کھا کر منھ کا مزا خراب ہو گیا ہو) لیکن میں نے مطالعے کو ایک سنجیدہ عالم کی طرح خاص حدود میں قید نہیں کیا کہ ان میں کوئی گہری نظر یا مہارت پیدا کر سکتا۔ شاید تعلیم کا مضمون اس صداقت و انکسار میں شامل نہیں۔ اور بہر حال تعلیم کی حدیں تو بہت سے دوسرے علوم سے ملتی ہیں۔ اس لئے متعلقہ علوم میں تھوڑی بہت دل چسپی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گہرائی جو انہماک اور مضمون کے تعین سے پیدا ہوتی ہے حصے میں نہیں آئی لیکن اس کے بجائے علمی مسائل اور زندگی کے مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے میں ذہنی اور جذباتی تنگ دلی سے آزادی حاصل ہو گئی۔

انھوں نے اپنی ساری عمر (جو صرف بیالیس سال کی ہوئی) قومی خدمت

اور پبلک کاموں میں صرف کی۔ لیکن کمال یہ تھا کہ باوجود اس دشوار گذار راستے کو اختیار کرنے کے، وہ ان تمام آلودگیوں اور تحریصوں سے بلند اور بے نیاز رہے جو اکثر لوگوں کو سچائی اور انصاف کے راستے سے ہٹا دیتی ہیں اور جن کا اثر آزادی کے بعد اس طرف بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ان میں ایک خاص فقیری اور بے نیازی کی شان تھی۔ قومی کام کے سلسلہ میں انھیں کبھی ذاتی وجاہت، عزت اور ناموری حاصل کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ان کا سچ مچ یہ عقیدہ تھا کہ انسان محض اعلےٰ مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور اس کو چاہئے کہ ایثار اور بے نفسی کے ساتھ ان کی تحصیل کے لئے جدوجہد کرے۔ اس لئے ذریعہ کو مقصد پر ترجیح دینے کا کیا سوال؟ ان کی طبیعت میں ایک خاص وصف تھا جس کے لئے اسلامی فلاسفہ نے عدل کا لفظ اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ اپنے خیالات، جذبات اور عمل میں ہر قسم کی افراط وتفریط، تعصب اور تنگ نظری سے پاک رہنے کی کوشش کرتے تھے ان کے عقیدے اور عمل، دل اور دماغ، خیالات اور جذبات میں ایک خاص ہم آہنگی تھی جس کی بدولت وہ اپنے ہر کام کو جرأت، استقلال، اور ایمان کے ساتھ کرتے تھے۔ ہر معاملہ میں سوچ بچار کے بعد اپنی رائے قائم کرتے، ایمانداری اور آزادی کے ساتھ اس کا اظہار کرتے اور باوجود مخالفت کے اس پر قائم رہتے۔ اس وجہ سے ان کی زندگی میں کئی دفعہ ایسے مواقع پیش آئے کہ کبھی ہندو، کبھی مسلمان، کبھی سنّی کبھی شیعہ، کبھی حکومت، کبھی آزاد خیال، ان کے طرز عمل سے ناخوش ہوئے لیکن وہ کبھی "خاشاک کے تودے کو کوہ دماوند" نہ کہہ سکے بہت سے اختلافی معاملات اور مسائل میں بعد کے واقعات نے نہ صرف ان کے خلوصِ نیت کی بلکہ ان کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی بھی تائید کی۔ مجھے ان کی زندگی میں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ان کے علمی شغف نے کبھی ان کی قوت عمل کو کمزور نہیں کیا اور اس بات

پر آج تک مجھے رشک آتا ہے۔

ان کی زندگی میں بظاہر سب سے کم اہمیت اپنی روزی کمانے کے شغل یعنی وکالت کی تھی۔ وہ مہینہ میں بس اتنے ہی مقدمے لیتے تھے کہ مہینہ کا خرچ نکل آئے اور باقی وقت مطالعہ، تصنیف وتالیف اور سیاسی اور سماجی خدمت میں گذارتے اپنے خرچ پر ملک بھر کا دورہ کرتے، تقریریں کرتے، اصلاحِ معاشرت کا پرچار کرتے اور صرف پرچار پر بس نہ کرتے بلکہ اس کے لئے شہر شہر مقامی انجمنیں اور جماعتیں قائم کرتے جو اس کام کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری لیتیں۔ انھوں نے کوئی دس سال تک ایک رسالہ عصرِ جدید کے نام سے نکالا (جو پہلے ماہوار تھا، پھر ہفتہ وار ہوگیا) جس کا خاص مقصد اہلِ ملک میں، بالخصوص مسلمانوں میں، ان رسوم ورواج، عادات ورجحانات کے خلاف جہاد کرنا تھا، جو ان کی ترقی میں حائل تھے۔ اس میں سیاسی مسائل کی بحث بھی ہوتی تھی، حکومت اور سیاسی پارٹیوں پر بے لاگ تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ سیاسی آزادی اور سماجی واقتصادی معاملات میں روشن خیالی کا دیانت داری کے ساتھ، بڑا قریبی واسطہ ہے۔ انھوں نے اپنے انتقال سے چند سال پہلے تمام اسلامی ملکوں کا دورہ کیا تھا۔ وہاں سیاسی اور معاشرتی بیداری پیدا کرنے کے لئے لکچر دیئے تھے۔ مقامی لیڈروں سے مل کر ان کے منجمد یا مایوس ذہنوں میں ہل چل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا جہاں تک میں بعد میں اندازہ کر سکا خاصا اثر ہوا۔ کم سے کم بعض ملکوں میں اس زمانے میں آج کل کی طرح کوئی ایسی بین الاقوامی جماعتیں یا ادارے نہ تھے جو اس قسم کے سفر میں کسی قسم کی مالی یا کوئی اور امداد دے سکتے، اور لوگ آرام سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کر سکتے، اور منزل پر پہنچ کر کسی کے مہمان ہو سکتے۔ اگرچہ وہ ایک متوسط الحال شخص تھے اور ان کے پاس

کوئی خاص سرمایہ نہ تھا لیکن انھوں نے نہ معلوم کیسے یہ سارا خرچ خود اٹھایا اور اس سفر کی روداد انھوں نے اپنی ایک تصنیف "روزنامچہ سیر و سیاحت" میں لکھی جس سے ان کی دور اندیشی، بالغ نظری اور گہری اسلامی اور بین الاقوامی دل چسپی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض باتیں مجھے براہ راست یاد ہیں لیکن زیادہ تر باتیں ان بے شمار خطوط اور مضامین سے معلوم ہوئیں جو ان کی وفات پر میرے اور میرے چچاؤں کے نام ان کے بہت سے احباب کی طرف سے آئے اور جن کا مجموعہ میرے بڑے چچا نے ترتیب دے کر "تعزیت نامہ" کے نام سے شائع کیا۔

باوجود اپنی علمی اور ادبی دل چسپیوں کے ان میں عملی کاموں کی بھی بہت اچھی صلاحیت تھی جو افسوس ہے مجھ میں بہت کم پیدا ہو سکی جب مثلاً وہ میرٹھ سے پانی پت آتے تو انھیں جن لوگوں سے کام ہوتا انھیں پہلے سے اطلاع دیدیتے تھے اور پھر ایک یا دو دن کے قیام میں وہ ان سب کو بھگتا دیتے تھے۔ مجھے ان کی اس صلاحیتِ عمل پر تعجب ہوتا تھا اور اب رشک آتا ہے۔ لیکن ان کاموں میں انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ کرتے تھے اس لئے کہ کرنے تھے۔ دل ان کا اپنے علمی، سیاسی، سماجی ادبی مشاغل ہی میں لگتا تھا۔ اور ان کی خدمت میں انھوں نے اپنی زندگی کو اس قدر شدت کے ساتھ بسر کیا کہ بیالیس سال کی عمر میں بہت سے غیر معمولی کارناموں کا ایک انبار چھوڑ کر اپنے خالق سے جا ملے۔

ان کی زندگی اور تصانیف سے میں نے سب سے بڑا سبق یہ سیکھا (معلوم نہیں کہاں تک) کہ انسان کو ہر کسی کے ساتھ رواداری اور انصاف کے ساتھ پیش آنا چاہیۓ لیکن جہاں حق کی حمایت کا مسئلہ ہو وہاں رائے عامہ کے ساتھ چلنا اور اس طرح سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنا، وقار انسانیت کے منافی ہے۔

زندگی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی ایک امانت بھی ہے جس کے صرف کرنے کے لئے خاص آداب ہیں۔

میری ابتدائی تربیت اور میری طبیعت کو بنانے میں اپنے والدین کے علاوہ تین بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ خواجہ سجاد حسین جن کا تھوڑا سا ذکر اوپر کرچکا ہوں اور میرے دونوں چچا خواجہ غلام الحسنین اور خواجہ غلام السبطین۔ چاہتا ہوں کہ ان سے بھی متعارف کرادوں۔

خواجہ سجاد حسین کی صحبت کا فیض میں نے کافی عرصے تک اٹھایا کیوں کہ میں اُن کی زندگی میں تعلیم سے فارغ ہو کر علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر بن چکا تھا، اور جب کبھی پانی پت آتا، ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتا۔ ان کی زندگی بہت بھرپور گذری۔ وہ علی گڑھ کالج کے پہلے گریجویٹ تھے، پہلے کرکٹ کپتان، یونین کے پہلے صدر اور اس کے نامور مقرر۔ یعنی انھیں ہر میدان میں فخر تقدم حاصل تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے معلمی کا شغل اختیار کیا اور صوبہ سرحد میں انسپکٹر جنرل تعلیمات کے عہدے تک پہنچنے کے بعد ریٹائرڈ ہوئے جو اس زمانے میں ایک ہندوستانی کے لئے گویا نوکری کی معراج تھی۔ اس صوبے میں کہ فراخ دل پٹھانوں کا صوبہ ہے، (جو نکتہ نواز ہیں، اور ایک نکتہ پر خوش ہو کر آپ کی خاطر اپنی جان دینے کو تیار ہو جائیں گے اور ایک نکتہ پر خفا ہو کر آپ کی جان لینے کو آمادہ!) انھوں نے اس قدر نیک نامی اور ہر دلعزیزی حاصل کی کہ ان کا کام برسوں تک زبان زد خلائق رہا۔ اس بات کا میں چشم دید مشاہد ہوں۔ میں شاید نویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ خواجہ صاحب حالی مسلم ہائی اسکول کے لئے چندہ کرنے صوبہ سرحد تشریف لے گئے اور مجھے بھی حکم ملا کہ ساتھ چلو۔ اس سفر کے دوران میں ہم لوگ نہ صرف پشاور گئے بلکہ بہت سے قصبوں اور گاؤں کا دورہ بھی کیا اور ہر جگہ ان کا بہت

جوش اور خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا اور لوگوں نے ان کو اپنی آنکھوں پر جگہ دی۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں ہر اسکول کا بار بار دورہ کیا تھا نہ صرف استادوں سے واقف تھے بلکہ اپنے زمانے کے بیشتر طلبا، کو جانتے تھے، ان کو پڑھایا تھا، ان کا امتحان لیا تھا، یا ان کے بزرگوں میں سے کسی نہ کسی کو پڑھایا تھا، ان کو انعام دیئے تھے، شاید ان کی گوشمالی بھی کی تھی۔ استادوں کو ترقیاں دی تھیں۔ انھیں ان میں سے بیشتر لوگوں کے نام یاد تھے۔ غرض اس صوبے کی تعلیمی تعمیر میں ان کا بڑا ہاتھ تھا اور ہر لحاظ سے انھوں نے خود کو جذباتی طور پر اس کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ پٹھان کی ایک بڑی صفت یہ ہے (بشرطیکہ وہ بتقضائے پٹھانیت خفا نہ ہو جائے!) کہ وہ بڑا احسان شناس ہوتا ہے۔ اہل سرحد ان کے بہت احسانمند تھے اور اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا کہ نہ صرف اسکول کے لئے دل کھول کر چندہ دیا، بلکہ جہاں کہیں ہم پہنچتے، ہماری خاطر کی جاتی، دعوتیں کی جاتیں، چندہ بعد میں ملتا، کھانا پہلے ضروری تھا۔ بلکہ مجھے تو کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں، وہیں، جاں بحق نہ تسلیم ہو جاؤں! وہ لوگ بہت مہمان نواز بھی تھے اور ماشاءاللہ بسیار خور بھی اور میرا ظرف" ہمیشہ بہت چھوٹا رہا۔ جب ان کے کھانے کی ابتدا ہوتی تو میں تقریباً فارغ ہو چکا ہوتا۔ انھیں یقین ہی نہ آتا اور سمجھتے کہ تکلف کر رہا ہوں اور اصرار کرتے کہ اور کھاؤ۔ انکار میں اندیشہ تھا خفا نہ ہو جائیں اور اقرار میں یہ فکر کہ میں خود واصل بحق نہ ہو جاؤں۔ سرحدی پٹھانوں ہی کا تو یہ محبوب شعر ہے نا؟

پلاؤ برہ چو بینی ہلاک کن خود را
کہ مرگ ہائے چناں گاہ گاہ می باشد!

خواجہ صاحب کی بدولت مجھے پہلی مرتبہ پانی پت سے باہر جا کر ایک بالکل

مختلف صوبے کو، اس کے لوگوں کو، اس کی تہذیب و تمدن کو دیکھنے کا موقع ملا اور اس بات کا اندازہ ہوا کہ ایک ہی ملک کے لوگوں میں بعض اعتبار سے کتنا فرق ہو سکتا ہے اور پھر بھی ان میں اتحاد اور یک جہتی کا احساس ممکن ہے (گو آجکل یہ اتحاد اور یک جہتی گہن میں آئی ہوئی ہے)... ان کی ذات پانی پت میں مغتنمات میں سے تھی۔ "مشاہیر" میں سے جو بھی پانی پت آتا، ان کے ہاں ضرور حاضری دیتا۔ کہ وہ نہ صرف مولانا حالی کی یادگار تھے بلکہ علی گڑھ کے تعلق کی وجہ سے، ان کے جاننے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ، میرے بعض دوسرے بزرگوں سے مختلف تھے۔ باوجود صحیح معنوں میں ایک مذہبی آدمی ہونے کے (بلکہ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ بوجہ اس کے) ان میں کسی قسم کی تنگی یا تنگ نظری نہ تھی۔ وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ ایک خوش لباس، خوش پوشاک، خوش باش آدمی تھے۔ پان کھاتے تھے۔ حقہ سگریٹ پیتے تھے (ہمارے بعض بزرگ سختی سے ان چیزوں کے خلاف تھے) چائے کا بہت شوق تھا۔ ہر روز تیسرے پہر کے وقت وہ اپنے مکان کے چبوترے پر آکر اپنی ایک پرانی آرام دہ کرسی پر بیٹھ جاتے اور قرآن شریف کے ایک دو پارے پڑھتے۔ اور جب بعد میں بصارت میں فرق آگیا تو ایک حافظ صاحب ان کو یہ پارے پڑھ کر سناتے۔ اس کے بعد چائے کا وقت آجاتا اور ان کے عزیز، دوست، پڑوسی، ملاقاتی، اہل محلہ، دکاندار (جن میں سے بعض محض چائے پینے آتے) جمع ہو جاتے۔ اگر قرآن شریف کی تلاوت جاری ہوتی تو ادب سے خاموش بیٹھے رہتے۔ پھر ان کا ملازم ان کی ہدایت کے مطابق چائے اور بالعموم علی گڑھ کے بسکٹ تقسیم کرتا۔ کبھی کوئی ان کے اس میخانہ ساقی سے تشنہ کام نہیں گیا۔ میں ہمیشہ بہت دلچسپی کے ساتھ یہ بات نوٹ کرتا تھا کہ ان کے ہاں انسانوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ غریب اور امیر، 'اونچے' اور 'نیچے' میں تمیز نہیں کرتے، وہ دراصل

انسانی برادری کی حقیقت کے قائل تھے۔ کہتے تو ہم سبھی ہیں، اور اب اور زیادہ کہنے لگے ہیں، لیکن ہم میں سے بیشتر احتیاطاً اس تصور کو اپنی زندگی میں زیادہ جگہ نہیں دیتے۔ میں نے بہت کم دیکھا ہے کہ ہمارے مدعیانِ جمہوریت اور بھائی چارے کا پرچار کرنے والوں کے ڈرائینگ روم میں "عام" لوگوں اور غریبوں کو بے روک ٹوک آنے جانے کی آزادی ہو (سوائے اس کے کہ کسی سیاسی مصلحت سے مثلاً انتخاب کے زمانے میں عارضی طور پر ان کا ضمیر بیدار ہو جائے) لیکن اس مردِ شریف کا ظاہر اور باطن، اصول اور عمل ایک تھا۔ زندگی کے ابتدائی دور میں مجھے جن مشاہیر سے ملنے کا موقع ملا، ان میں سے بیشتر ان کے احباب یا جاننے والے تھے۔ اور ان کا تعلق علی گڑھ سے تھا جب میں علی گڑھ کالج میں داخلہ کے لئے گیا تو ان کے اور اپنے والد اور چچا کے رشتے سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور غالباً دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مجھے بھی وہاں ان کے قائم کئے ہوئے معیاروں کا پاس کرنا ہوگا۔

ان کے بہت سے خط میرے پاس محفوظ ہیں اور میں پچھلے دنوں انھیں پڑھتا رہا ہوں، ان سے خواجہ صاحب کی انسانی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے انھیں ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ ان کے عزیز اور دوسرے نادار طلبہ کی تعلیم کا کسی نہ کسی طرح انتظام کیا جائے میں جس زمانے میں علی گڑھ میں تھا وہ ایسے طلبہ کو میرے ہاں بھیج دیتے تھے، جہاں میں نے اپنے مکان میں ان کے لئے ایک علیحدہ بلاک بنایا تھا، جہاں وہ رہتے، کھانے کا انتظام میں کرتا، لیکن باقی خرچہ وہ اپنی قلیل پنشن میں سے خود اٹھاتے۔ ایک دفعہ انھوں نے خط میں لکھا کہ تمھارے ہاں جو تین طلبہ رہتے ہیں، ان کے خرچ اور امتحان کی فیس کے لئے ۔/۱۲۵ روپے بھیجتا ہوں۔ "اب شگون کی خاطر بنک میں ایک روپیہ تین آنے باقی ہیں"۔ خطوں میں ہر کسی کا

خیال، ان کی پریشانیوں کی فکر ان کی مزاج پرسی، علاج کے لئے ہدایات۔ میری بچیوں کی کامیابی پر انتہائی خوشی کا اظہار ہوتا۔ اگر وہ سمجھتے کہ کسی شخص میں کوئی صلاحیت ہے تو اس کی بہت فیاضی کے ساتھ ہمت افزائی کرتے۔ ایک دفعہ میں نے ایام جہالت میں ایک طویل افسانہ "شہید وفا" لکھا تھا (اس کے بعد چند افسانے اور لکھے لیکن جلد ہی خدا نے اردو ادب کو اس آنے والے خطرے سے بچا لیا) جس کو بعد میں کتابی شکل میں میرے ایک دوست سید الطاف علی نے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں ایک قابل کارکن تھے، شائع کر دیا۔ میں نے اس کی ایک جلد خواجہ صاحب کے ملاحظہ کے لئے بھیجی۔ انھوں نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کا مقام وقوع خود پانی پت ہے۔ اس میں وہاں کی سماجی زندگی اور خاصکر حفظانِ صحت کے خراب اور غیر ذمہ دار انتظام کی وجہ سے جو بیماریاں بکثرت وہاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر تھا۔ بہت خوش ہوئے اور فوراً مجھے ایک خط لکھا:

"میں نے ساری کتاب ایک ہی نشست میں اول سے آخر تک سنی، نہایت دل چسپ اور سبق آموز تصنیف ہے۔ اس کو سن کر خاص کر اس وجہ سے بہت خوشی ہوئی کہ بعض خیالات جو کچھ عرصے سے میرے دل میں کام کر رہے ہیں، ان کے متعلق الجھنوں کو اس نے صاف کر دیا۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے ہمارے کریم نگر (پانی پت) میں کثرت سے مفت تقسیم کی جائے"۔

اسی طرح جب میں نے اقبال کے فلسفہ تعلیم پر کتاب لکھی تو اس کی ایک جلد ان کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے خط لکھا اور قابل ذکر ہے یہ بات کہ یہ میرے ایک بہت محترم بزرگ کا خط ہے۔ میں ان سے عمر میں، قابلیت اور

مرتبہ کے اعتبار سے بہت چھوٹا تھا لیکن یہ ان کی شخصیت کا کمال تھا کہ ستّر برس کی عمر میں بھی وہ اپنے چھوٹوں سے سیکھنے کو تیار تھے اور ان کی ہمت افزائی کے لئے آمادہ :۔

"چار دن ہوئے اقبال کا فلسفۂ تعلیم، سبقاً سبقاً اول سے آخر تک سن کر ختم کیا۔ مجھے کسی کتاب کے مطالعہ میں لطف نہیں آتا، اور خوشی نہیں ہوتی جب تک اول سے آخر تک بخود نہ پڑھا جائے اور سمجھا جائے، آنکھیں دوسروں کی، سماعت کمزور، مضمون سنجیدہ اور فلسفیانہ اور طرزِ ادا عالمانہ، اس لئے کتاب ختم کرنے میں غیر معمولی دیر لگی۔ میں ہمیشہ سے اقبال مرحوم کو ایک نہایت نیک اور پاک طینت آدمی جانتا تھا اور ان کی شاعری کے متعلق سنے سنائے موافق اور مخالف خیالات دل میں تھے اور سرسری طور پر جو ان کے اشعار دیکھنے میں آئے ان کا پیرایہ بیان کچھ ایسا مشکل معلوم ہوا کہ کبھی بالاستیعاب ان کا کلام دیکھنے کا خیال نہیں ہوا اور نہ موقع ملا۔ تمھاری کتاب کے مطالعے کے بعد جی چاہتا ہے کہ مرحوم کا سارا کلام جمع کرکے اسے اوّل سے آخر تک سنوں... حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری کے لکھے جانے سے پہلے غالب اور انیس کا پایہ شاعری میں بہت کم لوگوں نے پہچانا تھا، اگرچہ شاعری کی فرقہ بندی کی وجہ سے اور بطور فیشن کے لوگ ان کی تعریف کرتے تھے اس طرح حقیقی معنوں میں تمھاری کتاب اقبال کو پبلک میں روشناس کرانے والی ہے معلوم نہیں اس کا اردو ترجمہ چھپوانے کا تمھارا خیال ہے کہ نہیں۔"

حالانکہ میرے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے خلاف ان کی طبیعت میں لچک زیادہ تھی، لیکن اصول پرستی میں پہاڑ کی طرح مستحکم تھے۔ ایک دفعہ مجھے لکھا کہ ایک طالب علم کو ٹریننگ کالج علی گڑھ میں لینے کی کوشش کروں (جس کا میں خود ہی پرنسپل تھا) مقابلہ کے امتحان میں اس کے نمبر کم آئے اور داخلہ نہیں ہو سکا۔ میں نے معذرت کا خط لکھا، جواب آیا:

"تمھارا خط پہنچا۔ اس معاملہ میں جو سہولتیں ممکن تھیں تم نے بہم پہنچائیں۔ اس سے زیادہ تم کیا کر سکتے تھے؟ اور جو کچھ کوشش میرے امکان میں تھی میں نے کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ خدا کی مرضی ہے اور وہی اولیٰ ہے، اور اس میں یقیناً ہماری بہتری ہے مجھے بالکل افسوس نہیں ہے اور تمھیں کوئی وجہ ندامت کی نہیں ہے میرا تو ایمان قرآن شریف کی اس آیت پر ہے

(ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لئے بری ہو اور ممکن ہے تم کسی چیز کو بُرا سمجھو اور وہ تمھارے لئے اچھی ہو)"

ایک اور خط کے چند جملے دہرانے کے قابل ہیں، کیوں کہ اس میں ان کی اصول پرستی کا بھی اظہار ہے اور ایک قسم کی لچک کا بھی جوان کو عقیدے کی سختی سے محفوظ رکھتی تھی۔

"ہمارے نئے ڈاکٹر صاحب جو غایت لائق اور ہمدرد طبیب اور انسان ہیں ان کے پاس ان کے کسی دوست کا خط آیا ہے جو بجنسہٖ تمھارے مطالعے کے لئے بھیجتا ہوں۔ اس کو دیکھ کر چاک کر دینا۔ میں نے ان سے زبانی کہہ دیا ہے کہ جو لوگ اپنے فرائض کو سچائی اور ہمدردی سے ادا کرتے ہیں ان سے اس قسم کی استدعا

کرنا ان کی توہین کرتا ہے۔ لیکن غرض مند انسان ہمیشہ اس قسم کی کارروائی کرتے رہتے ہیں۔ اس کا زیادہ برا بھی نہیں ماننا چاہیے۔"

اب ٹھیک تو یاد نہیں مگر غالباً وہ سفارش کسی امتحان کے بارے میں تھی۔ آخری جملہ میری ہدایت کے لئے تھا اس لئے کہ انھیں معلوم تھا کہ اس معاملہ میں میرے مزاج میں بہت زیادہ سختی تھی اور میرے لئے اس کو برداشت کرنا مشکل تھا۔

کہاں سے آئیں گے اب اس قسم کے لوگ؟ خدا کا شکر ہے کہ ناپید نہیں لیکن اس سانچہ میں اب مقابلتہً بہت کم لوگ ڈھلتے ہیں۔

اپنے تعلیمی تصورات اور اصولوں میں بہت روشن خیال تھے اور اپنے زمانے سے آگے جب ہمارے اسکول کی عمارت بن رہی تھی، مکمل نہیں ہوئی تھی، تو انھوں نے اسکول کو اس کی پرانی عمارت سے وہاں منتقل کر دیا اور سب طلبہ کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ اچھا اسکول وہی ہے جس کو بنانے میں، چاہے وہ عمارت کا بنانا ہو، یا اسکول کی روایتوں اور علمی فضا کا بنانا، استاد اور طلبہ برابر کے شریک ہوں۔ ورنہ بنی بنائی عمارت میں کون آکر نہیں بس سکتا۔ چنانچہ ہم سب تعمیر کی آخری منزل میں اینٹیں ڈھوتے تھے۔ ہاتھ کے پمپ کو باری باری چلا کر "باغ" کو پانی دیتے تھے۔ باغ جو ابھی بنا نہیں تھا لیکن بنانے کا حوصلہ دل میں پیدا ہو گیا تھا اور یہ دیکھ کر ہمت بڑھتی تھی کہ ہمارا میر کارواں، ساٹھ سال کا جوان ہمت بوڑھا ہے جو اس بار کو ہمارے دوش بدوش اٹھاتا ہے۔ اس تجربے کے طفیل ہمارے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ "یہ ہمارا اسکول ہے کیوں کہ ہم نے اسے بنایا ہے"۔ ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ہاتھ سے کام کرنا نہ صرف عار کی بات نہیں ہے بلکہ تعلیم کا ایک لازمی اور قیمتی جزو ہے اور اگر کسی کام کو ایک

منصوبہ کی شکل میں بچوں کے سامنے رکھا جائے تو قدرتاً ان کو اپیل کرتا ہے۔ یہ تو شرافت کا غلط تصور اور بورژوا سوسائٹی کی تاریک خیالی ہے جس نے ہاتھ کے کام کو ذلیل سمجھ لیا ہے۔ شاید انھیں اپنے اس خیال میں ابتدائی تقویت خود اپنے والد مولانا حالؔی کی شہرۂ آفاق تصنیف "مسدس مدوجزر اسلام" (جس کو اب مختصر کر کے مسدسِ حالؔی کہا جاتا ہے) سے ملی ہو جنھوں نے اس میں کام، شرافت، علم اور عمل اور نیکی کے بنیادی تصورات اور رشتوں کو اس جوش اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ آج بھی اتنی ہی تازہ ہے جیسی اب سے کوئی سو برس پہلے تھی۔ کئی سال بعد ۱۹۳۶ء میں جب میں کشمیر میں ڈائریکٹر تعلیمات ہوا اور میں نے کشمیر کے...... تمام اسکولوں میں "محنت کے ہفتے" کی سکیم جاری کی، تو میں نے اپنے دل میں اس کا انتساب خواجہ سجاد حسین ہی کے نام کیا تھا۔

ان کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ میں ان کی ہر بات کو لفظاً ٹھیک سمجھتا تھا۔ صرف بچپن ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی جب میں تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِکار ہو چکا تھا۔ اس کی ایک عجیب مثال میرے ذہن میں آتی ہے۔ ان کی عمر اسی سال کے لگ بھگ تھی اور وہ وقتاً فوقتاً بیمار بھی ہو جاتے تھے۔ محرم کا زمانہ تھا اور عاشور کی رات۔ اگلے روز ہم لوگ اعمال محرم کرنے مقامی "کربلا" میں جایا کرتے تھے۔ اس رات انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بہت اطمینان کے ساتھ کہا۔ "بیٹا مجھے یقین ہے کہ کل میری زندگی ختم ہو جائے گی اور میں اپنے خالق کے حضور میں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھارے اعمال محرم میں خلل پڑے گا۔ امید ہے کہ تم سب پسماندگان کو تسلی دینے کی کوشش کرو گے۔" میں دوا علاج اور ڈاکٹر کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر چلا گیا اور کہہ دیا کہ اگر کوئی فوری ضرورت ہو تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔ واپس آیا تو اندیشہ تھا کہ انھیں وصال الٰہی

نصیب ہو گیا ہو گا۔ لیکن یہ دیکھ کر کیسا خوش گوار تعجب ہوا کہ ان کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک زندہ رہے اور اسی شان، شرافت، انسانیت کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے رہے۔[1]

میرے بڑے چچا مولوی غلام الحسنین ایک غیر معمولی کردار کے آدمی تھے۔ ان کو دنیاوی معاملات سے بہت سرسری واسطہ تھا، نہ ان میں زیادہ دل چسپی نہ ان کی سمجھ۔ ان کی زندگی کے دو مرکز تھے۔ علم و تعلیم اور مذہب۔ منصبی اعتبار سے وہ صرف ایک مڈل اسکول کے سیکنڈ ماسٹر تھے اور معمولی سا مشاہرہ پاتے تھے جس کو وہ اپنی ذات پر کم اور دوسروں پر زیادہ خرچ کرتے تھے۔ ان کی ایک بیوی تھیں جن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا کیوں کہ وہ اپنے میکے میں رہتی تھیں اور ان کے مشاغل میں کوئی دلچسپی نہ لیتی تھیں، نہ لے سکتی تھیں۔ لیکن علمی اعتبار سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ساری عمر مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ مذہب میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ مولویانہ تنگ نظری سے پاک تھے۔ بلکہ اس زمانے کے اعتبار سے کافی روشن خیال تھے۔ خطیب کی حیثیت سے دور دور تک لوگ ان سے واقف تھے اور تقریریں کرنے کے لئے ان کو بلاتے تھے، میرا خیال ہے کہ وہ یہ سفر ریل کے تیسرے درجہ میں اپنے خرچ پر کرتے تھے، بلانے والوں سے سفر خرچ تک نہ لیتے تھے۔ سرمہ مفت نظر کی قیمت تو یہی ہو گی تا کہ چشم خریدار پر اس کا احسان رہے، لیکن وہ احسان مندی تک کے طالب نہ تھے۔ ایک دھن تھی ایک ولولہ تھا مذہب اور علم کی خدمت کا جس کو وہ پورا کرتے رہتے تھے۔ اپنے مذہب کے بارے میں وعظ کرتے، محرم کے دنوں میں ذکر حسین کی مجلسیں پڑھتے۔ لیکن بر خلاف اکثر دوسرے

---

[1] ۱۹۴۶ء میں پانی پت میں انھوں نے وفات پائی۔

ذاکروں کے اسلام کا ایک دور از کار تصور پیش کرنے، یا مجلسِ حسین میں محض گریہ و بکا کو حاصل مجلس سمجھتے کے، وہ اپنے بیان کی بنیاد تمام تر قرآن شریف اور احادیث رسول پر رکھتے، اور ان کا خاص مقصد اخلاق کی تعلیم پر زور دینا ہوتا تھا۔ اوّل اوّل لوگ اس انداز بیان سے بدکتے تھے اور اس کو گویا ایک قسم کی بدعت جانتے تھے۔ انھیں زبان کے چٹخاروں کی عادت تھی اور ان کا بیان منطقی اور مدلّل ہوتا تھا جو دل سے زیادہ دماغ کو اپیل کرتا تھا۔ لوگ مذہبی جلسوں میں توقع رکھتے تھے کہ دوسرے مذہبوں کی تعلیم کو کم درجے کا ثابت کیا جائے اور اسلامی اساطیر کے معجزوں وغیرہ کا ذکر اس انداز سے کیا جائے کہ لوگ درود کے نعروں سے اس کا استقبال کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اخلاق کی تعلیم انسانی فطرت کی ایک مانگ ہے۔ یہ ہر زمانے میں اٹھی اور مذہب نے اس پکار کا جواب دیا اور اسلام کی تعلیم اس بارے میں ان کی تصدیق بھی ہے اور تکمیل بھی۔ لوگ رفتہ رفتہ اس اندازِ بیان کے عادی ہو گئے تو ان پر یا ان میں سے سمجھ دار افراد پر، اس کا اثر ہونے لگا اور وہ تقریروں میں دلچسپی لینے لگے۔

ان کی تقریر اور تحریر میں دو خاص باتیں تھیں جن میں سے پہلی شاید ان کے بہت اچھے معلم ہونے کا نتیجہ تھی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے بیان کو اس قدر سادہ اور سلیس بنائیں کہ کسی پڑھنے یا سننے والے کو اس کے سمجھنے دقت نہ ہو۔ وہ کبھی شوکتِ الفاظ یا اظہارِ علمیت کے ذریعے لوگوں کو مرعوب کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ بعض دفعہ اس بارے میں اتنا غلو کرتے کہ کوئی چیز لکھتے تو خاندان کے بچوں کو، (جن کی عمریں آٹھ اور پندرہ سال کے بیچ میں ہوتیں) اپنے پاس بٹھا لیتے اور جو کچھ لکھا ہوتا ان کو سناتے اور پوچھتے کہ تمھاری سمجھ میں آیا یا نہیں؟ جب تک انھیں چین نہ آتا جب تک وہ بقول شخصے اپنے مطالب کو پانی نہ بنا لیں۔

اپنی تحریروں پر بار بار نظر ڈالتے جب تک ہر لفظ ان کے خیال کے مطابق ان کے مفہوم کا آئینہ نہ بن جاتا نہ خود چین سے بیٹھتے نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے! ہر مضمون پر عنوان اور ذیلی عنوان لگاتے، حاشیئے لکھتے! اتنی محنت اور کاوش کے ساتھ جیسے اچھے ریسرچ اسکالر اپنے امتحانی مقالے کے لئے کرتے ہیں۔ دوسری صفت ان کی تحریر کی، خصوصاً مذہبی معاملات میں، یہ تھی کہ وہ کبھی کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرتے تھے جس سے کسی کی دل شکنی ہو۔ رائے صفائی اور جرأت کے ساتھ ظاہر کرتے تھے لیکن مقصود کسی کی دل شکنی یا تحقیر نہ ہوتی تھی۔ یہ بات اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مذہبی مناظروں میں اس چیز کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ جب وہ پانی پت میں ہمارے گھر، یا محلے کے امام باڑے میں مجلسیں پڑھتے تھے۔ حاضرین میں ہندو حضرات بھی کچھ نہ کچھ شامل ہوتے اور ان کے بیان سے لطف اٹھاتے۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے کہیں کہیں لیکن یہ رواداری اور ایک دوسرے کے خیالات میں سچی دل چسپی بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے۔

میں نے اپنے وطن میں ان کی جو عزت اور وقعت دیکھی اس کا میرے دل پر بہت گہرا نقش ہے۔ مڈل اسکول سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے خواجہ سجاد حسین کی خواہش پر چند سال کے لئے حالی مسلم ہائی اسکول کی ہیڈماسٹری قبول کر لی تھی۔ میں اس وقت اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور اکثر ان کے ساتھ گھر سے اسکول تک (جو تقریباً دو میل کا فاصلہ تھا) پیدل جاتا تھا۔ راستہ شہر کے بازار میں سے گذرتا تھا۔ جس کے دونوں طرف تقریباً سب دوکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ وہ سب ان کو پہچانتے تھے کیوں کہ انھوں نے خود ان کو، یا ان کے باپ یا چچا کو یا ان کی اولاد کو پڑھایا تھا۔ پانی پت کا کون تعلیم یافتہ شخص تھا جس کو، ان کی معلمی کے تقریباً ۳۵ سال میں ان کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں ہوا تھا؟ جب وہ روز اس

بازار میں سے گزرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ کسی بڑے حاکم کا جلوس گزر رہا ہے۔ جو دوکاندار اس وقت خالی ہوتے وہ اکثر دوکان سے نیچے اتر کر ان کے پاؤں چھوتے، جو سودا سلف بیچتے ہوتے وہ اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے۔ لہٰذا انھیں اسکول پہنچنے میں دس پندرہ منٹ زیادہ ہی لگ جاتے۔ جب میں ان سے ذرا بے تکلف ہو گیا (اور کس قدر جھجک اور ادب تھا اس بے تکلفی میں بھی!) تو کہتا تھا: "اچھے ابّا ذرا جلدی چلئے کیوں کہ راستے میں آپ کو اپنی اُمت کے سلام بھی لینے ہیں!" یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر استادوں کا ادب آج کل سے زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن جو کیفیت میں نے بیان کی وہ میں نے اپنی آنکھوں سے کسی اور استاد کے بارے میں نہیں دیکھی۔ یہ دراصل ان کی شخصیت اور کردار، ان کے تعلیمی شغف اور طلبہ میں ان کی گہری اور پرخلوص دلچسپی کا اعتراف تھا جو لوگ خود بخود کرتے تھے۔

اُنھوں نے اردو، عربی اور فارسی کے اعلیٰ امتحانات تو پاس کیے تھے لیکن انگریزی صرف انٹرنس تک پڑھی تھی۔ لیکن انگریزی دانی کا یہ حال تھا کہ ہربرٹ اسپنسر کے "فلسفہ تعلیم" کا اردو ترجمہ اس وقت کیا جب ملک کے چوٹی کے اردو ادیبوں نے بہ اتفاق رائے یہ کہا تھا کہ ابھی اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اس کلاسک کے ترجمے کا بار اٹھا سکے۔ اور ترجمہ بھی اس پائے کا کہ خود ایک کلاسک بن گیا۔ ان کی بیشتر دوسری تصانیف مذہب، اخلاق، اور فلسفہ سے متعلق تھیں۔ بعض عالموں کے لئے بعض چھوٹے بچوں کے لئے۔

ان کی معلمی کا ذرا سا ذکر اور کر دوں وہ اسکول میں زیادہ تر انگریزی پڑھاتے تھے اور اس خوبی سے کہ ان کے کسی طالب علم کے لئے (الا ماشاء اللہ) یہ ناممکن تھا کہ وہ ان سے تین چار سال پڑھنے کے بعد گریمر کی کوئی معمولی غلطی کر سکے

جب کہ آج کل، باوجود طریقۂ تعلیم میں تبدیلیوں اور ریسرچ کے، ایک عام گریجویٹ کے لئے بھی یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے۔ ان کے طریقۂ تعلیم کو شاید آج کل کے ماہرینِ تعلیم تسلیم نہ کریں لیکن نتیجہ سے انکار کرنا مشکل ہے۔ اگر آج میں خاصی صحیح انگریزی لکھ سکتا ہوں (کم از کم میرا بر بنائے خوش فہمی یہی خیال ہے!) تو اس کی بنیاد، ان کی نگرانی میں، پانی پت کے چھوٹے سے مڈل اسکول میں پڑی تھی۔ باوجود اپنے علمی مشاغل کے ان کو اپنے طلبہ میں اس قدر دلچسپی تھی کہ ان دل اور ان کے گھر کا دروازہ ہر وقت ان کے لئے کھلا رہتا تھا۔ ہر شوقین طالب علم کو یہ حق تھا کہ جب کبھی اُسے مدد یا ہدایت کی ضرورت ہو بلا تکلف ان کے پاس پہنچ جائے۔ وہ اپنا ضروری سے ضروری کام ملتوی کر کے اس پر اپنا وقت صرف کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اتنا اور کہہ دوں کہ جسمانی سزا دینے کے معاملے میں انھیں بر بنائے ضمیر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ "گوش مالی" میں اتنا کمال رکھتے تھے کہ چند لمحے کے لئے لڑکے کے دل میں خدا کا خوف اور کانوں میں بجلی سی چمک جاتی تھی۔ لیکن یہ وہ پرانا زمانہ تھا جب سزا دینا استاد کا "حق" سمجھا جاتا تھا اور لڑکے بالعموم اس کا بُرا نہ مانتے تھے (یا کم سے کم اس خیال کو ظاہر نہ کرتے تھے!) میں نے کسی کو ان کی شکایت کرتے نہیں سُنا سوائے اس کے کہ "وہ بھئی مولوی صاحب تو گوش مالی بڑی بری کرتے ہیں!" لیکن "بری طرح" کا مطلب دراصل "اچھی طرح" ہوتا تھا۔ اس وقت بچارے طلبہ کو یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ اگر کوئی استاد ان کو "جائز" سزا بھی دے تو ان کا فرض ہے کہ جلوس نکالیں، ہڑتالیں کریں، بسیں جلائیں اسکول کا سامان توڑیں، پھوڑیں، استادوں اور ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کا "گھیراؤ" کریں۔ شاید اس ردِ عمل کے لئے وہ فضا سازگار بھی نہ تھی۔

میں نے یہ خالص عالمانہ شان، یعنی وہ شان جو علم کے ایک سچے متلاشی کی

ہونی چاہیئے یا ان میں دیکھی یا اس کے بہت سال بعد، سنسکرت کے ایک مشہور ودوان، ڈاکٹر سدھیشور ورما ہیں جو میری ڈایرکٹری کے زمانے میں، جموں میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور جن سے بعد میں بھی میرے بہت مخلصانہ تعلقات رہے۔ مولوی صاحب کا یہ حال تھا کہ جب مطالعہ یا تصنیف و تالیف میں مشغول ہوتے تو انھیں دنیا اور مافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی تھی۔ اکثر چار پائی پر بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے کام کی مصروفیت میں شام ہو جاتی، اس کے سائے پھیل کر صحن کو اپنے گھیرے میں لے لیتے اور رفتہ رفتہ کمرے (یا دالان) میں اندھیرا ہو جاتا اور وہ تمام مظاہر قدرت سے بے خبر کتاب یا کاغذ پر اور زیادہ جھک جاتے تاکہ لفظوں کو دیکھ سکیں۔ یہاں تک کہ کوئی عزیز یا لازم ان کے پاس روشنی لا کر رکھ دیتا۔ اب بھی ایسے بہت سے لوگ ہندوستان کے پچپن کروڑ انسانوں میں ہوں گے لیکن بہر حال یہ جنس کمیاب ہے اور زیادہ کمیاب ہوتی جاتی ہے۔ اب تو اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے، خواہ طالب علم ہوں یا استاد، پہلے سے علمی زندگی کے ساتھ شرائط کرنا چاہتے ہیں کہ جب فلاں فلاں سہولتیں فراہم ہوں گی تو ہم کام کر سکیں گے۔ یہ نہیں کہ ان کو بالعموم یہ سہولتیں مل ہی جاتی ہیں، اس حالت میں ان کے پاس اپنے ضمیر کو تسلی دینے کے لئے ایک عذرِ شرعی ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ میں ان کے اس مطالبہ کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں، سماج کا، حکومت کا، تعلیمی اداروں کا، فرض ہے کہ اپنے طلبہ، اپنے استادوں، اپنے ادیبوں، فنکاروں اور دوسرے دماغی کام کرنے والوں کے لئے ہر ممکن اور مناسب سہولت مہیا کرنے کی کوشش کرے لیکن اگر اجازت ہو تو دبی زبان سے یہ کہہ دوں کہ اس کو حکومت اور سماج اور صاحبانِ اختیار کا فرض سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے معلموں اور اہل علم و فن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ رادھا کے ناچنے کے لئے نو من تیل کی شرط لگائیں۔ دنیا کی تاریخ میں بہت سے عالم اور فن کار

ایسے گزرے ہیں جنھوں نے باوجود نامساعد حالات میں کام کرنے کے، وقت کے سینے پر اپنی چھاپ لگائی ہے اور جب میں نے ایسی مثالیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں تو کیسے اس بات کو مان لوں کہ جب تک کسی عالم یا معلم کی تمام مانگیں مان نہ لی جائیں اسے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ آخر کام کے بھی تو کوئی آداب اور اصول ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سامان کی کثرت اور شان و شوکت تخلیق کے سوتوں کو بند کر دیتی ہے۔ اور ہونے والے عالم کا کتب خانہ، یا ہونے والے آرٹسٹ کا سٹوڈیو یا ہونے والے سائنس دان کی لیبارٹری ایک افسر کا دفتر بن کر رہ جاتی ہے اور بس کسی امریکن کاروباری کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دفتر میں بہت اچھا سامان لگایا، ایک نہایت بیش قیمت قالین بچھایا اور جب اس کا کوئی کالج کا دوست اس سے ملنے کے لئے آیا تو اُسے یہ سب چیزیں بڑے فخر کے ساتھ دکھائیں۔ اس نے سب کچھ دیکھا اور پھر ذرا تامل کے ساتھ کہا " ہاں یہ سب سامان بہت اچھا ہے مگر اس میں ایک اندیشہ بھی ہے" اس نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا " وہ کیا؟" دوست نے جواب دیا " اندیشہ یہ ہے کہ تم کہیں یہ نہ سمجھ لو کہ تم بھی اتنے ہی اچھے ہو جتنا یہ قالین ہے۔" —— اس سے میری یہ ہرگز مراد نہیں کہ میں اپنے جیسے کام کرنے والوں کی ضرورتوں کی طرف سے بے حس ہوں بلکہ یہ اس بنیادی حقیقت کا اظہار ہے کہ ہر کام کرنے والے اور اس کے کام میں، ایک حساس، زندہ اور اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے (یا ہونا چاہیئے) جس کو مادی حالات بالکل زیروزبر نہ کر سکیں۔

ان کی صحبت میں، میں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر بہت سی باتیں سیکھیں جو میری زندگی کے بیش قیمت سرمائے کا جزو ہیں (گو مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں ان کو پوری طرح برت نہ سکا۔) مذہب کی لگن اور

اس کا ایک روشن خیال تصور، علم کی وقعت، شاگردوں میں دل چسپی اور ان کی خدمت کے لئے آمادگی، یہ عقیدہ کہ فرد کی ذات سے بھی زیادہ اہمیت ان مقاصدِ عالیہ کی ہے جن کے ساتھ وہ خود کو وابستہ کرنا چاہتا ہے اور علم کی بنیادی قدریں کس طرح انسان کے ذاتی کردار کا جزو بن سکتی ہیں۔ کیا ہیں یہ قدریں؟ حق کی تلاش اور اس تلاش میں رکاوٹوں اور مصلحتوں کے سامنے سپر نہ ڈالنا اور اس کے مقابلے میں ذاتی آرام و آسائش کو اہمیت نہ دینا۔ میں نے ان سے یہ بھی سیکھا کہ علم و فضل ایک شریف انسان میں انانیت کے جذبے کو نہیں بھڑکاتا بلکہ سچا انکسار پیدا کرتا ہے اس لئے کہ ان کو جو دولت حاصل ہے وہ دل و دماغ کو اس طرح بھر دیتی ہے کہ کم تر چیز کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

شعور کی منزل پر پہنچنے کے بعد، شاید سب سے زیادہ، انھیں کے اثر نے میری طبیعت میں مذہب کی اہمیت کے احساس کو مستحکم کیا۔ بنیاد گو خاندانی ماحول اور اپنی والدہ کی جیتی جاگتی مثال کے اثر سے پڑ چکی تھی لیکن خواجہ غلام الحسنین کی صحبت میں اس تعلق میں ایک حد تک فکر کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور جن عقیدوں کو میں نے (دوسرے لوگوں کی طرح) بے سوچے سمجھے قبول کر لیا تھا، ان کی تائید مجھے اپنی محدود عقل سے بھی ملی۔ جانتا ہوں کہ بعض لوگوں کا تجربہ، جو علم و فضل و فکر کے اعتبار سے مجھ سے کہیں بلند ہیں، اس کے برعکس ہوا ہے، لیکن میں تو اپنا تجربہ بیان کر سکتا ہوں۔ مذہب کے تنگ اور ملائی تصور کی طرف تو میں کبھی مائل نہیں ہوا بلکہ شاید اپنے چھوٹے چچا کے اثر سے اس کے خلاف ایک رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ میں مولویوں اور مجتہدوں کا احترام کرتا ہوں لیکن ان کی منصبی حیثیت سے نہیں بلکہ اگر میرے خیال میں اعلیٰ اخلاقی یا ذہنی صفات ان میں

ہوں۔ اگر وہ محض جبہ و دستار اور گفتگو یا تقریر میں عربی کے بڑے بڑے لفظ استعمال کر کے اپنی بزرگی کا سکّہ بٹھانے کی، شعوری یا غیر شعوری کوشش کرتے تو ان کا مجھ پر اثر نہ پڑتا بلکہ ان کی تنقید اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکول یا کالج میں جو "مذہبی تعلیم" مروج تھی اُس کی بدولت میری نظر مذہب کی حقیقتوں تک پہنچی ہو۔ اس کا نصاب بہت تنگ تھا اور تخیّل سے عاری۔ زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل اور مذہب میں جو تعلق ہے یا ہونا چاہیئے وہ اسے بالکل نظر انداز کر دیتا تھا۔ زیادہ تر روزہ، نماز اور طہارت کے ارکان سکھا دینا کافی سمجھا جاتا تھا اور "صفات ثبوتیہ" اور "صفاتِ سلبیہ" کی فہرستیں یاد کرانا، جن کا مطلب بھی بیشتر طلبہ نہ سمجھ پاتے تھے۔ گھر کے اور اپنے عزیزوں کے اثرات کے بعد جو کچھ نظر مذہب میں پیدا ہوئی۔ وہ زیادہ تر اقبال کے کلام، مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن اور دوسری تصانیف، انیس کے مرثیوں اور خود قرآن شریف کے مطالعہ سے لیکن یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا کہ میں گہرائی کے ساتھ اس اہم مضمون کا مطالعہ کر سکا۔

میرے چھوٹے چچا غلام السبطین کی طبیعت دوسری طرح کی تھی۔ بہت سی قدریں تینوں بھائیوں میں مشترک تھیں لیکن وہ ایک عملی انسان تھے اور کاروبار میں اچھی نظر اور اس کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ قناعت جو خاندانی میرات میں شامل تھی، اس کو ان کی جز رسی اور کفایت نے اور زیادہ مستحکم کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی سیرت فولاد کی بنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے اصولوں اور عقیدوں پر اس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے تھے کہ کوئی قوت ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی تھی۔ یہ اصول کیا تھے؟ حق پرستی اور حق گوئی، خدمت، حقوق عباد کا شدید احساس۔ زندگی میں سادگی اور کفایت شعاری، ہر قسم کے "لہو و لعب" سے پرہیز (جس میں تھیٹر، موسیقی، رقص، سنیما سبھی شامل تھے) اور بحیثیت مجموعی زندگی کا ایک زاہد خشک

کا سا تصور۔ انھوں نے اپنے سب عزیزوں اور بچوں کو سختی کے ساتھ یہ سکھایا تھا کہ پان سگریٹ، شراب بلکہ پُرتکلف کھانا اور چائے پینا بھی بری بات ہے۔ (مجھے خوشی ہے کہ بعد میں ہم لوگوں نے چائے کی طرف سے ان کا تعصب دور کر دیا تھا اور کبھی کبھی وہ پوچھ بیٹھتے تھے کہ "بھئی تمہارا بھنگڑ خانہ ابھی نہیں لگا؟") سیگرٹ سے ان کو جو بیزاری تھی اس کو تو آج کی میڈیکل ریسرچ نے بھی حق بجانب کر دکھایا ہے۔ انھیں کا اثر ہے کہ ہم بھائی بہنوں اور ہمارے بعض دیگر ہم عصروں نے کبھی پان، سگریٹ، یا شراب سے شغل نہیں کیا اور بعض تو کبھی فنون لطیفہ میں کوئی شغف پیدا نہیں ہوا۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ ان میں وہابیت کی سختی تھی یا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات نہ تھے۔ وہ سب کے ساتھ ملنے جلنے میں پاک باطن تھے ان کی ظرافت ان کی بعض دوسری سختیوں کو خوبصورتی سے ڈھانپ لیتی تھی۔

ان میں دوسروں کی امداد اور خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا ساری عمر خاندان کے افراد اور دوسرے دوستوں اور عزیزوں کی تیمارداری کا پورا بار، یا اس کا ایک حصہ، انھوں نے اٹھایا اور وہ اس فرض کو اس خوش اسلوبی اور آمادگی کے ساتھ اٹھاتے تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں سے مشورہ، دوا کا انتظام، پرہیز کی نگرانی، راتوں کو جاگ کر مریضوں کی دیکھ بھال یہ سب ان کے "پورٹ فولیو" میں شامل تھیں۔ انھیں اپنی زندگی میں صرف ایسے ہی مریضوں سے سابقہ نہیں پڑا جن کو جسمانی تکلیفیں تھیں بلکہ برسوں ان مریضوں کے علاج کا انتظام بھی کرنا پڑا جن کو شدید "اختلاج" یا ہسٹریا کی بیماری تھی یا دورے پڑتے تھے (یہ لفظ اس زمانے میں عورتوں کی بہت سی تکلیف دہ بیماریوں کے لئے استعمال ہوتا تھا) وہ ان کے ساتھ حسب ضرورت محبت کا، سختی کا، سمجھانے کا ڈانٹنے کا، سلوک کرتے

لیکن کیا مجال کہ کبھی اس کٹھن ذمہ داری کو انجام دینے میں انھوں نے بے صبری کا اظہار کیا ہو یا ان کی پیشانی پر الجھن کی شکن پڑی ہو۔ منو بین گاندھی نے گاندھی جی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "گاندھی میری ماں" یہ خطاب میرے چچا کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ جن کے بظاہر فولاد کے دل میں ریشم کی سی نرمی اور محبت تھی۔

خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انھوں نے کبھی بہت روپیہ نہیں کمایا۔ باوجود اس کے ہر ضرورت مند کے لئے ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ بعض عزیز ایسے تھے کہ ان کا اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا ان کے لئے انھوں نے ایک رقم مقرر کر دی تھی جو ہر ماہ چپ چاپ ان کے پاس پہنچ جاتی۔ میں جب کالج میں پڑھتا تھا اور میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا، تو بعض مرتبہ غیر معمولی خرچ آ پڑتے اور جب کبھی انھیں کسی ذریعہ سے معلوم ہو جاتا تو وہ رقم بغیر طلب کے میرے پاس پہنچ جاتی۔ لیکن ساتھ ہی انھیں اصرار تھا کہ نوجوان اپنی زندگی انھیں اصولوں پر ڈھالیں۔ جن کی صداقت پر انھیں پورا بھروسا تھا۔ یہ امداد کی شرط نہ تھی لیکن ان کی امید اور توقع تھی۔ ان اصولوں کی مخالفت یا ان سے روگردانی کو وہ آسانی سے گوارہ نہ کر پاتے تھے۔ ان میں اصلاح کا، وعظ و نصیحت کا، دوسروں کی زندگی کو اپنے پسندیدہ سانچے میں ڈھالنے کا پر خلوص جذبہ تھا۔ وہ اس "جدید" نظریئے کے زیادہ قائل نہ تھے کہ ہر شخص کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو سماج اور اس کے مطالبات، مذہب اور اس کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنی خودی کا اظہار کرے۔ حق حق ہے۔ باطل باطل ہے۔ ان میں مصالحہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے محبوب کی شان میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ :۔

محبوب من بہ شیوۂ ہر کس موافق است با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

ان کے عقیدے کے مطابق بزرگوں کا فرض تھا کہ وہ نئی نسل کی ہدایت اور ان کو خیر و شر میں تمیز کرنا سکھائیں۔ میرے پاس ان کے بعض خط ہیں جن میں انھوں نے مجھے اور دوسرے عزیزوں کو سختی سے، کفایت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی، کبھی مکان بنانے کا مشورہ دیا، کبھی انگریزی لباس نہ پہننے کی رائے دی۔ میرا خیال تھا کہ روپیہ عزیزوں، دوستوں، ضرورت مندوں اور بزرگوں پر خرچ کرنے کے لئے ہے۔ وہ بھی اس بات کو مانتے تھے۔ لیکن انھیں ساتھ ہی اصرار تھا کہ اگر کوئی آدمی مثلاً سو روپے کمائے تو بچا نوے روپے سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ بلکہ کسی طرح اپنی ضرورتوں کو روکے۔ ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں (اور بعض دوسرے عزیز بھی) اصول کو تسلیم کرتے لیکن عمل میں اس کو پوری طرح نہ برت سکتے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیوں کہ وہ خود باوجود قلیل آمدنی کے اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہتے تھے۔ بعض مرتبہ اس بارے میں ان کے اصولوں کی سختی نوجوانوں کو گراں گزرتی۔ کیوں کہ ان میں یہ کھلا ڈھکا جذبہ نہ تھا کہ ؎

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اب بعض دفعہ سوچتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواہ اس بارے میں ان کی طبیعت میں غلو رہا ہو۔ لیکن اس میں ایک بنیادی صداقت تھی۔ نوجوانوں کو بالکل آزاد، شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دینا بھی تقاضائے عقل کے خلاف ہے۔ اس کے جو نتائج ہم نے اس نسل میں آنکھوں سے دیکھے ہیں صرف اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں وہ کافی عبرتناک ہیں۔ آزادی ضروری ہے، مفید ہے، بیش قیمت ہے۔ لیکن اس کے بعض آداب ہیں، ان کی ایک قیمت ہے جو ادا کرنی ہوتی ہے۔ جو شخص آزادی چاہتا ہے، لیکن ان کے آداب کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس کی

قیمت کو ادا کرنے کو تیار نہیں، اس کی آزادی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔

قید کی حد میں ڈھالی ہم نے آزادی کی حد
یوں دیئے جھٹکے کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے

مدتوں تک بزرگوں نے نوجوانوں کو سخت شکنجے میں رکھا اور جب انھوں نے جائز طور پر، ایک حد تک اس کے خلاف احتجاج کیا تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے، ان سے معاملہ کرتے، تحکم کے ساتھ نہیں دوستی کے انداز میں، اپنی مدد اور تجربہ اور عقل کو ان کے سامنے پیش کرتے، انھوں نے احتجاج کے خلاف ہتھیار ڈال دیئے اور ان میں سے بہت سے اپنے فرض سے سُبک دوش ہو بیٹھے یعنی ؎

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

اور نوجوانوں نے یہ سمجھ لیا کہ حق تمام تر ان کی طرف ہے۔ وہ جو کریں گے وہی صحیح ہوگا۔ اس وجہ سے عقل اور تجربہ، جوش اور اظہار خودی کا پھل جو دو نسلوں کے بیچ میں مفاہمت کا پل بناتا ہے، قائم نہ ہو سکا۔

مذہب کی وہ سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ نماز پڑھتے، روزے رکھتے، آمدنی کا ایک کافی حصہ مستحقین پر خرچ کرتے۔ انھوں نے حج اور زیارات کے فرض کو بھی انجام دیا۔ لیکن ان شرعی ظواہر کی پابندی کے علاوہ وہ مذہب کی اصلی روح اس کے بنیادی تصورات اور اس کی اخلاقی تعلیم کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے اور انھیں انھوں نے اپنی زندگی میں بڑی مضبوطی کے ساتھ جگہ دی تھی۔ لیکن وہ کبھی مذہب کے محدود مولویانہ تصور کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ہر مدعی اجتہاد کو مجتہد نہ مانتے تھے۔ اس بات کے خلاف تھے کہ یہ حضرات عوام کی جہالت اور اندھی تقلید پر اپنی فضیلت کی عمارت بنائیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان لوگوں کو دینی اور

دینیوی دونوں قسم کی تعلیم دی جائے تاکہ ان میں روشن خیالی پیدا ہو اور وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں اور مذہب کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر سکیں۔ ایک دفعہ جوانی کے زمانے میں وہ شیعہ کانفرنس کے کسی اجلاس میں شریک ہوئے۔ جہاں حسب معمول بعض علماء نے ہر ترقی پسند تحریک اور تجویز کی مخالفت کی۔ سنا ہے کہ ان کی ہر تقریر کی تمہید یہ ہوتی تھی کہ "ہم علمائے کرام کا یہ خیال ہے"۔ جب میرے چچا اس "تمہید" کو سنتے سنتے عاجز آ گئے تو انھوں نے کھڑے ہو کر اپنی تقریر شروع کی۔

"آپ حضرات نے ان معاملات کے بارے میں علمائے کرام کی رائے تو سن لی اب میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ بتاؤں کہ اس بارے میں "ہم جہلائے کرام" کی کیا رائے ہے"۔

ایک ایسے مجمع میں جہاں تقریباً سب لوگ علماء کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اس قسم کی تقریر کرنا بڑی جرأت کی بات تھی۔ لیکن یہ جرأت ان کی سیرت کی ایک بنیادی صفت تھی۔ انھیں کوئی شخص خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی بڑا ہو، مرعوب نہ کر سکتا تھا۔

انھوں نے علی گڑھ میں نیک نامی کے ساتھ تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ عرصے تک ریاست خیرپور کے ولی عہد کے اتالیق کے فرائض انجام دیئے اور اس وقت بھی، باوجود ریاست کی ناسازگار فضا کے، اپنی خودداری اور دیانت داری پر آنچ نہ آنے دی۔ مگر ان کا رجحان ملازمت کی طرف نہ تھا۔ انھوں نے کاروبار کی طرف توجہ کی اور بہت سال تک وہ اپنا ایک کارخانہ چلاتے رہے جس سے کسی نہ کسی طرح گذارے کے قابل آمدنی ہو جاتی تھی۔ پھر حکیم اجمل خاں کی دعوت پر انھوں نے ہندوستانی دواخانہ دہلی کی منیجری کو قبول کیا۔ جب انھوں نے اس

ذمہ داری کو سنبھالا تو اس میں کئی ہزار روپے سال کا خسارہ ہوتا تھا۔ اور جب وہ چند سال بعد وہاں سے دستبردار ہوئے تو اس کی آمدنی تین لاکھ روپے سالانہ سے کچھ زیادہ تھی یہ ان کی خوش تدبیری، مردم شناسی، معاملہ فہمی اور نگرانی کا نتیجہ تھا۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ہر قسم کی بدعنوانیوں، بددیانتی اور غفلت کے بارے میں سخت گیر تھے۔ ان کا عملہ ان سے خوش تھا کہ وہ ان کے ہر جائز مطالبے کی تائید کرتے تھے اور ان کی ذاتی مشکلوں اور مسائل میں دلچسپی لیتے تھے.... اس کے کئی سال بعد حکیم صاحب کو اپنے یونانی آیورویدک طبیہ کالج دہلی کے لئے ایک سیکریٹری کی ضرورت ہوئی تو ان کی نگاہ انتخاب پھر انھیں پر پڑی اور انھوں نے اس عہدے کے فرائض کو بھی اس ایمانداری قابلیت اور تن دہی سے انجام دیا۔ وہ حکیم صاحب کے بہت قائل تھے اور ان کی خوبیوں کے معترف لیکن جب کسی معاملہ میں اختلاف ہوتا تو اس کے اظہار میں تامل نہ کرتے تھے۔

میں نے ان سے کیا کچھ نہیں سیکھا یا سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ انکی اخلاقی جرأت، ان کی ایمانداری، ان کی محنت، ان کی انسان دوستی، ان کی انصاف پسندی، ان کی ہمدردی اور ایثار، ان کی خدمت گذاری کا میرے دل پر بہت گہرا نقش ہے۔ اکثر جب نئے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو بعض دفعہ غیر شعوری طور پر ان میں یہ صفات تلاش کرتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ انسانی ہیکیا ایک ہی قسم کے رنگوں اور روغنوں سے تیار نہیں ہوتے۔ جانتا ہوں کہ دنیا ہر قسم کے افراد سے مل کر بنتی ہے، جانتا ہوں کہ ان میں بہت فرق ہوتے ہیں۔ لیکن دل یہ کہتا ہے کہ بعض قدریں بنیادی ہیں اور خالقِ کائنات سے پوچھتا ہے کہ تو نے ان کو اور زیادہ عام کیوں نہیں بنایا؟ یا یہ زیادہ عام کیوں نہیں ہوئیں؟ اور شاید اس زمانے میں جب یہ صفات بہت کم یاب ہو چلی ہیں، بلکہ بہت

سی ایسی قوتیں اور تحریکیں کار فرما ہیں جو سرے سے ان کی اہمیت سے انکاری ہیں، تو دبی زبان سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

صرف مٹی کے کھلونے بنانا تو قادرِ مطلق کے شایانِ شان نہیں۔

ان کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا جب میں ریاست کشمیر میں ناظم تعلیمات تھا۔ خواجہ سجاد حسین نے اس موقع پر ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے جو اپیل جاری کی تھی اس کے چند جملوں میں ان کی سیرت کا اچھا نقش نظر آتا ہے!

"خواجہ غلام السبطین عجیب و غریب خوبیوں کے انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنوں اور غیروں کا بھلا چاہا۔ کبھی کسی کے ساتھ برائی اور بدسلوکی نہیں کی۔ ہر شخص کے دلی خیر خواہ اور ہمدرد رہے۔ اپنوں اور پرایوں سے نہایت فیاضی اور رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ نام و نمود اور فخر و تعلی کا ان میں نشان بھی نہ تھا۔ سینکڑوں اشخاص کے ساتھ روپے سے سلوک کیا۔ لیکن کبھی زبان پر نہیں لائے۔ ہزاروں روپیہ لوگوں کو قرض دیا مگر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ بہت سے نیکی کے ایسے کام کرتے تھے جن کو بالکل خفیہ رکھتے تھے۔ اپنی رائے کے اظہار میں نہایت دلیری سے کام لیتے تھے۔ باوجود ملنسار، خوش خلق اور متواضع ہونے کے بڑے خوددار واقع ہوئے تھے اور عزتِ نفس کو قائم رکھنے کے لئے ہر وقت بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایمانداری، دیانت اور امانت ان کے خاص اوصاف تھے!"

اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اور ہوتے ہیں تو بالعموم ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی جاتی۔ ان کو دقیانوسی، پرانے زمانے کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ ہماری قدروں میں جو فرق پیدا ہو رہا ہے ان میں

سے بعض پر ایک ضروری تنقید ہے!

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میری اور میرے بھائی بہنوں کی ابتدائی تربیت کسی حد تک ایک زہد خشک کے ماحول میں ہوئی تھی جہاں اخلاقی قدروں پر زور تھا۔ لیکن اظہار خودی پر شعوری طور پر زور نہ تھا۔ ماحول کے اثر اور خاندانی مزاج کی وجہ سے زندگی میں فنونِ لطیفہ کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ میرے چچاؤں کو تو ادب اور شاعری کے سوا کلچر کے اس خاص خزانے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ والد کی دل چسپیوں کا حلقہ زیادہ وسیع اور کلچر کا مفہوم زیادہ ہمہ گیر تھا۔ لیکن ان کو اپنی علمی، قومی، اور ملّی مشغولیتوں میں اس کی فرصت نہ ملی کہ وہ خود اس کی طرف توجہ کر سکتے اور ان کی عمر اتنی کم ہوئی کہ وہ اپنی اولاد کو اس طرف توجہ نہ دلا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدت تک مجھے جمالیات اور فنونِ لطیفہ سے کوئی خاص دل چسپی نہ ہوئی۔ بعد میں اس کمی کو پورا کرنے کی قدرے ناکام کوشش کی لیکن یہ خانہ پوری طرح آباد نہ ہو سکا جس کا ہمیشہ افسوس رہا۔

علاوہ میرے عزیزوں اور بزرگوں کے، جن میں سے چند کا میں نے ذکر کیا، دوسرے لوگوں کی طرح میری تربیت میں میرے اسکولوں کا بھی خاصا حصہ تھا۔ یعنی پانی پت کے مڈل اسکول اور حالی مسلم ہائی اسکول۔ اس زمانے کے بہت سے واقعات کی نہ زیادہ اہمیت ہے کہ انھیں دوہرایا جائے نہ وہ سب میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دور اب بڑی حد تک ماضی بن گیا ہے اس لئے اس کی کچھ جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس زمانے کے مقابلے میں آج کل اچھے طلبہ کو وسیع مطالعہ کرنے، علمی قابلیت بڑھانے اور نیم نصابی اور غیر نصابی مشاغل میں حصہ لینے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

میرے اسکول کے زمانے میں زیادہ تر زور درسی اور نصابی تعلیم پر تھا۔ یا استاد اپنی سمجھ کے مطابق طلبہ کی سیرت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے براہِ راست وعظ و تلقین اور حسبِ ضرورت تادیب اور سزا کا طریقہ استعمال کرتے تھے۔ اس وقت استادوں کو یہ خیال آج سے بھی کم تھا کہ سیرت محض زبانی تعلیم کے ذریعے سنواری نہیں جا سکتی۔ بلکہ اس کے لئے استادوں اور والدین کی عملی مثال اور طلبہ کو ایسے مشاغل اور منصوبوں میں لگانے کی ضرورت ہے۔ جن میں وہ عملاً ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا سیکھیں۔ ان میں رواداری اور مفاہمت پیدا ہو اور قیادت و ضبطِ نفس کی صفات پرورش پائیں۔ میں یہاں غیر معمولی استادوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ وہ تو ہر ملک اور زمانے میں ہوتے ہیں اور بعض اوقات بغیر کسی پیشہ ورانہ تعلیم یا وسیع مطالعہ کے محض تجربے اور تائیدِ الٰہی کے ذریعے ان حقائق تک پہنچ جاتے ہیں جہاں علم و عقل کے راستے بہت مشکل سے رسائی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے شاعر نے کہا ہے ؎

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

لیکن استادوں کی اکثریت کے بارے میں غالباً میرا یہ اندازہ صحیح ہے کہ وہ طلبا کی نفسیات اور درسی مضامین کے اندرونی تقاضوں سے کم واقفیت رکھتے تھے (اور اب بھی کون بہت واقفیت رکھتے ہیں؟) مدرسے میں معمولی درسی مضمون پڑھائے جاتے تھے۔ جن میں آرٹ یا ڈرائنگ یا ہاتھ کے کام کو بار حاصل نہ تھا۔ (سخت پنسل سے کاغذ پر سیدھی یا گول لکیریں کھینچنے کو میں ڈرائنگ میں شمار نہیں کرتا) کلاسکی زبانوں میں سے صرف ایک لے سکتے تھے سنسکرت یا عربی یا فارسی۔ میں نے پانچویں جماعت تک فارسی پڑھی۔ لیکن چھٹی جماعت سے عربی

لے لی۔ فارسی سے بہت ہی جزوی واقفیت تھی جو بعد میں رفتہ رفتہ فارسی کی دلنشیں شاعری کے طفیل ذرا بہتر ہوگئی اور اس میں اپنے گھر کے ماحول اور عزیزوں کے اثر سے بھی بہت مدد ملی۔ عربی انٹرنس تک پڑھی اس لئے ابتدا میں اس سے زیادہ واقفیت تھی۔ اور قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس میں خاصا اضافہ ہوا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج میں عربی سے فارسی بہتر جانتا ہوں۔ ایک دفعہ (بہ عمر ۱۱ سال) یہ جرأت رندانہ کی کہ اپنے چچا خواجہ غلام الحسنین کو جب وہ حیدرآباد گئے ہوئے تھے عربی میں ایک خط لکھ ڈالا۔ کچھ جملے اور ترکیبیں درسی کتاب سے لیں۔ کچھ لفظ قرآن شریف سے چرائے، کچھ غلط سلط اپنے ذہن سے نکالے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور جب اگلے سال والد مرحوم کے انتقال پر ان کا "تعزیت نامہ" شائع کیا تو اس میں وہ خط بھی چھاپ دیا حالانکہ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ ایک گیارہ سالہ لڑکے نے لکھا تھا اور اس عمر میں بچے اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتے۔

کبھی کبھی اپنی زندگی پر بقول شخصے ایک "طائرانہ نگاہ" ڈالتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اکثر تھوڑے سے بہت کا کام لیا ہے۔ سائینس بھی میں نے پڑھی۔ مگر اُسے محض ایک نظری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے زبان کی درسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ لڑکے سائینس کی کتاب کو باوازِ بلند پڑھتے تھے۔ اگر کوئی مشکل لفظ آیا تو استاد نے اس کے معنی (صحیح یا غلط) سمجھا دیئے اور بس۔ میونسپل اسکول میں ہمارے ایک سائینس کے استاد تھے جن کو اس سے اتنی ہی واقفیت تھی، جیسے مثلاً مجھ کو چینی زبان سے ۔ ممکن ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں شریف اور بے ضرر شخص ہوں۔ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہوں، اپنی بیوی پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتے ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ

یہ صفات ایک سائنس ٹیچر کے لئے کافی نہیں۔ اس زمانے کی چھٹی جماعت کی سائنس کی کتاب اس جملے سے شروع ہوتی تھی "دنیا میں اتفاق کوئی چیز نہیں" میں اسکو پڑھ کر بہت چونکا۔ کیوں کہ میں نے ہمیشہ یہ سنا اور پڑھا تھا کہ اتفاق (اتحاد) ایک بہت اچھی اور ضروری چیز ہے۔ میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا "جناب اس جملے کا کیا مطلب ہے؟" ان کا کلاسک "جواب آج تک میرے حافظے پر نقش ہے۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ سبق کو حفظ کرلو۔ سائنس بہت اچھی چیز ہے۔ آگے چل کر سب کچھ سمجھ میں آجائے گا اور تمھارے لئے مفید ہوگا۔" اس معصوم استاد کو (اپنے شاگرد کی طرح) یہ معلوم نہ تھا کہ اتفاق کے دوسرے معنی کیا ہیں؟ جو سائنس اس شان کے ساتھ پڑھائی جائے اس کا زندگی میں کام آنا زیادہ قرین قیاس نہیں۔ جب میں حالی مسلم ہائی اسکول میں پہنچا تو وہاں انٹرنس کی جماعتوں کے لئے پریکٹیکل سائنس کے لئے کوئی انتظام نہ ہوسکا تھا کیوں کہ اسکول کے پاس ذرائع کی کمی تھی۔ جب انٹرنس کے امتحان کا وقت آیا تو میرے ایک شفیق اور قابل استاد میر خورشید حسن ...... (جو امرتسر کے رہنے والے تھے اور بعد میں صوبہ پنجاب میں ایک نیک نام انسپکٹر مدارس ہوئے) مجھے گرمیوں کی چھٹی میں اپنے ساتھ امرتسر لے گئے، اپنے گھر رکھا اور ایک مقامی اسکول میں انتظام کردیا۔ کہ سائنس پریکٹیکل کا کورس میں دو مہینوں میں مکمل کرلوں۔ آج کتنے استاد اپنے شاگردوں سے اس محبت اور خلوص کا سلوک کریں گے؟ میں نے بعد میں سائنس ایف۔ ایس سی۔ میں پڑھی جس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ زیادہ نہ پڑھنے کا افسوس رہا اور دوسری طرف کچھ اندازہ اس بات کا ہوگیا (اگرچہ اس میں کلاس روم کے پڑھانے کو کم دخل ہے اور ذاتی مطالعہ کو زیادہ) کہ سائنس میں کس قدر معنویت اور افادیت ہے اور ذہن کی آب وہوا بنانے میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہوسکتا ہے

آج کل جو بحثیں سائنس اور معاشرت کے باہمی تعلقات کے بارے میں ہوتی ہیں اس کے فائدوں اور خطروں کو ترازو میں تولا جاتا ہے، اس کی مخصوص قدروں اور زندگی کی عام قدروں کا جو بنیادی تعلق ہے ہیں ان میں (ایک حد تک سوچ سمجھ کر) دلچسپی لے سکتا ہوں۔

بہرحال جب انٹرنس کا امتحان ہوا تو میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی میں خاصی اونچی جگہ پائی اور یونیورسٹی کا وظیفہ ملا جس سے باوجود مالی ضرورت کے اس وجہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا کہ وہ صرف پنجاب یونیورسٹی کے کسی کالج میں مل سکتا تھا اس سے باہر نہیں۔ اور میری آرزو تھی کہ علی گڑھ میں پڑھوں۔ مگر نتیجہ نکلنے پر بجائے خوشی کے مجھے سخت افسوس ہوا کہ یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن کیوں نہیں ملی۔ گویا کسی نے قول ہارا تھا کہ تمھیں ہی ملے گی۔ جب خواجہ سجاد حسین کو اس سوگ کا علم ہوا تو انھوں نے بلا کر محبت کے ساتھ فہمائش کی۔ اور جہاں تک یاد پڑتا ہے کہا کہ "کیا تم چاہتے ہو کہ اپنی تعلیمی زندگی کو پہاڑ کی چوٹی سے شروع کرو اور رفتہ رفتہ ترقی معکوس کر کے نیچے اتر آؤ؟"

اسکول کی زندگی کا ایک واقعہ شاید قابل ذکر ہے۔ میں آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ اُس کے اگلے اجلاس کے موقع پر ہائی اسکولوں کے طلبہ کا ایک تقریری مقابلہ ہوگا جس میں حالی مسلم ہائی اسکول کے نمایندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے مجھے بچپن ہی سے تقریر کرنے کا کچھ مرض تھا۔ شاید خاندانی ماحول اور روایات کے اثر سے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ غلام الثقلین دونوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں کالج کے بہترین مقرر کا انعام "ہیرلڈ کوکس اینڈ کیمرج سپیکنگ پرائز"

جیتا تھا اور خواجہ غلام السبطین یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے (صدر پرنسپل ہوتا تھا) اسکول کی یونین اور دوسرے موقعوں پر میں حسب ضرورت تقریر کر لیتا تھا۔ ابتدا میں پوری تقریر لکھتا اور اس کو حفظ کرتا۔ بعد میں رفتہ رفتہ ایسی عادت ہوگئی کہ چند یادداشتیں سامنے رکھ کر اور کبھی کبھی بالکل برجستہ تقریر کر لیتا تھا۔ "برجستہ" کا مطلب بالکل بغیر غور کئے نہیں تھا، جیسا کہا جاتا ہے بعض شاعروں پر شعر نازل ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ تقریر کا ڈھانچہ ذہن ہی میں تیار کر لیتا تھا۔ بہر حال میرا شمار اسکول کے اچھے مقرروں میں ہوتا تھا جب اجلاس کا وقت آیا تو اسکول نے طے کیا کہ نمایندگی کے لئے مجھ کو بھیجا جائے گا۔ چنانچہ دھڑکتے دل اور امید و بیم کے چکر میں گرفتار وہاں پہنچا۔ پہلی دفعہ علی گڑھ کالج کو دیکھنے کا موقع ملا جس کو سر سید احمد خاں نے قائم کیا تھا اور جس کا ذکر اکثر سنا تھا۔ اس کی عمارتوں کو، طلبہ کو، دفتروں کو اس کی عالی شان مسجد وغیرہ کو دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں کہ ایسی تعلیم گاہیں بھی ہوتی ہیں خیر اگلے دن جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر۔ اور کانفرنس کی عمارت میں جو بیگم بھوپال کے نام پر "سلطان جہاں منزل" کہلاتی تھی، تقریروں کا مقابلہ شروع ہوا جس میں بیس پچیس طلبہ شریک تھے۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ قومی زندگی میں فضول خرچی کنجوسی سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اب پچاس برس گزر جانے کے بعد سوچتا ہوں تو اپنی تقریر میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر یاد نہیں پڑتی۔ لیکن شاید کچھ اندازہ اس زمانے میں بھی تھا کہ کسی خاص مجمع کو کیا چیز متاثر کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے تقریر کے لئے دو تین اشعار کو ذہن میں رکھا۔ اور قرآن شریف کی ایک آیۃ کو جو یہ تھی: ولا تجعل یدک مغلولۃً الیٰ عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً (ترجمہ) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) نہ بالکل کھول دو کہ سب کچھ دے ڈالو اور آخر تم کو ملامت زدہ حسرت ناک بیٹھنا پڑے

عمر کم تھی قدشائد عمر سے بھی چھوٹا تھا۔ تقریر کرتے وقت کچھ روانی پیدا ہوگئی۔ اور لہجہ میں کچھ خلوص کا شائبہ (یہ مرض آج تک باقی ہے) بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ ججوں نے پہلا انعام مجھ کو دیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے جو کانفرنس کے سیکریٹری تھے اور بعد میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، بغیر یہ سوچے کہ میں نروس ہوجاؤں گا اٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا۔ اس موقع پر میری ملاقات بہت سے مشاہیر سے ہوگئی۔ جو میرے والد اور خواجہ سجاد حسین کے جاننے والے تھے۔ وہ بہت محبت اور تپاک سے ملے اور میری بہت ہمت افزائی کی اور میں نے اپنے دل میں یہ طے کیا کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد علی گڑھ ہی میں کالج کی تعلیم حاصل کروں گا۔

چنانچہ جب میں نے انٹرنس پاس کر لیا تو میری آگے کی تعلیم کا مسئلہ پیش آیا سب کی رائے تھی کہ مجھے علی گڑھ جانا چاہیئے۔ مگر اس صورت میں پنجاب یونیورسٹی کا وظیفہ چھوڑنا پڑتا تھا جو مالی حالات کی وجہ سے مشکل تھا لیکن میری والدہ نے مضبوطی سے کہا کہ تم ضرور وہاں جاؤ، تمھارے والد زندہ ہوتے تو وہیں تعلیم دلاتے۔ تمھارے بزرگوں نے وہیں تعلیم پائی ہے، روپے کی فکر نہ کرو میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گی۔ چنانچہ اب کہ راہِ وفا کی منزلِ اوّل تمام ہو چکی تھی، یہ طے ہوا کہ پانی پت کی محدود اور جانی بوجھی دنیا کو چھوڑ کر جس میں کم و بیش "ہر شخص" سے (جو ایک محاوراتی مبالغہ ہے) واقفیت تھی، ایک اجنبی دنیا کی راہ لوں جو اس وقت پانی پت اور اس کے چھوٹے سے اسکول کے مقابلہ میں ایک بہت وسیع اور ہنگامہ پرور دنیا معلوم ہوتی تھی۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

بہت سالوں کو پھلانگ کر، میں خود سے پوچھتا ہوں کہ پانی پت اور اس کے

مروجہ کلچر نے مجھے کیا دیا؟ بہت کچھ دیا اور بعض محرومیاں اور کوتاہیاں بھی۔ اسکی دین میں تہذیب وتمدن کا وہ سرمایہ بھی شامل ہے جس میں باوجود اس کی مروجہ تنگیوں کے بعض اعلیٰ اقدار کا جلوہ تھا اور چند غیر معمولی انسانوں کا شرف صحبت بھی جس نے مجھ کو ایک اچھی زندگی کے راستے پر ڈالا۔ خواہ میں کبھی کبھی اس راستے سے بھٹک گیا ہوں لیکن پانی پت کی صبحِ زندگی کی روشنی اس پر ہمیشہ چمکتی رہی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اگر کہیں اور پیدا ہوتا تو یہ ہرگز میرے نصیب میں نہ آتی لیکن میں نے تو کہیں اور پیدا ہو کر اس کا تجربہ نہیں کیا۔ میں نے یہاں انسانی تعلقات کی گہرائی اور معنویت کو محسوس کیا، فرد اور سماج کے بنیادی رشتے کا کچھ احساس پیدا ہوا، حفظِ مراتب کی خوبی کو دیکھا، لوگوں کو عسرت اور تنگی کے باوجود، مفید بامعنی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے دیکھا، ایک دوسرے کا بوجھ خندہ پیشانی سے اٹھاتے دیکھا، جدید تہذیب کے اس تجربہ اور مشاہدے سے محفوظ رہا کہ زندگی میں اہم چیز محض روپیہ کمانا ہے اور اس کی خاطر بہت سی دوسری قدریں قربان کی جا سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ زندگی کا یہ تصور عام تھا اور عام تھا تو کس قدر، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذاتی تجربہ میں یہ عنصر زیادہ آیا اور دوسرا پہلو مقابلتاً کم جس میں مقابلہ، رشک، حسد، بے اصولی، حق تلفی کو مقام اعزاز حاصل ہے۔ شاید اس کا یہ اثر ہے کہ مجھ میں آج تک "بڑے لوگوں" کے نباہنے کے لئے جس صلاحیت اور اعتماد کی ضرورت ہے، وہ پوری طرح پیدا نہ ہو سکی، نظری طور پر اچھی طرح جانتا ہوں کہ دنیا میں زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہیں۔ یا زندگی کا تجربہ اور چکر انھیں ایسا بنا دیتا ہے۔ ان پر بھروسا نہ کرنا چاہئے۔ لیکن عملاً اپنی طبیعت سے مجبور، ہر شخص کو ابتدا میں قابل اعتبار سمجھتا ہوں جب تک وہ بہت شدت سے اس خوش فہمی کو توڑنے کی کوشش نہ کرے۔ اور پھر بھی دل کو

یہ تسلی دے لیتا ہوں کہ اعتماد اور عدم اعتماد دونوں میں خطرے ہیں لیکن عدم اعتماد کے خطرے بہت زیادہ ہیں۔ اعتماد میں کم سے کم اپنی طبیعت اور فطرت کا توازن اور صحت تو قائم رہتی ہے۔!

اس تمدن میں بعض خامیاں، تنگیاں اور محرومیاں بھی تھیں۔ پانی پت "شرفا" کی ایک زوال آمادہ بستی تھی جس میں پرانی روایاتی قدروں کی چھاپ ابھی تک باقی تھی اور نئی قدروں نے جنم نہ لیا تھا۔ ملک میں نئی نئی تحریکیں پیدا ہو رہی تھیں لیکن ان کی موجوں کا اثر وہاں کم پہنچتا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک ایسے خاندان میں جنم پایا جس نے ایک حد تک نئے اور پرانے کو سمو کر ان میں ایک ستدر توازن، ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو خود کو اس تصادم میں بے دست و پا محسوس کر رہے تھے اور وہ پرانی قدروں اور روایات سے (جن میں سے بعض بالکل خارج المیعاد ہو چکی تھیں) چمٹے ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ اس طوفان میں اپنی کشتی کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ تعلیم بہت کم پھیلی تھی، اعلیٰ تعلیم کی کوئی درس گاہ قصبہ کیا ضلع بھر میں نہ تھی۔ صفائی، حفظانِ صحت اور علاج معالجہ کا نہایت ہی ناقص انتظام تھا۔ ملیریا، چیچک، کالرا اور پلیگ عام تھے۔ اور باقاعدگی کے ساتھ ہر سال یا دو تین سال بعد ایک وبائی شکل میں آتے اور آبادیوں کا ستھراؤ کرتے ہوئے گذر جاتے۔ خیر یہ صورت تو سارے ملک میں تھی۔ لیکن ہمارے چھوٹے سے قصبے میں عام لوگوں کی جہالت اور علاج کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا ردِ عمل زیادہ ہوتا تھا۔ جو لوگ طاعون یا ہیضہ کا شکار ہوتے ان کا بچنا یا نہ بچنا محض تقدیر کا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر لوگ ان کو خدا یا بھگوان کا عذاب سمجھ کر برداشت کر لیتے تھے۔ جو شخص بچ جاتا وہ خدا کی مہربانی کا ثبوت

تھا جو نہ بچتا اور اکثریت انھیں کی تھی وہ خدا کی مشیت کا اظہار تھا۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ خیال انسان اور خدا دونوں کی شان میں گستاخی ہے۔ اس میں انسان کو بے بس اور خدا کو ایک مطلق العنان اور سنگ دل حاکم سمجھا جاتا ہے۔ انسان خود کچھ کر نہیں سکتا اور خدا گویا بغیر کسی خاص وجہ کے، محض اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لئے دباؤں کی لعنت بھیجتا رہتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ ایک حد تک اس عقیدے کی تردید ہے۔ اور اس زمانے میں سائینس نے علاج کے میدان میں جو غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنی جہالت اور نالائقی کی وجہ سے اپنی مصیبتوں کو برداشت کرتے رہے ہیں۔ جہالت اور نالائقی اور تقدیر پر بھروسا کرنے کی وجہ سے چیچک کا علاج اس وقت تک (اور اس کے بہت بعد تک) ٹونے ٹوٹکوں سے کیا جاتا تھا۔ ٹیکہ کا طریقہ سائینس کو مدت سے معلوم تھا۔ لیکن علاوہ اس کے کہ سائینس کی دریافتیں اس زمانے میں اس تیزی کے ساتھ دنیا میں نہ پھیلتی تھی جیسی اب، اکثر لوگوں میں اس قدر جہالت اور قدامت پرستی اور توہم نوازی تھی (خصوصاً گاؤں اور چھوٹے قصبوں میں) کہ وہ پرانا طریقہ چھوڑ کر نئے طریقوں کو اختیار کرنے میں بہت پس و پیش کرتے تھے۔ لاکھوں بچے اور بڑے اس مرض میں ختم ہو جاتے۔ اور جو کسی طرح لوٹ پوٹ کر بچ جاتے ان پر بھی یہ موذی مرض اپنی مکروہ چھاپ لگا دیتا اور ان کے چہروں کی شادابی اور رعنائی کو چھین لیتا۔ ملیریا ایک موسمی پھل تھا۔ ہر سال کروڑوں بندگان خدا کی صحت اور کارکردگی پر چھاپہ مارتا اور ملک کی پیداوار پر کاری ضرب لگاتا لیکن اس کی روک تھام کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھائے گئے پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ کے طور پر جب انفلوئنزا ہندوستان میں پہنچا تو لوگ اس کے سامنے اس طرح ڈھیر ہو جاتے تھے جیسے میدان جنگ میں نہتے شہریوں پر

برین گن سے گولیاں چلائی گئی ہوں، یا جلیاں والا باغ میں جنرل ڈائر نے خون کی ہولی کھیلی ہو۔ دوسرے ملکوں میں بھی ابتدا میں ایسی ہی حالت تھی۔ لیکن اس پر مقابلتہً جلد قابو پا لیا گیا۔ لیکن ہم لوگوں کی نظر میں روایتی طور پر وقت کی کوئی خاص قیمت نہیں۔ ہمارے پیچھے ازل ہے اور ہمارے سامنے ابد اس میں سالوں کی کیا صدیوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ رومان اولاں نے جو ایک مسلمہ ہندوستان دوست تھا۔ اپنی "ہندوستانی ڈائری" میں لکھا ہے کہ "ہندوستانیوں کو تو صدیاں گذرتے دیکھنے کی عادت ہے۔ زندگی کا دھارا تیزی کے ساتھ گذرتا رہتا ہے اور وہ اس کی کوئی خاص فکر نہیں کرتے" بحیثیت مجموعی رومان رولاں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ گذشتہ پچاس برس میں میڈیکل سائنس نے جو ترقی کی ہے اس کا کافی اثر ہمارے ملک میں بھی پڑا ہے خصوصاً آزادی کے بعد۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس عرصے میں جہاں ہم نے بہت سی پرانی بیماریوں پر قابو پا لیا ہے، وہاں بہت سی نئی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں یا بعض پرانی بیماریوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس میں جسمانی بیماریاں ہی نہیں بلکہ ذہنی بیماریاں اور ذہنی و جسمانی بیماریوں کی مرکب پیچیدہ شکلیں بھی شامل ہیں۔ یہ قیمت ہے جو تمدن کی غیر متوازن ترقی کی ہمیں ادا کرنی پڑی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ابھی مدت تک ادا کرنی ہوگی۔ آج کے ترقی یافتہ ملک بھی، جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی نے اپنے سب سے زیادہ حیرت ناک کارنامے دکھلائے ہیں، اپنے اجتماعی زندگی کے مطالبات میں، توازن قائم نہیں رکھ سکے۔ مجھے یہ امید نہیں بندھتی، حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے، کہ ہم ان کے مقابلے میں زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیں گے خواہ ہم اپنی تہذیبی قدروں

کا کتنی ہی بلند آہنگی سے دعویٰ اور اعلان کریں۔ لیکن جو کچھ ترقی اب تک ہوئی اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کا ذکر آیا تو (وقت کی حدوں کو توڑ کر) اتنا کہہ دوں کہ میں نے اپنے بچپن میں پانی پت میں اس کا زیادہ اثر محسوس نہیں کیا۔ اخبار میں کبھی کبھی اس کا ذکر پڑھنے میں آتا تھا۔ لوگوں میں اس کے متعلق باخبر اور ناواقف گفتگو ہوتی تو وہ بھی کان میں پڑتی۔ لیکن اس کی حقیقی اہمیت کا کچھ اندازہ کئی سال بعد کالج پہنچ کر ہوا۔ البتہ اتنا اندازہ ہو گیا تھا، لوگوں کی زبانی عام شکایت سن کر، کہ ہر چیز کی قیمت بے حد بڑھ گئی ہے، گوشت دال ترکاری اور روزمرہ کی معمولی چیزیں اس قدر مہنگی ہو گئی ہیں کہ غریب کیا متوسط طبقے کے لوگوں کے لئے بھی زندگی دشوار تر ہو گئی ہے۔ لیکن اب کہ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کی "ٹھنڈی جنگ" اور مسلح امن کی خارزار منزلوں سے گذر چکا ہوں۔ اور آج کل کی اقتصادی حالت کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کبھی چیزیں ایسی سستی ملتی ہوں گی۔ جیسے ۱۹۱۹ء میں یا ۱۹۲۰ء میں.... میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو ایک اوسط حیثیت کے طالب علم کو چالیس روپے ماہوار کے درمیان خرچ کرنا پڑتا تھا۔ جس میں فیس، رہائش کھانا سب شامل تھے۔ آج یہ حال ہے کہ اگر ایک طالب علم تنگی ترشی کے ساتھ کھانے، ناشتے پر ستّر پچھتر روپے ماہوار صرف کر کے گذارہ کر لیتا ہے تو لوگ تعجب کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ معیار زندگی بہت اونچا ہو گیا ہے بلکہ دراصل روپیہ کی قیمت اشیاء کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ گذشتہ پچیس سال سے ہم اپنی زندگی ایک روز افزوں افراطِ زر کے چکر میں بسر کر رہے ہیں۔ حالانکہ قیمتوں کے بڑھنے کا سلسلہ تو اس سے کہیں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ غالب کے زمانے کے بارے میں تو اب سبھی

کو غالب صدی کے طفیل یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان کی حیثیت کے لوگ تین اور پانچ روپے ماہوار کے کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کی ایک نامکمل سی یادداشت مجھے ان کے کاغذات میں ملی تھی جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں، یعنی کوئی ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ، علی گڑھ کالج میں کھانے کی تین شرحیں تھیں۔ فرسٹ کلاس کھانا بارہ روپے ماہوار، سیکنڈ کلاس کھانا آٹھ روپے ماہوار، اور تھرڈ کلاس کھانا پانچ روپے ماہوار۔ یعنی اب جو روپیہ، روپیہ کہلاتا ہے وہ دراصل اسّی سال پہلے کے ایک آنے کے برابر رہ گیا ہے۔ اور جو شخص سات سو روپیہ ماہوار پاتا ہے دراصل سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کماتا۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے عوامی ادب میں ایسی کہانیاں پائی جاتی ہیں کہ ایک سست اور نکھٹو شوہر اپنی کفایت شعار اور سلیقہ مند بیوی کو چھوڑ کر کہیں پردیس چلا گیا اور وہاں کئی سال گذار دیئے۔ اس وقت بیوی کے پاس چند کوڑیاں تھیں، لیکن اس نے انھیں کو اس طرح کام میں لگایا اور رفتہ رفتہ کام کو بڑھایا کہ وہ خوش حال ہو گئی اور اپنا ذاتی گھر بنوالیا جب میاں واپس آئے، اسی طرح جوتیاں چٹخاتے ہوئے تو اوّل تو انھیں مکان کی تلاش میں دقت ہوئی اور پھر دربان نے جو دروازے پر تعینات ہو گیا تھا پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہانی تو شاید فرضی ہے۔ لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں روپیہ کی قیمت آج سے کتنی زیادہ تھی اور اس سے کس قدر زیادہ چیزیں خریدی جا سکتی تھیں۔

پانی پت کی سوسائٹی عورتوں کے لئے خاص کر ہمت شکن تھی۔ اور انھیں بالعموم اظہار خودی کے موقعے کم ملتے تھے۔ میں نے اپنی والدہ کا جو ذکر کیا، یا آیندہ چل کر اور بعض خواتین کا ذکر آئے گا ان سے محض یہ

ثابت ہوتا ہے کہ جوہر قابل بعض دفعہ اپنے ماحول کی بندشوں کو توڑ کر بھی ان سے اونچا اٹھ سکتا ہے۔ لیکن بالعموم ان کی قدرتی صلاحیتیں افسردہ ہو کر رہ جاتی تھیں۔ یہ بات متوسط طبقے میں اور خاص کر مسلمان عورتوں میں جو سخت پردے میں رہتی تھیں زیادہ عام تھی۔ وہ زیادہ وقت اپنے گھر میں گزارتیں (جہاں ان کو اس وقت بھی کافی اختیارات حاصل تھے) گھر کا کام کاج کرتیں ورزش کا دستور ہی نہ تھا۔ بیرونی دلچسپیاں بہت کم تھیں۔ گویا ان کی زندگی کے گرد ایک تنگ اور سخت حصار کھنچا ہوا تھا جس سے وہ باہر نہ نکل سکتی تھیں۔ نہ شاید نکلنا چاہتی تھیں کیوں کہ ان کے خیالات کو روایات اور دستور کے اثر نے ڈھالا تھا۔ اس وجہ سے ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ اور چونکہ، جیسا میں نے بیان کیا، علاج کی سہولتیں کم تھیں اور حکیم و ڈاکٹر زیادہ تر نیم حکیم اور نیم ڈاکٹر ہوتے تھے۔ اس لئے اکثر بیماری گھن کی طرح اندر ہی اندر ان کی قوت اور چہرے کی شگفتگی کو کھا جاتی۔ بہت سی عورتوں کو "اختلاج" کے دورے پڑتے جن کو ان کے عزیز بلکہ معالج بھی یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے کہ یہ کوئی بیماری نہیں، محض اپنی طرف متوجہ کرنے کا بہانہ یا اپنی ناراضگی اور محرومی کا اظہار ہے۔ شاید یہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہے۔ لیکن بیماری خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی، اپنی لائی ہوئی یا آسمان سے آئی ہوئی ہو پھر بھی بیماری ہے۔ اور مریض کے لئے اتنی ہی تکلیف دہ ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ان سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے جو اس قسم کی شکایتوں کو پیدا کرتے ہیں۔ آج بھی جب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں، عورتیں زندگی کے کاموں میں زیادہ حصہ لینے لگی ہیں، ان پر سے پرانی پابندیاں بڑی

حد تک دور ہوگئی ہیں (بعض اوقات ضرورت سے زیادہ) اور بعض ملکوں میں تو وہ ہر لحاظ سے اتنی ہی آزاد ہیں جیسے مرد، ان کو نت نئی ذہنی، جسمانی تکلیفوں اور بیماریوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جس کے اسباب بہت پیچیدہ ہیں ان اسباب کو دور کرنا اور ان کی زندگی کو اس تاریک بھول بھلیاں سے نکالنا (خواہ وہ بادی النظر میں کتنی ہی روشن معلوم ہو) خاندان اور سوسائٹی کا فرض ہے۔

بازگو از نجد و از یارانِ نجد

جانا تو طے ہو گیا۔ لیکن دل میں ایک خلش تھی۔ علی گڑھ جا کر کیا گزرے گی اور کیسے گزرے گی؟ تعلیمی اعتبار سے تو میں غالباً اس کا بوجھ اٹھا لوں گا۔ لیکن وہاں کے بہت سے طلبہ زیادہ فیشن ایبل زیادہ متمدن ہیں۔ بڑے بڑے شہروں سے آتے ہیں۔ مالدار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا رہن سہن ہمارے ہاں سے بہت مختلف ہے۔ ان کے ساتھ کیسے نبھے گی؟ یہ نہیں کہ میں کسی خاص احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ لیکن بچپن اور نوجوانی میں خاصا کم آمیز تھا اور پانی پت کے چھوٹے سے ماحول میں رہنے کی وجہ سے، باوجود چند بڑے شہروں میں قیام کے مختصر سے تجربے کے، ابھی تک سوشل میل جول میں وہ خود اعتمادی اور بے تکلفی پیدا نہ ہوئی تھی جس کی میرے خیال میں علی گڑھ میں ضرورت ہوگی۔ دوسری طرف یہ ڈھارس بھی تھی کہ میرے خاندان کو کئی پشت سے علی گڑھ سے تعلق رہا ہے وہ کام آئے گا اور میں زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کروں گا۔

جب ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا خطبۂ صدارت دینے (اور اسکے "معاوضے" میں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری لینے)...... مجھے مدعو کیا گیا تو میں نے اپنے خطبہ کی تمہید میں یہ الفاظ کہے تھے جو میرے اس وقت کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

"میری مادر تعلیمی نے آج جو اعزاز مجھے بخشا ہے اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے گو میں جانتا ہوں کہ یہ پیش کش احباب کی بے لاگ پرکھ سے زیادہ ان کی محبت اور فیاضی کا ثبوت ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے موقع پر کوئی شخص بھی جو میری پوزیشن میں ہو اس کے دماغ پر قدرتاً بے شمار یادوں کا ہجوم ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کریں گے۔ اگر میں زیادہ تر صیغہ واحد متکلم میں گفتگو کروں۔ اس انداز گفتگو سے انانیت کا اظہار مقصود نہیں جس سے خدا کا شکر ہے میں عمر بھر محفوظ رہا ہوں، بلکہ ایک تو ان گہرے احسانوں کا شکریہ ادا کرنا منظور ہے جو اس درس گاہ نے مجھ پر کئے ہیں۔ دوسرے میں اپنے نوجوان دوستوں کو بے تکلفی کے ساتھ اپنے تجربوں اور خیالات میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ اس عظیم درس گاہ سے میرا تعلق چار نسل سے ہے۔ جب مولانا حالیؔ نے یہ طے کیا کہ سر سید علیہ الرحمتہ کے کام میں شریک ہو جائیں اور جو پیغام وہ قوم کو اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دینا چاہتے ہیں اس کی شاعرانہ زبان بن جائیں۔ حالیؔ کے فرزند خواجہ سجاد حسین اس درس گاہ کے پہلے گریجویٹ تھے اور پہلے کرکٹ کپتان اور یونین کے پہلے نائب صدر۔ اور میرے والد اور چچا دونوں اپنے اپنے وقت میں اس کے نامور طالب علم رہ چکے ہیں۔ مجھے اب تک بخوبی یاد ہے کہ چالیس سال ہوئے میں برسات کی ایک گرم اور حبس آلود شام کو علی گڑھ پہنچا تھا۔ اس وقت ذہن کی ایک عجیب کیفیت تھی۔ جس میں امید و بیم اور ایک نئے ذہنی معرکہ کی ابتدا کا احساس ملا جلا تھا اور یہ خیال کہ زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے۔ میرے دل میں بلکہ ہونٹوں پر یہ دعا تھی کہ میں اس درس گاہ کے اس تصور کا اہل ثابت ہوں۔ جو بچپن سے میرے دل میں جاگزیں تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ دعا پوری ہوئی یا نہیں۔ اور بہرحال اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں۔ اگر ہے تو دوسروں کا ہے۔

لیکن اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ زندگی میں جو کچھ تھوڑا بہت برا بھلا کام کیا ہے۔ اس میں یہ خواہش ہمیشہ مضمر رہی ہے۔

میں جب اس گذری ہوئی مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو خود سے سوال کرتا ہوں کہ علی گڑھ نے مجھے کیا دیا۔ حافظے کے خزانے سے نکل کر تجربوں، یادوں، خیالوں اور رنگ رنگ کے نقوش کا ایک جلوس میری نظر کے سامنے سے گزرجاتا ہے جن کے خدوخال کو وقت کے ہاتھوں نے نرم کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی ان میں خلشِ لطیف کا ایک ہلکا سا رنگ بھی بھر دیا ہے۔ یہاں نوجوانی کے آغاز میں اپنے استادوں کے قدموں میں بیٹھ کر، میں نے اس دنیائے آب وگل، کو جو انسانوں کی دنیا بھی ہے، دیکھا اور تجسس، حیرت اور کبھی کبھی سمجھ داری کے ساتھ فکر اور دنیا کی سیر کی۔ ان استادوں میں اعلیٰ درجہ کے روشن فکر لوگ بھی تھے، اوسط قابلیت کے لوگ بھی اور ایسے لوگ بھی جو محض وقت گذاری کرتے تھے اور روٹی کھاتے تھے (جن کے بارے میں تو نہیں، لیکن جن کی ذہنی کیفیت کے متعلق اقبال نے کہا ہے: بہشتے فی سبیل اللہ ہم است)۔ اس ماحول میں میں نے زبانیں سیکھیں، میں لفظوں کے جادو سے متاثر ہوا، مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے لکھنے اور تقریر کرنے کا فن سیکھا۔ کچھ ادب پڑھا، کچھ تاریخ، کچھ فلسفہ، کچھ معاشیات، اقتصادیات اور سیاست۔ کچھ سائنس بھی، مگر بس اتنی کہ زندگی کے نقشے میں اس کے مقام کو سمجھ سکوں، اور زیادہ واقفیت نہ ہونے کا افسوس کر سکوں۔

لیکن مسافر کی جھولی میں علی گڑھ نے محض درسی مضامین کا علم ہی نہیں ڈالا بلکہ اور بھی بہت سے بیش قیمت تحفے دیئے۔ ذہنی تلاش کی مسرت، ہم خیال دوستوں کی رفاقت کی دولت جس میں زبان اور مذہب وملت کی کوئی قید نہ تھی۔

کتابوں کی... محبت اور فکر کی دنیا میں داخلہ کے لئے پروانہ راہ داری۔ انھیں اثرات اور تعلقات کے تانے بانے سے رفتہ رفتہ ان قدروں، آدرشوں اور ذہنی اور جذباتی رجحانوں نے جنم لیا جن کے ساتھ انسان کم از کم زبانی وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور کبھی دماغی اور اخلاقی دیانت کے لمحوں میں ان پر عمل بھی کرتا ہے۔ بعد کی زندگی میں بہت سی تحریصوں سے سابقہ پڑا۔ بہت سے خیالی طلسم ٹوٹ گئے اور مختلف قسم کے دباؤ پڑے، جنھوں نے زندگی کا راستہ بدلنے کی کوشش کی۔ (اور بالعموم ناکام کوشش کی) لیکن خیال ہوتا ہے کہ "اچھی زندگی" کی تلاش کا جذبہ، جو اس زمانے میں بیدار ہوا تھا، وہ کبھی پوری طرح ضائع نہیں ہوا۔

لیکن بس اتنا ہی نہیں ہوا۔ علی گڑھ نے صرف علم اور قدروں کی دنیا ہی سے روشناس نہیں کیا بلکہ بہت سے ایسے لوگوں سے ملنے کا موقع دیا جن کی شخصیت میں میں نے علم اور عقل کا جیتا جاگتا جلوہ دیکھا اور اعلیٰ قدروں کو ایک زندہ حقیقت کے روپ میں ڈھلتے۔ پہلی مرتبہ گاندھی جی کو اپنی ٹوٹی پھوٹی اور محبوب ہندوستانی زبان میں قوم کو خودداری اور آزادی کا پیغام دیتے سنا۔ مولانا آزاد کو یونیورسٹی کی مسجد میں رات کے آٹھ بجے سے شاید ایک بجے رات تک اپنی فصیح و بلیغ اور پر اثر تقریر میں اس سبق کو پیش کرتے ہوئے سنا جو دنیا کا سب سے زیادہ پرانا سب سے زیادہ نیا سبق ہے:۔

تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

(نیکی اور پرہیزگاری میں ہر کسی کا ساتھ دو اور گناہ اور زیادتی میں کسی کا ساتھ نہ دو)

یہیں میں نے ۱۹۲۵ء کے یادگار مباحثہ میں حصہ لیا۔ جب یونیورسٹی

کے طلبہ نے بہت بڑی اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں سب جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک مشترک قومیت کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ یہاں مجھے سر سید راس مسعود کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور میں نے ان کے شریف دل میں جو روشن انسانیت جلوہ گر تھی اس کو عمل میں دیکھا۔ یہیں میری ملاقات سب سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوئی جو اس وقت اپنی شخصیت اور ذہن کو ایک حسین شاہکار میں ڈھال رہے تھے۔ اور (بالکل مختلف قسم کی مثالیں خیال میں آتی ہیں) مولوی طفیل احمد کو دیکھا جو اپنے خالص سونے کے دل اور فولاد کی سیرت کو ایک سیدھی سادی صورت میں چھپائے سماجی اور قومی خدمت کی دھن میں لگے رہتے تھے اور سید سجاد حیدر سے شرف ملاقات حاصل ہوا جو ہر طرف اپنی شخصیت کی گرمی اور گدازی کی دولت بکھیرتے تھے اور نوجوانوں میں ادبی ذوق اور جوش جگاتے تھے۔ یہاں میں نے علامہ اقبال کو اپنے معرکتہ الآرا لکچر دیتے سُنا جن کا عنوان تھا "اسلام کے مذہبی فکر کی تعمیر جدید" اور ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اس جگہ مجھے پہلی دفعہ مسز سروجنی نائیڈو کا دیدار نصیب ہوا جن کی دل کشی اور انسانیت سے متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکن تھا۔ اور میں نے بیگم بھوپال کو دیکھا جو نہ صرف اس یونیورسٹی کی پہلی چانسلر تھیں بلکہ شاید تعلیمی دنیا کی تاریخ میں پہلی عورت تھیں جو کسی یونیورسٹی کی چانسلر ہوئیں۔ میں نے اس وقت صرف چند شخصیتوں کا ذکر کیا جو خود بخود زبان قلم پر آگئیں اور جن کا میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا اور میرے خیال میں ہر شخص کا فرض ہے جسے "عظمت کو چھونے" کی خوش نصیبی حاصل ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اس میں شریک کرے (بالواسطہ یا بلا واسطہ) ان کے علاوہ اور بہت سے مشاہیر تھے۔ جو یہاں آتے رہتے تھے۔ سیاسی لیڈر، ارباب فکر، اراکین حکومت (جو بالعموم یہ

نہ بھول پاتے تھے کہ وہ بڑے آدمی ہیں) ہندوستانی اور بدیشی، کبھی کبھی عورتیں بھی جو زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز تھیں۔ ان میں سے بعض نے میرے دل اور دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے اور انھیں کی وجہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ باوجود ان شبہات کے، جن کا اظہار "متشککین" اور "منکرین" کرتے رہتے ہیں۔ زندگی میں بڑی معنویت ہے اور وہ انجانے امکانات سے بھری ہوئی ہے۔

جب میں اپنے زمانے کے ان مشاہیر کا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا خیال کرتا ہوں، کسی خاص فن کے ماہروں کا نہیں (بلکہ فن زندگی کے ماہروں کا) ان اشخاص کا جو ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے بہت بلند پایہ تھے ٹیگور اور آربندو، گاندھی اور ابوالکلام آزاد، سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو، محمد علی اور محمود الحسن، انصاری اور اجمل خاں، جواہر لال اور راجندر پرشاد، رادھا کرشنن اور بدرالدین طیب جی، غلام الثقلین اور دیوکانند، تو میرے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں ہیں ان کے جانشین جو ان کا مقام اب یا آگے چل کر لے سکتے ہیں؟ اور گونج کی افسردہ آواز جواب دیتی ہے ۔۔ "کہاں ہیں وہ لوگ؟"

لیکن یہ تو میں چالیس سال آگے نکل گیا۔ ابھی تو میں نے علی گڑھ کے دروازے پر قدم ہی رکھا ہے لیکن میں اپنی زندگی کے واقعات کا کوئی مرتب نقشہ تاریخ وار پیش کرنا نہیں چاہتا۔ نہ وہ اس قابل ہیں، نہ شاید یہ طریقہ ہی ہر حال میں موزوں ہو سکتا ہے۔ یادوں کے آئینہ میں وقت، ماضی، حال اور مستقبل کی دیواروں کو توڑتا ہوا ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ اور کبھی حال سے مستقبل پر روشنی پڑتی ہے اور کبھی ماضی، حال اور مستقبل کی روشنی سے منور ہوتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ اس دیار حبیب کا خاکہ کس طرح آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ تجربہ تو ایک انفرادی چیز ہے اور جو لوگ ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں

اور ایک ہی قسم کی چیزوں کو دیکھتے اور برتتے ہیں۔ وہ بھی بالکل یکساں تاثرات حاصل نہیں کرتے، ایک ہی قسم کے خیالات کو دامنِ فکر سے نہیں بھرپاتے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کی کوئی مثالی تصویر پیش کروں جس کا حقیقت سے سرسری تعلق ہو، جیسے بعض اناڑی فوٹوگرافر یا مصوّر، تصویر کے خدوخال کی تمام شکنوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں کہ اصل چہرہ پہچانا ہی نہیں جاتا۔

میری طالب علمی کا زمانہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ختم اور مسلم یونیورسٹی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں انٹرنس کے امتحان میں شامل ہونے کے لئے شاید ۱۳ سال کی شرط تھی لیکن الہ آباد یونیورسٹی میں جس سے علی گڑھ کالج کا الحاق تھا، ایف اے کے امتحان میں سولہواں سال مکمل کئے بغیر نہیں شریک ہو سکتے تھے۔ میں اس قاعدے سے بے خبر تھا۔ لیکن جب ۱۹۲۱ء میں امتحان میں شریک ہونے کا موقع آیا تو پتہ چلا کہ میں امتحان میں نہیں بیٹھ سکتا۔ قاعدے تو حکومت یا یونیورسٹی یا دوسرے تعلیمی اداروں کے خداوندوں کے بنائے ہوتے ہیں۔ ان میں تبدیلی کا کیا امکان ہے۔ وہ تو گویا "سنت اللہ" ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن حسنِ اتفاق سے اسی سال مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہو گیا۔ اور یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ ایف۔ اے۔ کا پہلا امتحان اسی سال ہوگا اور مجھے اس میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔ طلبہ زیادہ نہ تھے، مقابلہ کم تھا اور غالباً اسی وجہ سے مجھے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن ملی۔ جب سالہا سال بعد میری لڑکیوں زہرا اور بلقیس نے بمبئی یونیورسٹی کے بی۔ اے۔ آنرز میں ایک ہی سال فرسٹ ڈویژن اور پہلی اور دوسری پوزیشن پائی تو میں نے انھیں ستانے کی خاطر لکھا کہ یہ کوئی بڑے فخر کی بات نہیں کیونکہ ہر سال ہندوستان کی مختلف

یونیورسٹیوں اور امتحانوں میں سینکڑوں، اور دنیا میں لاکھوں، بیوقوفوں کو یہ پوزیشن ملتی ہے۔

میری تعلیمی زندگی عام معیار کے مطابق خاصی کامیاب رہی۔ ایف۔ اے۔ اور بی۔ اے۔ کے زمانے میں یونیورسٹی کے بہترین طالب علم کو جونیئر اسکالرشپ اور سینئر اسکالرشپ کا اعزاز ملتا تھا۔ یہ دونوں اعزاز ایک دوسرے کے بعد مجھے ملے۔ علاوہ اس کے طلبہ کے ماہوار رسالے علی گڑھ میگزین کی (جس کے لئے اس وقت تک کسی کو بہتر نام نہ سوجھا تھا) ادارت کے فرائض بھی میرے سپرد ہوئے۔ اور اس کی بدولت لکھنے کی کچھ مشق اور یونیورسٹی میں جو اچھے لکھنے والے طلبہ تھے ان سے واقفیت اور رسم و راہ پیدا ہو گئی۔ اس زمانے میں قابلیت جتانے کے لئے (ممکن ہے خود پر جتانے کے لئے) بڑے بڑے لفظوں کو استعمال کرنے کا شوق غالب تھا خواہ ان کے معنی بھی پوری طرح معلوم نہ ہوں۔ اس بری عادت کو چھوڑنے میں خاصا عرصہ لگا اور برٹرنڈ رسل کا یہ قول تو مدتوں بعد کہیں پڑھا کہ ایک اچھے لکھنے والے کی پہچان یہ ہے کہ جہاں آسان لفظ سے کام چل سکتا ہے وہ کبھی اس کی جگہ مشکل لفظ استعمال نہیں کرتا۔ لیکن شاید اس منزل سے زیادہ تر لکھنے والوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ تقریر کا شوق فضول جیسا میں نے ذکر کیا پہلے ہی سے تھا اور وہ برابر جاری رہا۔ رفتہ رفتہ میرا شمار اچھے بولنے والوں میں ہونے لگا۔ اس زمانے میں ایف۔ اے۔ کے طلبہ کے لئے جونیئر ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی جس کی طلبہ کی نظر میں کافی وقعت تھی۔ اور اس کے جلسے یونین کے جلسوں کی طرح باقاعدہ ہفتہ وار ہوا کرتے تھے تقریریں اردو میں بھی ہوتیں اور انگریزی میں بھی۔ لیکن انگریزی میں اچھا مقرر ہونا زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس سوسائٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ جب میں سکنڈ ایئر میں تھا اور بعد میں اس سوسائٹی کے خاص انعام کا جو جونیئر سپیکنگ پرائز کہلاتا تھا قرعہ فال

بھی میرے نام پڑا۔ جب میں فورتھ ایر میں آیا تو علی گڑھ کا سب سے قابلِ قدر تقریری انعام جس کا نام "ہیرلڈ کوکس اور کیمبرج سپیکنگ پرائز" ہے۔ اور جو مدتوں پہلے میرے والد اور نانا کو مل چکا تھا، مجھے ملا۔ میرے لئے ذاتی طور پر یہ بات بہت قابلِ فخر تھی کہ ایک ہی اعزازی بورڈ پر میرا اور ان کا نام درج ہو۔

یونیورسٹی یونین کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی۔ اس کو ابتدا سے کیمبرج اور آکسفورڈ یونین کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ زیادہ تر اسٹاف کے سینیر ممبر انگریز تھے جو انھیں یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے تھے۔ یوں تو ان میں بعض بہت اچھے پروفیسر بھی تھے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کو برطانوی مملکت کے دوسرے سیاسی معماروں کی طرح یہ فکر تھی کہ اپنے شانوں پر "گوری قوم کا بوجھ" اٹھائیں اور ان کی رائے میں تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جو پچھڑے ہوئے لوگ تھے ان کی اصلاح کریں۔ اس زمانے میں یونین کے مقررین کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی تھی کہ لب و لہجہ میں انگریز مقررین کی اچھی یا بھونڈی نقل کریں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ صوری خوبیوں پر توجہ کرنے کی کوشش میں نفسِ مضمون کو بھول جاتے۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ میرے ایک ہم عصر اور عزیز دوست تھے جو طالب علم کی حیثیت سے بہت قابل تھے۔ ان کو ہم نے بڑی کوشش سے آمادہ کیا کہ وہ یونین میں تقریر کریں۔ یہ جلسے بالعموم مغرب کے بعد جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک رات کو "لائے اس بُت کو التجا کر کے" اور وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ پہلا جملہ ان کا یہ تھا:-

MR CHAIRMAN, SIR THIS PROPOSITION GIVES-ME

FURIOUSLY TO THINK ......

THINK کا تلفظ انھوں نے آکسفورڈ کے انداز میں بڑے بانکپن کے ساتھ "ثِنک" کیا جو صحیح تھا لیکن حاضرین جن کو اس کی عادت نہ تھی اسے سن کر ذرا محظوظ ہوئے اور اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ خود ذرا حیران۔ انھوں نے دوبارہ ہمت کی اور پھر اسی مصرعہ کو دُہرایا، اور قافیہ میں وہی "ثِنک"! اب حاضرین اور زیادہ محظوظ ہوئے اور دبے دبے قہقہے سنائی دینے لگے۔ ان کی بدحواسی بڑھی۔ انھوں نے تیسری بار پھر اسی مصرعہ کو دُہرایا۔ لیکن اس وقت تک مجلسِ مباحثہ زعفران زار بن چکی تھی اور حاضرین آواز میں ملا کر اس مصرعہ کو ان کے انداز میں "گا رہے" تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پلیٹ فارم چھوڑ کر چلے آئے۔ اور اس کے بعد باوجود اعلیٰ علمی صلاحیت، زبان پر غیر معمولی قدرت ہونے کے اپنی طالب علمی کے پورے زمانے میں انھوں نے یونین میں کوئی تقریر نہیں کی بس "ثِنک" ہی کرتے رہے۔ اور شاید اس کی بدولت بعد میں ایک بہت فاضل پروفیسر بنے...... یونین کے ان جلسوں میں نہ صرف طلبہ شریک ہوتے بلکہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے مشاہیر بھی کبھی کبھی ان میں آتے اور بحث مباحثہ میں حصہ لیتے یا ان کے لیے خاص جلسے کیے جاتے۔ جہاں ان کو یونین کا اعزازی ممبر بنایا جاتا اور وہ طلبہ سے خطاب کرتے۔ یہ جلسے ہمیشہ بہت اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ جیسے اب ہمارے ملک میں دوسرے ملکوں کے صدر اور بادشاہوں اور پرائم منسٹروں وغیرہ کے استقبال کے لئے ایک خاص "پروٹوکول" پروگرام بن گیا ہے۔ اسی طرح طلبہ نے ان جلسوں کے لئے ایک خاص ضابطہ بنا لیا۔ جہاں خصوصی کو نہ صرف پھولوں کے ہاروں سے لادا جاتا ہے کہ اس کی گردن اور کبھی کبھی چہرہ

بھی غائب ہو جاتا ہے بلکہ چھت کے ایک روشن دان میں سے پھولوں کی پتّیوں کی ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہتی۔ جو ڈائس کے تمام کرسی نشینوں کو ڈھانپ لیتی۔ . . . . . یونین کے طفیل اچھے مقرروں کو، ملک کے بہت سے لیڈروں اور افسروں سے ملنے کا موقع ملتا جو بعض دفعہ آیندہ زندگی میں بھی مفید ثابت ہوتا۔

اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے کبھی علی گڑھ میں کبھی اس سے باہر۔ (اب بھی ہوتے ہیں اگرچہ شاید طلبہ ان کی طرف اس قدر سنجیدگی سے توجہ نہیں کرتے) مجھے یونیورسٹی کے نمایندے کی حیثیت سے ان مقابلوں میں شریک ہونے کا موقع اکثر ملا اور ان میں انعام بھی حاصل کیے۔ ان میں سے ایک مقابلہ قابل ذکر ہے جو شاید ۱۹۲۲ء کے آخر میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ ہمارے ہاں سے اس میں دو طلبہ شریک ہوئے۔ حیدر آباد کے آصف علی بیگ اور میں۔ کوئی بیس بائیس یونیورسٹیو کے طلبہ اس میں حصہ لینے آئے تھے۔ میرا نمبر بولنے والوں میں سب سے آخر میں آیا۔ اور طلبہ اور سب حاضرین نے خاص توجہ اور دلچسپی سے تقریر کو سنا۔ ججوں نے ٹرافی علی گڑھ کو دی کیونکہ اس کے مقررین کے مجموعی نمبر سب سے زیادہ تھے۔ اور پہلا انعام آصف کو ملا لیکن بعض شرکائے جلسہ کا (جو سب کے سب بنارس یونیورسٹی کے اولڈ بوائز تھے) یہ خیال تھا کہ پہلا انعام مجھ کو ملنا چاہیے تھا۔ چنانچہ انھوں نے بالکل خلاف امید شورہ کر کے جلسے میں اعلان کیا کہ یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کی طرف سے ایک خاص انعام مجھے دیا جائے گا۔ جو چند روز بعد اچھی اچھی کتابوں کے ایک سٹ کی شکل میں میرے پاس پہنچ گیا اس عطیہ کا میرے دل پر بہت اثر ہوا کیونکہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایسا کرتے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ فراخ دلی کی

روایت اس وقت تک زندہ تھیں۔

جب میں نورتھ ایر میں پہنچا تو میرا نام یونیورسٹی یونین کی نائب صدارت کے لیے پیش کیا گیا۔ انتخاب تمام طلبہ ووٹ کے ذریعے کرتے تھے۔ میرے مقابلہ میں دوسرا نام حیدر آباد کے ایک طالب علم اکبر عالم کا تھا۔ وہ بھی یونین میں اکثر تقریریں کرتے تھے اور اچھے بولنے والوں میں تھے۔ عام طور پر طلبہ کا خیال تھا کہ کافی بڑی اکثریت سے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن جب نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کے ووٹ بالکل برابر ہیں۔ بہت سے "ماہرین سیاست" نے مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ووٹنگ کے کاغذات میں بعض ارباب اختیار واثر کے ایما سے ردّوبدل کیا گیا ہے۔ لیکن میں نے اصولاً اس کو تسلیم نہیں کیا نہ اس سوال کو اٹھانے کی کوشش کی۔ معاملہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے سپرد کیا گیا۔ جو یونین کے پریذیڈنٹ تھے تاکہ وہ اپنا فیصلہ کن ووٹ کسی امیدوار کے حق میں دیں جیسا کہ قاعدہ تھا۔ لیکن انھوں نے یہ "دانیالی" فیصلہ کیا کہ چھ مہینے اکبر عالم صدارت کریں اور چھ مہینے میں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ مجھے اپنی ٹرم کو پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ چھ ماہ بعد میرا انگلستان جانا طے ہوگیا۔

اچھا مقرر بننے کے لیے، میرے خیال میں، زیادہ قابل ہونا ضروری نہیں، مفید البتہ ہوسکتا ہے۔ میں نے ایسے اچھے مقرروں کو سنا ہے جن کا مبلغ علم خاصا محدود ہے۔ البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی شخص کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتا ہے تو وہ دراصل ان سے بات چیت کرتا ہے۔ اس بات چیت کے انداز کو نبھانا ضروری ہے۔ اگر وہ سننے والوں کو چھوڑ کر اپنی دھن میں بہتا چلا جائے تو خواہ تقریر کتنی ہی اچھی

ہو وہ سامعین کی توجہ کو نہیں کھینچ سکتی۔ ایک ذہین مقرر کے لئے لازم ہے کہ وہ سامعین کے ذہنی معیار کا اندازہ لگائے اور گویا ان کے فہم وصلاحیت کے لحاظ سے تقریر کرے۔ اگر ایک پروفیسر اپنی کلاس میں لیکچر دیتا ہے تو وہ جانتا ہے (یا اسے جاننا چاہیے) کہ اس کا ایک خاص معیار فہم ہے۔ اگر وہ اس لیکچر کو ایک عام مجمع کے سامنے دیتا ہے تو اسے اپنے اندازِ کلام کو بدلنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ کسی علمی مجمع میں ان خیالات کو پیش کرنا چاہتا ہے تو ان کی پیش کش کے لئے ایک تیسرے طریقے کی ضرورت ہوگی۔ مضمون ایک ہی ہو سکتا ہے لیکن پیش کرنے کا طریقہ بدل جائے گا۔ انجیل مقدس میں کہا گیا ہے کہ خداوند جب ٹھنڈی ہوا چلاتا ہے تو منڈی بھیڑوں کی خاطر اس کی شدت میں کمی کر دیتا ہے۔ بہت سے بولنے والے یہ نہیں جانتے کہ ان کے سننے والوں میں "منڈی ہوئی بھیڑیں" بھی ہیں، نہ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ دوسرے مقرر کو چاہئے کہ حاضرین کے ساتھ ایک زندہ رابطہ قائم کرے۔ اور ان کے چہرے، ان کی آنکھوں اور عام ردِ عمل سے اس بات کا اندازہ لگائے کہ وہ اس کے "ہم سفر" ہیں یا نہیں۔ زیادہ لمبی تقریریں کرنے میں بھی اکثر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک مقام ایسا آئے گا جب وہ تھک کر اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ خواہ وہ ہال میں موجود ہوں۔ ہر شخص مولانا آزاد یا عطاء اللہ شاہ بخاری یا سری نواس شاستری یا مسز سروجنی نائیڈو یا ڈاکٹر اینی بیسنٹ نہیں بن سکتا۔ جو وقت کے حدود کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ حاضرین کی دلچسپی کا احترام کرنا اور ان کے جبر کو ضرورت سے زیادہ نہ آزمانا ایک اچھے مقرر کی پہچان ہے۔ کسی مقرر کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تقریر کرتا تھا تو وقت کو بالکل بھول جاتا تھا اور اس میں حاضرین کی توجہ کا اندازہ کرنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ان کو بہت بے چین پایا تو اپنی گھڑی کو دیکھا جو بند تھی۔ حاضرین کو مخاطب

کر کے کہا کہ میری گھڑی بند ہوگئی ہے۔ کیا کوئی صاحب وقت بتا سکتے ہیں؟ کسی جلے دل نے جواب دیا۔ گھڑی بند ہوگئی ہے تو کیا ہوا سامنے کی دیوار پر کلنڈر تو لگا ہے۔ اس سے دن اور تاریخ تو معلوم ہو سکتی ہے۔ یعنی مختصر تقریر کرنا اور کر سکنا بھی مقرر کی ایک صفت ہے۔ تیسرے محض لفظوں کے جادو سے حاضرین کو دو تین بار مسحور کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ سب کے سب بے وقوف ہوں (جو خوش نصیبی ہر مقرر کے نصیب میں نہیں آتی) تو شاید کافی عرصے تک ایسا ہو سکے لیکن جو چیز واقعتاً کارگر ہوتی ہے، فنی نقائص کو بھی چھپا لیتی ہے وہ مقرر کا خلوص ہے۔ حاضرین کو یہ محسوس ہو کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے دل سے کہہ رہا ہے محض لفظوں کی طلسم بندی نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال میں یہ صفت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اگر ان کی عام تقریروں کو کلاسکی پیمانہ سے ناپا جائے تو وہ بہت اعلیٰ درجہ کے مقرر نہیں تھے لیکن ان کا اثر اپنے سے بہتر مقرروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا تھا کیونکہ سننے والا محسوس کرتا تھا کہ یہ شخص محض لفظوں کا کھیل نہیں کھیل رہا جو صرف زبان سے نکلتے ہیں۔ بلکہ لفظوں کے پیچھے ایک آدمی ہے جس کا دل انسانیت کے لئے دھڑکتا ہے اور ہر لفظ اس کے دل سے نکل رہا ہے۔ اگر مجھے حق پہنچتا ہے کہ نئے بولنے والوں کو کوئی ایک مشورہ دے سکوں تو میں ان سے کہوں گا کہ خود میں خلوص کی صفت پیدا کریں تا کہ بات دل سے نکلے اور بجلی کی طرح دل پر گرے اور اگر اس کے ساتھ تھوڑا سا ذوقِ ظرافت ہو اور انسان خود پر ہنس لینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو یہ خدا کی بڑی دین ہے۔

مجھے تقریر کرنے میں جو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی (جس کو میں نے ایمان داری کے ساتھ ہمیشہ استحقاق سے زیادہ سمجھا ہے) اس کا سبب یہی ہے کہ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ حاضرین کی نبض پر ہاتھ نہیں تو نظر رکھوں

ان کے صبر کا کبھی نامناسب امتحان نہ لوں اور جو کچھ کہنا ہے وہ آرائشِ محفل یا اپنی قابلیت جتانے کے لئے نہیں بلکہ دل کی بات ان تک پہنچانے کے لئے کہوں۔ میں نے یہ بھی تجربہ کیا ہے کہ آپ جو کچھ بھی کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں اگر اندازِ بیان میں اعتدال کو ہاتھ سے نہ دیں.... اور مقصد دل آزاری نہ ہو۔ مضمون سخت ہو سکتا ہے بشرطیکہ الفاظ نرم اور مہذب ہوں۔ یہ بات گاندھی جی کی تقریر اور تحریریں بہت نمایاں تھی اور مولانا آزاد بھی اس اصول پر عمل کرتے تھے۔ جن لوگوں نے ان پر اور ان کی پالیسی پر ایک زمانے میں بہت سخت اور رکیک حملے کئے ان کے جواب میں بھی انھوں نے اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کہا "یہ لوگ نہیں جانتے کیسے ناعاقبت شناس ہیں"۔ یعنی نہیں جانتے کہ ان کے طریقۂ کار سے کیا نتائج پیدا ہوں گے۔ یہ باتیں نہ صرف اصولاً اچھی ہیں بلکہ ٹکنک کے طور بھی اچھی تقریر کے لئے ضروری ہیں۔

علی گڑھ کے قیام سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پڑھنے کا شوق اور اس کی عادت پڑ گئی اور کتب خانہ میری تعلیمی زندگی کا ایک مرکز بن گیا جیسا میں نے اوپر اشارہ کیا مطالعہ کے معاملہ میں، میں نے اپنی نظر یا شوق پر حدیں نہیں قائم کیں بلکہ ہر قسم کے مضامین پر کتابیں پڑھیں (سوائے بعض مضمونوں کی خالص فنی یا اصطلاحی کتابوں کے کہ میری فہم سے بالا تھیں) اور اگرچہ آج ان میں سے بیشتر کے نام اور اُن کے مصنفوں کے نام بھی ذہن میں محفوظ نہیں لیکن خیال ہے (یا شاید خواہش کا بھیس بدل لیا ہو) کہ ان میں سے بیشتر کا کچھ نہ کچھ اثر کسی نہ کسی شکل میں میرے ذہن اور میرے نظامِ فکر کا (اگر میں اس کو یہ ادعائی نام دے سکتا ہوں!) جزو بن گیا ہے۔ انسان جب سوچتا ہے یا تقریر کرتا ہے یا لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فلاں فلاں خیال

کا منبع کیا ہے، فلاں مضمون کس سرچشمے سے پایا ہے بلکہ اس میں اپنی، دوسروں کی، شعوری طور پر حاصل کی ہوئی، غیر شعوری طور پر اپنائی ہوئی سب چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ایک اچھی کتاب کے پڑھنے سے (اور اس کی بہت سی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں) ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے۔ وہ دل اور دماغ کو ایک خاص وسعت اور تازگی بخشتی ہے اور زندگی کی، اس کے امکانات کی، اس کے المیوں، طربیوں کی نئی جھلکیاں دکھاتی ہے جو ایک بڑی دولت ہے بشرطیکہ پڑھنے والے میں ان کی قدر کرنے کی صلاحیت ہو۔ مجھے رحم آتا ہے ان لوگوں پر جو باوجود تعلیم حاصل کرنے کے اس دولتِ فراواں سے محروم رہتے ہیں اور مفلسی میں بسر اوقات کرتے ہیں۔

علی گڑھ میں مختلف قسم کے طلبہ آتے تھے بعض خوشحال گھرانوں سے آتے جن کے بزرگوں نے بھی اس درس گاہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ اس امید میں آتے تھے کہ وہاں ایک بے فکر اور خوش باش زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا، اپنے ہم چشم طلبہ سے ملاقات ہوگی اور ایک خاص قسم کے "علی گڑھ کلچر" کا ٹھپہ ان پر لگ جائے گا۔ ان میں سنجیدگی سے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی تھی اور یہ درس گاہ کی علمی زندگی میں تو نہیں لیکن اس کی رونق میں ضرور اضافہ کرتے تھے۔ کالج کی مروجہ اصطلاح میں یہ GRANDEES کہلاتے تھے دوسرے طلبہ سے زیادہ خرچ کرتے تھے کھیلوں میں نمایاں حصہ لیتے، فیشن میں پیش پیش رہتے ان کا ایک مخصوص حلقہ ہوتا جس میں عوام کا داخلہ مسدود تھا۔ دوسرا گروہ ان طلبہ کا تھا جو واقعی تعلیم حاصل کرنے اور اس کے ذریعے ملازمت حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان میں علمی ذوق رکھنے اور علم کو علم کی خاطر حاصل کرنے والے مقابلتاً کم ہوتے۔ لیکن بہرحال وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنی تعلیم میں محنت کرتے تھے۔

دراصل یہ توقع رکھنا بھی مشکل ہے کہ ملک میں جو حالات آج ہیں یا آج سے چالیس سال پہلے تھے اور بے روزگاری کا خطرہ، جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن پر چھایا ہے، ان کی موجودگی میں بیشتر طلبہ علم کو علم کی خاطر حاصل کریں گے۔ لیکن میرا دل اس وقت بھی چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ایسے طلبہ کا تناسب بڑھے اور استادوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہو جو علم کے قدردان اور اس کے پیاسے ہوں اور طلبہ کے دماغوں میں اس کی محبت اور جستجو کے چراغ جلا سکیں۔ ان کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ اکثر درسگاہوں میں اچھے کھلاڑیوں کی اور خوش لباس، خوش گفتار، خوشحال فیشن ایبل نوجوانوں کی جو سرکار کے وفادار خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، بہت زیادہ قدر کی جاتی تھی اور علمی اعتبار سے ممتاز طلبہ کی کم مثلاً اگر کوئی طالب علم کرکٹ کپتان ہوتا یا گھوڑے کی سواری میں مہارت رکھتا، یا کسی دولت مند خاندان سے وابستہ ہوتا تو اسے خاص طور پر اعلیٰ سرکاری افسروں سے ملایا جاتا کہ یہ فلاں خان بہادر یا رائے بہادر کا بیٹا یا بھتیجا ہے۔ اس زمانے میں جب انتخابی مقابلہ کسی قدر کم تھا اور انگریز یا اعلیٰ ہندوستانی حکام اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر کچھ لوگوں کو ڈپٹی کلکٹری یا پولیس کی ملازمت میں نامزد کر سکتے تھے تو پرنسپل کی سفارش پر عام طور پر اسی قسم کے طلبہ کی قسمت کھلتی تھی۔ زیادہ پڑھنے والا طالب علم، کتاب کا کیڑا کہلاتا تھا اور اس کی ہمت افزائی کرنا، اس کے لیے اعلیٰ تعلیم یا علمی تحقیقات کے دروازے کھولنا کالج یا اسکول کی کوئی خاص ذمہ داری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ اساتذہ جن کی قدریں روش عام سے مختلف ہوتیں، انفرادی طور پر ان کی ہدایت اور ہمت افزائی کرتے تھے اور بعض مرتبہ جوہر قابل کو چمکنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اتنا اور کہہ دوں کہ یہ بات صرف علی گڑھ تک محدود نہ تھی بلکہ دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی بالعموم یہی

ذہنیت کارفرما تھی۔ بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اب تک اچھے کھیلنے والوں کی قدر اچھے پڑھنے والوں سے زیادہ ہے اور مثلاً فٹ بال کوچ کو تاریخ کے پروفیسر سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ جب قدروں کے سانچے مسخ ہو جائیں تو کون کس کا گلہ کرے اور اس گلہ کو سنے گا کون؟ اور یہ شکایت صرف درس گاہوں ہی سے نہیں بلکہ سماج سے بھی ہے جو اکثر چیزوں کی اضافی قدر کو نہیں سمجھتی اور پھر انھیں قدروں کا عکس کسی حد تک درسگاہوں کے آئینہ میں بھی نظر آتا ہے۔ اگر سوسائٹی دماغی قابلیت کے مقابلے میں جسمانی قوت یا چستی کو زیادہ اہمیت دے گی جس کا اظہار کھیل کے میدان میں کیا جائے تو اسکول اور کالج بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں تک میں یہ خیال رائج ہو گیا ہے، گو ہم بحیثیت قوم کے ہاتھ کے کام اور جسمانی محنت کو تعلیم میں بہت کم اہمیت دیتے ہیں بلکہ ہم نے مدت تک اس کو ذلیل سمجھا ہے یعنی ہاتھ سے کوئی بدیہی طور پر مفید کام کرنا مثلاً جوتے بنانا یا لکڑی یا لوہے کی چیزیں بنانا یا جھاڑو دینا باعثِ شرم ہے۔ لیکن انھیں ہاتھوں یا پاؤں یا جسم کے دوسرے حصّوں کو اس غرض سے استعمال کرنا کہ کرکٹ کی گیند یا فٹ بال کو کامیابی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے، فخر کی بات ہے، اس سے مقصد کھیلوں کی اہمیت کو کم کرنا نہیں۔ اس کے لئے بہت سے جواز ہیں لیکن قدروں کا صحیح اندازہ سوسائٹی کا فرض ہے۔ اس بارے میں گذشتہ عرصہ میں تھوڑی تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن مجھے یہ اطمینان نہیں کہ ہمارے سماج اور درسگاہوں میں اہلِ فکر اساتذہ اور سنجیدہ طلبہ کو ان کا صحیح مقام حاصل ہو گیا ہے۔

تیسرا گروہ ان طلبہ کا ہوتا ہے نہ ذہین ہوتے نہ ممتاز کھلاڑی۔ وہ اس

لیے آتے کہ وہاں نہ آئیں تو کیا کریں؟ اکثر ان کے والدین بہت قربانی کر کے ان کو کالج میں بھیجتے اس امید میں کہ شاید تعلیم پانے کے بعد وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ ان میں سے بعض کی امید ضرور بر آتی لیکن اکثر جوا کھیلتے اور ہار جاتے۔ بی۔اے پاس کر لیتے اور کوئی مناسب (بلکہ بعض دفعہ نامناسب) نوکری تک نہ ملتی تو کوئی دوسرا راستہ نہ پا کر ایم۔اے۔ یا قانون میں داخلہ لے لیتے۔ بعض دفعہ مجبوری اور کبھی کبھی اپنی مرضی سے بی۔ٹی میں شریک ہو جاتے۔ اس کے بعد اونچی ملازمتوں کا خواب دیکھتے جو پورا نہ ہوتا۔ پھر تھانیداری، تحصیلداری یا معلمی کی طرف رجوع کرتے اور بعض دفعہ وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ یا پھر حسنِ اتفاق، یا حسنِ سفارش، یا حسنِ خوشامد کے طفیل نوکری مل جاتی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے معمولی کلرکی یا اسسٹنٹی پر قانع ہونا پڑتا۔ تعلیم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کی بدولت خود اپنے لئے مناسب راہ نکالنا مشکل تھا۔ ہاتھ کا کام وہ کر نہ سکتے تھے۔ تجارت کے گر نہ جانتے تھے نہ سیکھتے تھے اور سیکھ بھی لیں تو اس میں لگانے کے لئے روپیہ کہاں سے لائیں؟ بہت چھوٹے پیمانے پر کسی کام کو شروع کرنا اور اسے آہستہ آہستہ بڑھانا ان کو خلاف شان معلوم ہوتا، خصوصاً مسلمان طلبہ کے لئے جو "شریف" اور مالی اعتبار سے پسماندہ زمین داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یہ بات جو میں علی گڑھ کے طلبہ کے بارے میں کہہ رہا ہوں، بڑی حد تک دوسری یونیورسٹیوں پر بھی عائد ہوتی تھی۔ لیکن وہاں بھی مسلمان طلبہ پر ان کے ہندو ساتھیوں کے مقابلے میں اس کا تسلط زیادہ تھا۔ اور اب بھی سوچتا ہوں تو باوجود ان زبردست تبدیلیوں کے جو میری زندگی میں ہوئی ہیں، مثلاً غیر ملکی اقتدار ختم ہو گیا ہندوستانیوں کے لئے ملازمتوں اور کاروبار کے لئے دوسرے راستے نکل آئے صنعت وحرفت نے کافی ترقی کی۔ ایک اوسط طالب علم کے لئے جو خاص طور پر ذہین یا مقابلے کا امتحان

پاس کرنے میں مشاق یا بارسوخ نہ ہو، عرصۂ حیات ابھی تک اتنا ہی تنگ ہے۔
اس کی بہت سی وجہیں ہیں۔ ایک تو تعلیم بالعموم پرانے انداز میں دی جاتی ہے۔
جو طلبہ میں اپج اور خود اپنی کوشش سے راستے بنانے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی۔
دوسرے ملازمت کے خواہش مند طلبہ کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ہمارا
اقتصادی نظام اس تیزی کے ساتھ نہیں پھیل رہا ہے۔ تیسرے آبادی میں
اضافہ کی رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ کوئی قومی منصوبہ بھی اس کی گرد پا کو نہیں
پہنچتا۔ سالم ہندوستان کی آبادی ۱۹۴۵ء میں کوئی پینتیس کروڑ تھی۔ اب
تو برصغیر ہندوستان کی آبادی ملا کر ۶۵ کروڑ سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اور
صرف ہندوستان کی آبادی پچپن کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس میں ہر سال ایک
کروڑ سے زیادہ کا اضافہ ہوتا جاتا ہے جو دنیا کے بہت سے ملکوں کی مجموعی آبادی
سے زیادہ ہے۔ اگر ہمیں آزادی کے بعد جو مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئی ہیں وہ
نہ آتیں۔ اگر ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ سمجھ داری تعاون
اور امن پسندی کا سلوک کرتے، اگر ہم اس عرصے میں مستعدی، محنت اور فرض شناسی
سے کام کرتے اور اپنے وقت اور توجہ اور وسائل و ذرائع کو آپس کے نامبارک
اور مہمل جھگڑوں میں صرف نہ کرتے تو بھی ہیں پچیس سال کی مدت میں یہ ساری
مشکلات اور مسائل حل نہ ہو سکتے تھے۔ یہ مدت قوموں کی زندگی میں تو ایک
مختصر مدت ہے لیکن افراد کے صبر کے لئے ایک سخت امتحان ہے۔ پھر بھی اگر انھیں یہ
اطمینان ہو کہ بحیثیتِ مجموعی ہم آگے کی طرف جا رہے ہیں اور جس ایثار و قربانی کی توقع
عوام سے کی جاتی ہے اس کا نتیجہ خود ان کے لئے اور ان کی اولاد کے لئے اچھا
ثابت ہوگا تو وہ ان کٹھنائیوں کو جھیل سکتے ہیں لیکن انھیں تو بڑی حد تک یہ
تسکین بھی حاصل نہیں۔

اس میں ایک بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے (اگرچہ تاریخ میں تو اس کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں) گذشتہ سو برسوں میں جس میں بڑا حصّہ ہماری سیاسی غلامی کے زمانے کا تھا۔ ہمارے ملک میں بہت سے لیڈر پیدا ہوئے جن میں غیر معمولی فہانت انسانیت اور علمی صلاحیتیں تھیں، ایسے لیڈر جن پر دنیا کا کوئی بھی ملک فخر کرسکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ہماری سیاسی اور سماجی رہنمائی کی بلکہ نیا دی اخلاقی قدروں پر بہت مضبوطی کے ساتھ زور دیا اور بعض نے اپنی ذات اور عمل میں ان کا جلوہ دکھایا۔ لیکن باوجود اس کے ہماری زندگی ابھی تک تلاشِ منزل میں بھٹک رہی ہے اور ہماری قدروں کا شیرازہ درہم برہم ہے۔ پُرانا سماجی نظام بڑی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور کسی مرتّب بہتر نظام نے اس کی جگہ نہیں لی۔ ساتھ ہی ملک میں ایسی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں جو چاہتی ہیں کہ نئے نظام کو پیدا ہی نہ ہونے دیں۔ بلکہ ایک فرسودہ اور ناسازگار نظام کا زبردستی احیا کرکے اس کو ملک پر مسلط کریں اور انسانیت دوست اور ترقی پسند قوتوں کو میدان میں آنے سے روکیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ کیا ہوگا میں نہیں جانتا۔ میں کوئی منجم نہیں ہوں کہ پیش گوئی کرسکوں اور یوں بھی مجھے منجموں پر اعتقاد نہیں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شاید دنیا کی تاریخ میں اس قدر سخت آزمائش کا کوئی دور نہیں آیا جیسے آج ہے، گو انقلاب اور بحران ہمیشہ آتے رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ امریکہ کے ایک رسالے کے لئے مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "کیا انسان کو حق ہے کہ وہ امید پروری کا دامن تھامے؟"

"CANMAN AFFORDTOBEOPTIMISTIC"

یہ ایک مضمون کے جواب میں تھا جو وہاں کے مشہور سائنس داں "ہینس تھیرنگ" نے لکھا تھا۔ اس میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ انسان کے سامنے ترقی کے لئے بے پایاں وقت پڑا ہوا ہے، انسان کی عمر ابھی بہت کم ہے اور ہماری تہذیب کی حالت ایک نوزائیدہ بچے کی سی ہے جس نے گویا ابھی آنکھیں کھولی ہیں۔ اس خیال کی وجہ سے دنیا کے موجودہ حالات کی طرف سے جو بے اطمینانی ہمیں ہے وہ کم ہو جاتی ہے۔ ہماری تہذیب جن بیماریوں میں مبتلا ہے وہ گویا نسلِ انسانی کی بچپن کی بیماریاں ہیں۔ انسان کو دورِ زندگی سے نکلنے میں ابھی کافی وقت لگے گا جو آفاقی وقت کے مقابلہ میں ایک لمحۂ گریزاں ہے۔ رفتہ رفتہ انسان میں جو نیکی اور عظمت کے خزانے پوشیدہ ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گے۔ مجھے اس دانش مندانہ آفاقی نقطۂ نظر سے یہ اختلاف ہے کہ میری (یعنی ایک معمولی انسان کی) زندگی آفاقی وقت کے ناپ سے نہیں ناپی جاسکتی۔ میں تو وقت کی اس قید میں بندھا ہوں جس کی مدت زیادہ سے زیادہ ستر یا اسّی سال کی ہے لہٰذا مجھ سے آفاقی صبر کی امید رکھنا فضول ہے۔ صبر کی پالیسی کا جواز جانتا ہوں لیکن ساتھ ہی محسوس کرتا ہوں کہ بے صبری کے لئے، انسان کی بنیادی ذہنیت میں جس سست رفتاری کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے بھی جواز ہے۔ ہماری بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ انسان کی مادی اور ٹیکنیکل فتوحات میں بے اندازہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے مہذب زندگی کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے ان میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ بعض اعتبار سے (مثلاً جنگ کی بربریت) ترقیِ معکوس ہوئی ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی مادی خوشحالی میں مقابلتہً کم ترقی ہوئی ہوتی لیکن اخلاقی لحاظ سے انسان

کا معیار بلند ہوتا تو شاید ہمیں امید پروری کا زیادہ حق پہنچتا۔

اگر انسان نے موجودہ حالات پر قابو نہ پایا اور فی الحال اس کی بین علامتیں نظر نہیں آتیں، تو مجھے اندیشہ ہے کہ حالات اس پر حاوی ہو جائیں گے۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے ان گنت سالوں کی محنت سے بنایا ہے جو کچھ اس کے دماغ نے سوچا اور ایجاد کیا ہے، جو کچھ خواب اس نے دیکھے ہیں اور ان کو فنونِ لطیفہ کے سُندر روپوں میں ڈھالا ہے۔ یہ سب تہذیبی خزانے ایک ہولناک تباہی کا شکار ہو جائیں گے جو خود انسان کی لائی ہوئی ہو گی آسمان کی اُفتاد نہ ہو گی۔ اور ستم یہ ہے کہ اس کی براہِ راست ذمّہ داری ایک بے حس اور مجنون اقلیت کی ہو گی۔ لیکن اس کی لپیٹ میں مجرم اور معصوم بالغ اور بچّے مرد اور عورتیں، ظالم اور مظلوم سبھی آجائیں گے قرآن شریف نے غالباً کسی ایسی ہی صورتِ حال کی بابت پیش گوئی کی ہے:۔

اس فتنے سے ڈرو کہ اگر اٹھا تو صرف ان لوگوں پر نازل نہ ہوگا
جنھوں نے (قانونِ الہٰی کو نظر انداز کر کے) خاص طور پر ظلم
کیا ہے بلکہ سب اس کی آنچ کا شکار ہوں گے۔ (قرآن)

لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہے، یقین ہرگز نہیں۔ کوئی چیز میرے اندر ایسی ہے جو باوجود تمام قرائن کے، مجھے امید دلاتی ہے کہ ایسا نہ ہو گا۔ خدا نے یہ سارا کارخانۂ عالم "عبث" نہیں بنایا اور اس کو انسان کی حماقتیں اور بے راہ روی بالآخر تباہ نہ کر سکیں گی وہ خود براہ راست دنیا کو تباہی سے نہیں بچائے گا کیوں کہ یہ اس کی سنّت نہیں یہ کام انسانوں ہی کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ ان کی فطرت میں بہت سی ایسی ظاہر اور پوشیدہ قوتیں ہیں جو خیر اور نیکی اور انسانیت کی امین ہیں جن کا روشن جلوہ ہمیں بار بار دنیا کی

تاریخ میں بعض بڑے انسانوں اور مہاپرشوں کی زندگی میں نظر آیا ہے، اور مجھے باوجود اس کے جو میں نے اوپر کہا ہے، امید بندھتی ہے کہ یہی قوتیں بالآخر کامیاب ہوں گی۔

(خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ انکار کرنے والے اس کو کتنا ہی ناپسند کریں)　　　　(قرآن)

لیکن یہ معاملہ ایمان کا ہے، صرف عقل کا نہیں جس کو دلیل کے ذریعے ثابت کیا جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ عقل اور ایمان دونوں انسان کی زندگی کی کشتی کو کھیتے ہیں۔ بعض لوگ صرف عقل کو مانتے ہیں اور ندہبی معنوں میں "ایمان" کے قائل نہیں ان کے لئے یہ کوئی قائل کرنے والا ثبوت نہیں۔ لیکن اس بارے میں سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ لکم دینکم ولی دین تمہارا راستہ تمہارے لئے ہے۔ میرا راستہ میرے لئے۔ اس بارے میں جھگڑا کیوں کریں؟

علی گڑھ کے قیام کے سال گزرتے رہے اور اس عرصے میں زندگی کے بہت سے مثبت اور منفی تجربے حاصل ہوئے۔ میں نے خود کو حتی الامکان یونیورسٹی پالٹیکس سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی حساس شخص کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ ملک کی سیاسی تحریکوں سے ذہنی طور پر بے تعلق رہ سکے۔ نئی سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ گاندھی جی کے عہد کی ابتدا تھی، انھوں نے، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، سی۔ آر۔ داس جناح اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ سیاسی بیداری تو کافی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن آزادی کی تحریک ابھی اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ میں نے بہت سے دوسرے ساتھیوں کی طرح اس کا

خیر مقدم کیا۔ لیکن یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد میں ایسے لوگ بھی تھے جو بر بنائے خلوص یا زندگی کی عام روش سے متاثر ہو کر یا ذاتی اغراض کے ماتحت اس تحریک کی تائید کرنے کے بجائے حکومت وقت کا ساتھ دینا چاہتے تھے اس وجہ سے طلبہ میں بھی دو مختلف الخیال گروہ تھے۔ اگرچہ میری تعلیم کے زمانے تک بحیثیت مجموعی اکثریت حریت پسندوں ہی کی تھی اور جن لوگوں کو ہم رجعت پسند یا جی حضوری سمجھتے تھے ان کو کھلم کھلا ہماری آزادیِ رائے کو دبانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کے دروازے ہر خیال کے لوگوں کے لئے کھلے ہوئے تھے البتہ درسگاہ میں تقسیم نعائم کا ایک سلسلہ تھا، عہدے، وظیفے، مالی رعائتیں، تعلیم کے بعد نوکریوں کے لئے سفارش جس میں بعض دفعہ طلبہ اُن کے ساتھ جانب داری کی جاتی تھی جو اربابِ اختیار کا ساتھ دیتے تھے۔ ارباب اختیار کا مطلب تھا ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کی پارٹی۔ ہم لوگ یونین میں تقریریں کرتے، میگزین کے ذریعے بھی ایک حد تک اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے ناگواری یا مشکلات پیدا ہوتیں۔ لیکن آج کی سی کیفیت نہ تھی کہ ہر چھوٹی سی بات ایک زبردست شورش کا پیش خیمہ بن جاتی۔ دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ طلبہ اور مقامی پولیس میں جھڑپ ہو گئی جس کو اس وقت ہم نے بہت اہمیت دی لیکن اب نظر بازگشت سے دیکھا جائے تو وہ موجودہ ہنگاموں کے مقابلے میں خاصی "مہذب" معلوم ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت آج کل کے بے خودی کے طاق نسیاں میں ایک افسردہ گلدستہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی ملک کے مختلف تعلیمی مرکزوں کا دورہ کرتے علی گڑھ آئے اور یونین میں تقریر کی اور طلبہ کو نان کوآپریشن (عدم تعاون)

کا پیغام دیا اور یہ مشورہ دیا کہ ایسی درس گاہوں کو چھوڑ دینا چاہیے جن کا تعلق حکومت کے ساتھ ہے کیونکہ یہ حکومت ہماری جائز آزادی کو کچلنے کے درپے ہے۔ اس معرکۃ الآرا جلسہ کا نقشہ آج بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ ان کی اپیل کا اثر یہ ہوا کہ بعض طلبہ نے جن کی قیادت کا شرف ذاکر حسین کو حاصل تھا، یونیورسٹی کو چھوڑ دیا اور پھر انھیں طلبہ اور چند ممبران اسٹاف اور چند باہر کے لوگوں کی کوشش سے اس درس گاہ کی بنیاد پڑی جو جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے نام سے بعد میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مشہور ہوئی۔ مجھے بعض خاندانی حالات کی وجہ سے یونیورسٹی چھوڑنے کی ہمت تو نہیں ہوئی لیکن بطور احتجاج کے حکومت یوپی کی طرف سے جو وظیفہ مجھے ملتا تھا، اسے میں نے چھوڑ دیا۔

انٹرمیڈیٹ میں، میں نے سائنس کے مضمون لئے تھے لیکن اس وقت ایک دو پروفیسروں کے علاوہ اس شعبے میں قابل اُستادوں کی کمی تھی۔ علاوہ اس کے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ مادی دنیا اور اس کے اسرار کی نسبت مجھے انسانی دنیا اور اس کے مسائل میں زیادہ دل چسپی ہے۔ چنانچہ میں نے بی۔ اے۔ میں اختیاری مضامین کے طور پر، تاریخ اور معاشیات کو لیا۔ اس میں خوش قسمتی سے چند قابل پروفیسر مل گئے، جنھوں نے اس شوق کو بڑھانے اور پورا کرنے میں مدد دی۔ ان میں پروفیسر پانیکار۔ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر عبدالحلیم قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی آکسفورڈ سے بی۔ اے۔ آنرز کی ڈگری لی تھی، تینوں نوجوان تھے اور انھیں اپنے طلبہ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ یہ سب میرے اچھے دوستوں میں شامل ہو گئے۔ پروفیسر پانیکار سے

بعد میں مختلف حیثیتوں سے سابقہ پڑا۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین، باخبر، بیدار مغز آدمی تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا اور علم علم حاضر۔ گفتگو میں پوری محفل پر اچھا جاتے تھے اور علمی بحث میں بڑے دل چسپ نکتے نکالتے تھے۔ خود پر بہت اعتماد تھا شاید ضرورت سے زیادہ، اور جہاں سیاسی یا ذاتی مصلحتوں سے ارباب اقتدار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ رہتے، وہاں حسب موقع لڑنے کو بھی تیار ہو جاتے۔ آخری ملاقات کشمیر میں ہوئی۔ جب وہ ۱۹۶۱ء میں وہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور میں کچھ عرصہ کے لئے مشیر تعلیمات۔ اس وقت بھی سوشل اعتبار سے ان کی زندہ دلی قائم تھی۔ علمی دلچسپیاں بدستور تھیں۔ لیکن ان کی صحت خراب ہو چکی تھی اور آگ افسردہ پڑ گئی تھی۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ پروفیسر حبیب نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا۔ پروفیسر علیم آیندہ چل کر علی گڑھ میں پرووائس چانسلر بنے۔ لیکن بحیثیت پروفیسر کے زیادہ کامیاب تھے۔ پاکستان جانے کے بعد انھیں کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے مسلم لیگ کی سیاست میں کافی حصہ لیا۔ ہمارے پروفیسروں میں میں ایک انگریزی کے پروفیسر تھے جن کا نام ایرک ڈکنسن تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا یا انھوں نے انگریزی ادب میں کوئی خاص ریسرچ کی تھی۔ لیکن ادب میں ان کا بہت اچھا مذاق تھا۔ شاعری کرتے تھے نقاد اچھے تھے، انگریزی ادب کے علاوہ اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اور اچھے طلبہ میں ذوق و شوق کے چراغ جلا سکتے تھے۔ انھیں کی تعلیم کے طفیل میرے ہم عصروں میں سے خواجہ منظور حسین سید مختار علی اور سید محمود حسین نے طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے

بعد اسٹاف میں شامل ہوکر بڑا نام پیدا کیا۔ اردو میں ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے جن کا نام ایک ادیب کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں مشہور ہے۔ وہ غالباً پہلے اردو کے پروفیسر تھے جو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں مقرر ہوئے کیونکہ اس سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ جو شخص فارسی پڑھا سکتا ہے اردو کی تعلیم بھی دے سکتا ہے۔ ان کا خاص میدان ریسرچ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ریسرچ کا رواج بہت کم تھا۔ ان کی خصوصیت ادبی قدروں میں نظر اور ایک بہت دل نشیں اور منفرد اسلوب بیان ہے جس میں نکتے سے نکتہ پیدا کرتے اور ایک سنجیدہ ظرافت کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جنھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے اور وہاں کی تلمیحات سے بخوبی واقف ہیں وہ ان کی تحریر سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں خداداد سلیقہ ہے کہ خود ریسرچ کریں یا نہ کریں طلبہ میں اس کا شوق پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے ادبی ذوق کو ابھار سکتے ہیں۔ علی گڑھ سے انھیں عشق ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ "ان کی نماز ان کا روزہ ان کی زندگی اور موت" سب علی گڑھ کے لئے ہے۔ تنقید مقابلۃً کم کرتے ہیں تعریف اور تحسین زیادہ۔ لیکن ان کا خلوص اس مبالغہ کو کرامت کے ساتھ سنبھال لیتا ہے۔ جب میں یونیورسٹی اسٹاف کا ممبر ہوا تو ان سے مراسم اور مستحکم ہو گئے اور آج بھی وہی راہ و رسم محبت چلی جاتی ہے۔ بلکہ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد اور زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ انھوں نے کبھی ان اقدار کو نہیں چھوڑا جن پر ان کا عقیدہ ہے اور ہمیشہ ان کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ گفتگو میں تقریریں تحریر میں، گفتگو کا انھیں بہت اچھا سلیقہ ہے۔ اور اپنے خصوصی انداز میں بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ اور مزاح میں بعض دفعہ بہت فکر انگیز

اور پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ خط بہت مزے دار اور بے ساختہ لکھتے ہیں اور اگر غالب کے بعد چند صاحبِ طرز نامہ نگاروں کا انتخاب کیا جائے تو اس زمرے میں ان کا مقام بہت بلند ہوگا۔۔۔۔۔ بہت سال بعد کا ذکر ہے جب ڈاکٹر ضیاء الدین دوبارہ وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے۔ اُن کا الحاق مدت سے ڈاکٹر ضیاء الدین کی "پارٹی" سے تھا لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے خود کو اس سے آزاد کر لیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ ان سے بحیثیت ممبر کورٹ یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان کے حق میں ووٹ دیں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم یونیورسٹی کے غریب اساتذہ کے پاس اپنی رائے کی آزادی کے سوا اور کیا رکھا ہے اور میں اس کو تج دینے پر تیار نہیں ہوں!

اردو کی تعلیم کی اس زمانے میں عجیب حالت تھی۔ تعلیم تو اردو زبان میں دی جاتی تھی لیکن (آپ مانیں یا نہ مانیں) ذریعہ امتحان انگریزی تھا۔ بی۔ اے کے امتحان میں ہم سے توقع کی جاتی تھی کہ مثلاً ہم کلامِ غالب کی فنی خوبیاں اور اس کے استعاروں، تشبیہوں اور محاوروں سے شہنشاہ برطانیہ کی زبان میں بحث کریں اور انیس و دبیر کا موازنہ میکالے کی زبان میں لکھیں۔ مجھے تو یہ بات اس وقت بھی حماقت معلوم ہوتی تھی مگر اس کا رواج مدتوں چلتا رہا۔ جب میں دس بارہ سال ریاست جموں اور کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیمات تھا اور منصبی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا ممبر تو میں نے دیکھا کہ وہاں عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم اور امتحان دونوں انگریزی میں ہوتے ہیں۔ زیادہ تر میرے ہی احتجاج پر اور بعض دوسرے ممبروں کی تائید سے اس مہمل طریقہ کو بدلا گیا۔

بعض اور بھی قابل اور نامور پروفیسر تھے جن میں سے بعض نامور

تھے بغیر قابل ہونے کے، بعض قابل تھے بغیر نامور ہونے کے اور بعض میں دونوں چیزیں موجود تھیں) حیدر آباد کے ایک نامور خاندان کے چشم و چراغ ڈاکٹر ہادی حسن ابتدا میں باٹنی کے پروفیسر تھے انھوں نے کیمبرج سے اس مضمون میں ڈگری لی تھی لیکن ان کی مادری زبان فارسی تھی اور میدانِ شوق فارسی زبان اور ادب۔ چنانچہ یونیورسٹی سے چھٹی لے کر لندن گئے۔ وہاں سے فارسی زبان میں ڈاکٹریٹ لی۔ اور واپس آکر فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور آخر تک اس کو پڑھاتے رہے۔ بڑے خوش گفتار، خوش تقریر، خوش تحریر، خوب صورت اور نستعلیق آدمی تھے علم مجلسی میں ماہر اور دربار داری کے آداب سے واقف۔ ان میں ایک کمزوری یہ تھی (کیا یہ فارسی ادب کے جینیس اور اس میں جو مبالغہ کا عنصر پایا جاتا ہے اس کا اثر تھا) کہ ان کے بیان میں غلو بہت ہوتا تھا کبھی لطفِ مجلس کی خاطر، کبھی عادت کی مجبوری سے۔ مثلاً ایک دفعہ انھوں نے ایک جلسہ میں آغا خان کی شان میں کہ مہمانِ خصوصی تھے، اور نواب رام پور کی شان میں کہ صدرِ جلسہ اور پرو چانسلر تھے، اس انداز میں تقریر کی اور ان کی تعریف میں ہر دیوار کو پھلانگتے ہوئے گزر گئے کہ مجھے ان سے بعد میں بصد ادب لیکن قدرے آزردگی کے ساتھ کہنا پڑا کہ آپ اگر یہ باتیں کسی نبی یا امام کے متعلق بھی کہتے تو شاید مجھے مبالغہ معلوم ہوتا۔ آخر آپ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے وقار کا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھیں تقریر کے فن میں کمال حاصل تھا اور ہندوستان کی بہت کم یونیورسٹیاں ایسی ہوں گی جہاں انھوں نے فارسی زبان اور ادب کے مقابلۃً غیر مانوس مباحث پر تقریریں نہیں کیں اور خراجِ تحسین حاصل نہیں کیا۔ اگر کوئی ایک دفعہ ان کی

تقریر کو سنتا تو ان کی زبان اور بیان، ان کی فصاحت و بلاغت اور ان کے حافظہ کے کمال کو عمر بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ بلکہ دو تین تقریروں تک یہی عالم ہوتا۔ لیکن کچھ عرصے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا کہ اس بلا کی آمد میں آورد کا کمال اور اس کمالِ فن میں خلوص سے زیادہ پرکاری اور اداکاری چھپی ہوئی ہے۔

سائنس کے پروفیسروں میں میرے ایک نامور استاد حیدر خاں قابل ذکر ہیں۔ ان کا علم بہت وسیع نہ تھا۔ انھوں نے کبھی کوئی ریسرچ نہیں کی لیکن اعلیٰ درجے کے معلّم تھے اور کلاس روم میں اور اس کے باہر طلبہ پر ان کا بہت اچھا اثر تھا، ان کے ساتھ کھیلتے تھے ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے، ان کی زندگی میں حصّہ لیتے تھے۔ اور ضمناً یہ کہ ان کو بڑی خود اعتمادی اور لگن کے ساتھ ڈانٹتے بھی تھے۔ انتظامی معاملات میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا اور عملی کاموں میں بہت اچھی سوجھ بوجھ۔ عربی کے ایک استاد عبد العزیز میمن بھی اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے بہت مشہور تھے لیکن اپنی قلعہ بند دنیا میں رہتے تھے اور اس سے باہر نہ نکلتے تھے۔ ہمارے اقتصادیات کے پروفیسر ڈاکٹر کریم حیدر لودھی تھے جن کی شہرت ان کی قابلیت سے زیادہ تھی۔ حکومت نے ان کو خاصا نوازا، رائل زراعتی کمیشن کا ممبر مقرر کیا جس میں (یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر سمجھی جاتی تھی) کہ پروانۂ تقرری میں حضور شہنشاہ معظم نے ہر ممبر کو "مائی ڈیر کزن"— کر کے خطاب کیا تھا۔ ان کو C.I.E کا خطاب بھی ملا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے۔ نیک آدمی تھے لیکن ذوقِ ظرافت اور عوام کے ساتھ ملنے جلنے کی صلاحیت کم تھی۔ اُس زمانے میں فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن تھے۔ میں ان کا

طالب علم تو نہیں رہا لیکن پڑھنے پڑھانے کے زمانے میں ان سے خاصے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ان میں ایک پروفیسر کی ظاہری شان بدرجۂ اتم موجود تھی ایک ٹیگور نما داڑھی، خود کو بہت لئے دیئے رہنا، ان کی شہرت بھی قابلیت سے زیادہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو بہت نیک نیت تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست میں حصہ لینے کا شوق تھا، غالباً صلاحیت سے زیادہ۔

آج کل یونیورسٹیوں میں کم سے کم ظاہری طور پر ریسرچ کا کافی چرچا ہو گیا ہے اور خصوصاً سائنس کے شعبے میں بعض پروفیسروں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ لیکن اچھے اُستادوں کی نہ صرف کمی ہو گئی ہے بلکہ ان کی زیادہ قدر بھی نہیں کی جاتی۔ زور ریسرچ بڑھا ہے وہ بامعنی ہو یا خانہ پری کے لئے۔ کتاب شائع کرو اور اعلیٰ گریڈ حاصل کرو میری رائے یہ ہے کہ ایک کالج یا یونیورسٹی کو خوبی کے ساتھ چلانے کے لئے دونوں قسم کے پروفیسروں کی ضرورت ہے وہ جو کاروانِ علم کو آگے بڑھا سکیں (اور ہر کوئی اس امتحان میں پورا نہیں اُتر سکتا) اور وہ جو طلبہ کے ذہن میں شوق اور لگن کے چراغ جلا سکیں، جو علم کے خزانوں کو نوجوان طلبہ کے سامنے اس انداز سے پیش کریں کہ وہ انھیں اپنا سکیں اور ان کے دل میں ان کی محبت اور قدر پیدا ہو۔ ان دونوں قسم کے اساتذہ کو عطیہ الٰہی سمجھنا چاہیئے اور جہاں کہیں بھی وہ ملیں ان کو ہاتھوں ہاتھ لینا اور سر پر بٹھانا چاہیئے کہ یونیورسٹی کی رونق انھیں کے دم سے ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا ہو گا کہ دراصل اچھے اُستاد آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ بہت سے اُستاد محض اس لئے رکھ لئے گئے تھے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین ان کو

لینا چاہتے تھے۔ ان کا معیار انتخاب اکثر یہ نہ ہوتا تھا کہ قابل ترین امیدوار کون ہے بلکہ ان کی پارٹی کے لئے سب سے زیادہ مفید اور تنظیمی معاون ثابت ہوگا یا کس کے لئے سب سے زیادہ با اثر شخص کی سفارش آئی ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ ایک نا قابل اور کمزور استاد تیس چالیس سال تک ہزاروں طلبہ کی ذہنی زندگی کو خراب کر سکتا ہے۔ لیکن عمل میں وہ اکثر اس اصول کو نظر انداز کرتے تھے کہ یونیورسٹی کو ایک معیاری ادارہ ہونا چاہیئے اور پھر ستم یہ ہے کہ ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ جب اُستاد بنتے تو ان میں سے بہت سے ان ہی نامبارک روایات کو جاری رکھتے۔ نہ خود میں علم کا شوق ہوتا، نہ اپنے طلبہ میں اس کی لگن لگا سکتے۔ بس امتحان پاس کرانے کے لئے کلاس میں لکچر دیتے یا نوٹ لکھاتے اور اس کو کافی سمجھتے۔ پھر نا قابل استادوں کو ایک تحریص یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا اثر قائم کرنے یا انتظامی عہدے پانے یا ترقی کرنے کے لئے ریشہ دوانیاں کریں، گھٹیا طریقے اختیار کر کے ارباب اختیار کے حضور میں رسائی حاصل کریں۔ اس سے یونیورسٹیوں کی ساری فضا مکدر ہو جاتی، اور قابل و فرض شناس استادوں کو یک سوئی اور خوش دلی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہ ملتا اور یہ سب چیزیں طلبہ کی تعلیم و تربیت پر بُرا اثر ڈالتیں۔

مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کروں کہ یہ معیوب پارٹی بازی اور بے اصولی اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ بہت سے کالجوں اور اکثر یونیورسٹیوں میں یہی ذہنیت کارفرما تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اب تک یہ بدعنوانی جاری ہے اور کہیں کہیں تو اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ یونیورسٹیاں دراصل چند قابل، شریف اور فرض شناس استادوں

کے بل پر زندہ تھیں اور زندہ ہیں۔ لیکن محض زندہ ہونا تو کافی نہیں! وہ تو علمی درس گاہیں ہیں، علم و فضل کا مرکز ہیں۔ ان کا تو بڑا مقصد طلبہ کے دماغ میں علم کی محبت پیدا کرنا اور جستجو کرنا اور تلاش حق کے چراغ جلانا ہے۔ اگر ان کے استاد اس کام کو اچھی طرح نہ کر سکیں تو ان کی دوسری "صفاتِ حسنہ" اس بنیادی نقص کا کفارہ کیسے کر سکتی ہیں۔ یہی نتیجہ ہوتا ہے جب استادوں کو اقربا پروری یا ذات برادری یا مذہب کی بنا پر مقرر کیا جائے یعنی "اپنے!" کسی شخص کے ذاتی فائدے کی خاطر ہم طلبہ کی کتنی ہی نسلوں کے مفاد کو بے دردی کے ساتھ قربان کر دیں (خواہ وہ اپنے خاندان کا ہو یا ذات برادری کا ہو یا مذہب کا) اور نہ ہماری پیشانی پر شرمندگی کا پسینہ آئے اور نہ ہمارے ضمیر میں احتجاج کی لہر اٹھے۔ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی۔

بہر حال استاد اچھے خاصے، بُرے بھلے، ہر طرح کے ملے لیکن یونیورسٹی میں بہت کچھ طالب علم اپنی محنت، تجربے اور شوق سے سیکھتا ہے (یا نہیں سیکھتا!) وہ استادوں اور ساتھیوں میں سے اپنے ہم مذاق لوگوں کا انتخاب کرتا ہے اور زیادہ تر انھیں سے ملتا جلتا اور تعلقات قائم کرتا ہے۔ میرے ہمعصروں میں خوبی قسمت سے بہت سے طلبہ ایسے تھے جنھوں نے بحیثیت معلم یا اہلِ علم، یا زندگی کے دوسرے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ اور (ڈاکٹر) عابد حسین جو اس وقت بھی ممتاز تھے اور بعد میں کل ہند اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوئے (ان کا ذکر آگے آئے گا)، سید نور اللہ (مرحوم)، جو بمبئی میں محکمۂ تعلیم کے ایک نامور رکن تھے اور بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوئے مختار حامد علی (مرحوم)، خواجہ منظور حسین اور سید محمود حسین جو انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں اتحادِ ثلاثہ کی حیثیت رکھتے تھے، طالب علمی کے زمانے میں بھی اور پھر

اسٹاف میں آنے کے بعد بھی، انگریزی اور اردو ادب دونوں میں بہت اچھی اور اور گہری نظر رکھتے تھے اور علی گڑھ میں اچھے طلبہ ان سے اور ان کے کتب خانہ سے فیض اٹھاتے تھے اور کمزور طلبہ ان کی تعریف کرتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ان کے چند طلبہ کو آپس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے بارے میں گفتگو کرتے سنا اور ایک طالب علم نے بہت سادگی سے کہا، بھئی خواجہ منظور حسین تو بہت ہی قابل ہیں۔ وہ تو لکچر میں پچاس فی صد لفظ ایسے استعمال کرتے ہیں جن کے ہمیں معنی بھی نہیں آتے (اس غریب کو یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قول فیصل کے ذریعے ان سے زیادہ خود پر حکم لگا رہا ہے!) وہ نہ صرف ایک قابل استاد ہیں بلکہ نظر بلند، سخن دلنواز، اور گداز قلب کی صفات بھی رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد انٹر یونیورسٹی بورڈ کے سکریٹری رہے اور اب شاید عمر بھر کے لئے حقِ تصنیف کو، جسے کسی مصلحت سے ہمیشہ دباتے رہے، پورا کر سکیں۔

مختار حامد علی کو خدا نے اپنے حضور میں وقت سے پہلے بلا لیا (یعنی ہمارے جو وقت کے اندازے ہیں، ورنہ اپنی مصلحتوں کو وہی جانے) ان کی ایک عجیب۔ لیکن پاک شخصیت تھی، ظاہر میں ذرا مردم بیزار، ذرا کھرے اور غیر معمولی حد تک صاف گو۔ لیکن ان کے اندر جو انسان چھپا تھا وہ ہر شخص کے دکھ درد کو محسوس کرتا تھا، ہر شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔ طالب علمی اور اس کے بعد معلمی کے زمانہ میں وہ ان چند ہی لوگوں میں تھے جو نہ مقامی سیاست اور ریشہ دوانیوں میں دلچسپی لیتے تھے، نہ کبھی انھوں نے ان چیزوں کو موقع دیا کہ ان کے صفائے قلب کو مکدر کریں۔ وہ دو سال میرے روم فیلو رہے۔

اور میں نے ان کو ہر طرح کھرا سونا پایا۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں، ان کے بارے میں، میں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا بغیر نام ظاہر کیے جس کا عنوان تھا "ایک نقاب پوش زندگی" اور اس میں اپنی محدود سمجھ کے مطابق ان کی سیرت نگاری کی کوشش کی تھی۔ سید محمود حسین پروفیسر کی حیثیت سے بھی قابل سمجھے جاتے تھے اور جب بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت مستعدی اور خود اعتمادی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ خواجہ حبیب علی نے، جو میرے قریبی عزیز ہیں، بچپن سے میرے ساتھ پڑھا، کالج میں ساتھ رہے اور پھر پہلے ہندوستان میں معلّمی اور نائب تحصیل داری سے لے کر، مختلف قسم کے تجربے حاصل کیے اور پاکستان میں محکمۂ فنانس کے ڈپٹی سیکریٹری کے منصب تک پہنچے۔ عمر بھر دیانت داری اور ایمان داری کی بدولت صدمے اٹھائے، لیکن کبھی بد دیانتی کے ساتھ معاملہ کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اسداللہ کاظمی جو تعلیم ختم کرنے کے بعد یوپی کے محکمہ تعلیم کے ایک رکن رکین رہے، میرے بعد کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں ڈائرکٹر ہوئے اور پھر کئی سال تک یونیسکو کی طرف سے عراق میں بہت خوش اسلوبی کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیں۔ پہلے انگریزوں کے انداز میں انگریزی بولتے تھے اب عربوں کے انداز میں عربی اور اردو دونوں بولتے ہیں۔ محمد احمد کاظمی (مرحوم) کی پیشانی سے طالب علمی ہی کے زمانے سے ستارۂ بلندی چمکتا تھا، جو جوڈیشل ملازمت میں آنے کے بعد ڈسٹرکٹ سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور نہایت ایمان داری اور نیک نامی کے ساتھ عمر بھر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ بڑے محبت کے اور صاف باطن آدمی تھے۔ شاہ بشیر عالم

(جو سر شاہ سلیمان کے عزیز تھے) ٹینس کے مشہور کھلاڑی تھے، دو سال میرے روم فیلو رہے۔ نہایت شریف اور نیک انسان ہیں (کیا کہوں، باوجود اس کے) مدّت تک کانپور میں وکالت کرتے رہے اور ساتھ ہی ایک مقامی کالج میں قانون کے پروفیسر بھی رہے۔ غلام فاروق جو مجھ سے ایک سال پہلے جونیئر ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری تھے، قابل اور نیک آدمی تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ریلوے میں ملازمت کی جس میں بہت ترقی کی، بعد میں پاکستان چلے گئے اور وہاں شاید وزیر صنعت وحرفت ہیں۔ سیّد شبیر الدین جو علی گڑھ میں بقول شخصے "یک بینی و دو گوش" یا محض ایک کمبل لے کے آئے تھے، لیکن انھوں نے اپنے شوق، محنت قابلیت سے، باوجود ہر قسم کی مشکلات کے، علی گڑھ سے ایم۔ اے۔ کیا۔ لاہور جا کر لائبریرین شپ کا ڈپلوما حاصل کیا، ایک سال ولایت میں مزید ٹریننگ کے لئے رہے اور لائبریری اسسٹنٹ کی جگہ سے ترقی کر کے یونیورسٹی لائبریرین کی پوزیشن حاصل کی۔ اور رفتہ رفتہ اپنے خاص میدان میں اتنی ترقی کی کہ اب ان کا شمار ملک کے چوٹی کے مشاہیر فن میں ہوتا ہے۔ زبانیں سیکھنے اور کتابیں پڑھنے کا جنوں رہا (اگر خدا یہ جنون زیادہ عام کر دیتا تو کتنا اچھا ہوتا!) آغا سید ابراہیم (مرحوم) جو ڈاکٹر ہادی حسن کے قریبی عزیز تھے اور جن کے سامنے زندگی میں ترقی کرنے کے بہت سے امکانات تھے۔ لیکن اپنے والد کے انتقال کے بعد نہ معلوم دل میں کیا آئی، اور عزم میں کس بلا کی پختگی تھی، کہ تعلیم نامکمل چھوڑ کر شری آروبندو آشرم میں جا پہنچے، اپنی ساری جائداد آشرم کو دے دی اور تقریباً تیس سال وہیں گزار کر اپنے مالک سے جا ملے جس کی جستجو میں ساری عمر بسر کی تھی۔ حیدرآباد کے ایک اور عزیز دوست مشتاق احمد تھے (جو نواب فخر یار جنگ (وزیر فنانس)

کے صاحبزادے تھے۔ ان کا ساتھ کچھ عرصے کے لئے علی گڑھ میں رہا اور پھر ولایت میں بھی تعلیم کے زمانے میں وہ میرے ہم عصر تھے۔ بڑی محبت اور قابلیت کے آدمی ہیں۔ پہلے ہندوستان میں ریلوے کے محکمہ میں بہت ترقی کی۔ پھر پاکستان چلے گئے اور اگرچہ مجھے ان کی سیاست کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہو لیکن دل کی محبت اور خلوص میں کبھی کمی نہیں آئی۔

ان لوگوں میں علمی قابلیت تو کم وبیش مشترک تھی لیکن یہ نام میرے ذہن میں اس وجہ سے اُبھرتے ہیں (اور یہ کوئی مکمل فہرست نہیں۔ میرے احباب میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کا ذکر شاید آگے آئے) کہ ان میں بعض بہت قابل قدر انسانی صفات تھیں یا ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے اپنی ذات کو زندگی کا مرکز یا مقصد اوّل نہیں بنایا "انا" کے بُت کی بے جا پرستش نہیں کی بلکہ جو کچھ صلاحیتیں خدا نے ان کو دی تھیں انھیں خدمتِ خلق میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ ہم میں سے یہ دعوٰی تو کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ ہم اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ نفسانی اغراض اور تحریصیوں سے کس کو مفر ہے۔ کس کا دامن اس سے بالکل پاک ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کو دوست کی حیثیت سے اس وجہ سے پسند کیا اور چاہا کہ ان میں سے اکثر میں اس جلوہ انسانیت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اگر ان کی ذات ہی ان کے لئے محور کائنات ہوتی اور ان کے دل پتھر کی طرح بے حس تو خواہ وہ پتھر ہیرا ہوتا میں ان کی قدر اور ان سے محبت نہیں کرسکتا تھا۔

میں ذہنی قابلیت کی بہت قدر کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ دنیا نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ترقی کی ہے اس میں انسانی ذہن کا کس قدر نمایاں حصہ ہے۔ اور دنیا میں انسان کے جو شاہکار نظر آتے ہیں وہ بیشتر

اسی کی انتہا صلاحیتوں اور بے پناہ علمی ترقی کا ثبوت ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر میں نے "نظام خطبات" دئیے تھے۔ جن کا عنوان تھا "فکرِ انسانی کا ارتقا" اور ان میں یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ انسان کے دماغ میں "گوشت کے چھوٹے سے لوتھڑے" میں کیا کیا کمالات اور امکانات اور قوتیں پوشیدہ ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ایک امریکی مصنف گلبرٹ ہائٹ کا ایک مقولہ نقل کیا تھا جس کا اعادہ یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

"اس ڈیڑھ سیر لیسیج کے لوتھڑے میں نہ جانے کیا کیا درج ہے۔ اور کیا کیا جمع ہے؟ کروڑوں، اربوں، عادتیں، جبلتیں، صلاحیتیں، آرزوئیں امیدیں اور خوف، نقشے اور رنگ، .... اور آوازیں، ریاضی کے نازک اور باریک تخمینے، بھدی اور بھونڈی نفسانی خواہشیں، تیس سال پہلے سُنی ہوئی سرگوشی کی آواز، وہ ارادہ جو پندرہ ہزار دن کی روزانہ مشق سے راسخ ہو گیا ہے۔ وہ نفرت جو دل میں بیٹھی ہوئی ہے، وہ عیش جو کبھی نصیب نہیں ہوا مگر تصور میں ہمیشہ رہا، ایک پل کے مختلف حصّوں میں جو زور پڑتا ہے اس کا پیچیدہ حساب، تار پر انگلی کے دباؤ کا بالکل صحیح انداز شطرنج کے ہزارہا نقشے، ایک سانٹ، ایک پہاڑی، الجبرے کی ایک مساوات، ایک اڑتی ہوئی گیند کو ظاہر کرنے والے خطوط منحنی، رنگوں کی مختلف کیفیتیں، کلفت اور مسرت کے احساسات، ہزاروں اجنبیوں کے چہرے کسی ایک باغ کی خوشبو، دعائیں، ایجادیں، جرائم، اشعار، لطیفے، موسیقی کی دُھنیں، حساب کے سوال، غیر حل شدہ مسائل، پُرانی فتوحات، دوزخ کا ڈر، خدا کی محبت، گھاس کی ایک پتی کی شکل، تاروں بھرے آسمان کا نظارہ! ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ یہ سب کچھ اور ان کے سوا نہ معلوم کیا کیا، انسان

کے چھوٹے سے دماغ کی کائنات میں شامل ہیں"۔

لیکن باوجود یہ سب جاننے کے اور تسلیم کرنے کے، میرے نظام اقدار میں دل کا مقام بہت اونچا ہے۔ اگر کوئی شخص علم و حکمت کے تمام خزانے جمع کرے، لیکن اس کا دل محبت کی دولت سے خالی ہے۔ اگر اس میں اس شرافت اور انسانیت کی کمی ہے (جو دراصل اسی مطلب کا اظہار ہے دوسرے لفظوں میں)، تو اس کے کام کی قدر کرتا ہوں لیکن اس کو حقیقی معنوں میں "انسان" ماننے میں مجھے تامل ہوتا ہے۔ میں نے زندگی میں جن انسانوں کی واقعی عزت اور ان سے محبت کی ہے، ان سب میں شاید قدر مشترک یہی رہی ہے۔ یعنی وہ لوگ اپنی "انا" کی حدوں اور قیدوں کو توڑ کر اس مقام پر پہنچ گئے تھے (یا پہنچ گئے ہیں) کہ وہ اپنے گرد و پیش کے انسان کے، بالخصوص بعض صورتوں میں سارے عالمِ انسانیت کے دکھ درد کو اپنے اندر سما لینے کی صلاحیت یا حوصلہ رکھتے تھے۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش، زندگی کے ڈرامے میں برابر کارفرما رہی ہے۔ دماغ اکثر عقلِ دنیادار کے سبق کو دہراتا ہے۔ دل اس کی سطحیت کو بے نقاب کرتا ہے (ہمیشہ نہیں لیکن بہت سے موقعوں پر) اور کہتا ہے کہ اس سے گہری ایک اور حقیقت بھی ہے۔ جس تک پہنچنا ضروری ہے۔ اور دل ہی ہے جو اس بارے میں دماغ سے ٹکر لینے کی جرأت رکھتا ہے، جس لئے شاعر نے کہا ہے:-

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے

عالم ہے غلام اس کے جلالِ ازلی کا
اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے[1]

بی۔اے۔ پاس کرنے کے بعد میرے بعض دوستوں اور خیر خواہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہو جاؤں ان کا خیال تھا کہ اس میں میرے کامیاب ہونے کے بہت اچھے امکان ہیں۔ لیکن خود کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنے پر راضی نہ کر سکا۔ اس کی زیادتیاں اور ظلم اور ہندوستانیوں کے حقیقی مفاد سے اس کی بے تعلقی نظر کے سامنے تھی۔ یہ بھی میں نے دیکھا تھا کہ حکومت کے ہندوستانی افسر، باوجود بعض دفعہ حساس اور صاحبِ ضمیر ہونے کے، حکومت کی پالیسی کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کچھ ہمارے خاندان کی روایات بھی حکومت کی نوکری کے خلاف تھیں۔ چنانچہ میں نے ان کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ اور علی گڑھ میں ایم۔اے۔ اور ایل۔ایل۔بی۔ میں داخلہ لے لیا۔ دن میں تاریخ کے لکچر سنتا جس کے پروفیسروں سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ اور شام کو قانون کے، جس کے پروفیسر میرے لئے مقابلتاً نئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ قانون کی تعلیم (نہ صرف ہماری یونیورسٹی میں بلکہ بیشتر یونیورسٹیوں میں) اس طرح دی جاتی تھی کہ اس میں بقول شخصے نہ دین کا فائدہ ہوتا نہ دنیا کا۔ نہ ذہنی اعتبار سے مفید نہ عملی طور پر سودمند۔ قانون اور زندگی کا تعلق، قانون اور دوسرے علوم کا رشتہ، قانون کا جو اثر مہذب زندگی کے بنانے میں ہوا ہے، قانون کی خلاف ورزیاں جو ذاتی، قومی اور بین الاقوامی تعلقات اور کاروبار میں کی

---

[1] یہاں مصنف نے مسودے کے تین صفحے خالی چھوڑ دیئے ہیں۔

جاتی ہیں ان سب چیزوں کا نصاب میں کوئی مقام نہ تھا۔ اور نہ وہ تعلیم طلبہ کو اس قابل بناتی تھی کہ وہ عدالت میں کامیاب وکیل کے طور پر کام کرسکیں۔ وہ کسی طرح قانون کی دفعات یاد کرکے امتحان پاس کر لیتے لیکن اس کے بعد وہ پریکٹس نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں شاید ایک سال کسی تجربہ کار وکیل یا بیرسٹر کے ساتھ شاگرد کے طور پر گذارنا پڑتا۔ اور پھر کئی سال بعد اپنے تجربہ کی بنا پر یا کسی سینئر وکیل کی نگرانی میں رہ کر اس قابل ہوتے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ بعض پروفیسر کلاس روم میں محض نوٹ لکھانے پر اکتفا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم اصرار کرتا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تو تھوڑی سی زبانی تشریح کرتے اور اس کے بعد پھر نوٹ لکھانے میں لگ جاتے۔ بعض استادوں کے یہ نوٹ حقائق ابدی کی طرح بدلتے نہ تھے۔ ایک مرحوم استاد کا قصہ یاد آتا ہے، وہ نوٹ لکھا رہے تھے اور ایک طالب علم جو ان کے بالکل سامنے بیٹھا تھا کچھ نہ لکھ رہا تھا۔ انھوں نے ذرا خفا ہو کر پوچھا تم نوٹ کیوں نہیں لکھتے؟ اس نے جواب دیا جناب لکھ رہا ہوں۔ اب انھوں نے زیادہ ناراضگی سے کہا تم مجھے جھٹلاتے ہو، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔ اس نے کہا نہیں جناب میں سنتا ہوں، اور یہ کہہ کر جو وہ لکھا رہے تھے اس کو فر فر سنا دیا اور کہا کہ آپ چاہیں تو یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کے بعد آپ کیا لکھائیں گے۔ بات یہ تھی کہ اس نے گذشتہ سال کے کسی طالب علم سے کاپی مانگ لی تھی جس میں ان کے نوٹ ہو بہو موجود تھے۔ اس کے بعد انھوں نے میرے سامنے کبھی اس طالب علم سے باز پرس نہیں کی۔

لیکن میں نے یہ تماشا صرف چند ہفتے ہی دیکھا۔ اس زمانے میں حکومت یوپی کی طرف سے چند وظیفوں کا اعلان ہوا جن میں ایک وظیفہ "تعلیم" کے مضمون

کے لئے وقف تھا۔ اس زمانے میں وظیفوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، آج کی سی ریل پیل نہ تھی۔ چند استادوں اور دوستوں کے مشورے سے اور بزرگوں کی رائے لے کر، میں نے بھی درخواست دے دی کچھ عرصہ بعد انٹرویو کی طلبی آگئی اور میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ الہ آباد پہنچ گیا۔ اتفاق سے اسی روز کسی تقریب میں انتخاب کمیٹی کے ایک ممبر سے ملاقات ہوگئی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں وظیفہ کا امیدوار ہوں، میں نے اس سال بی۔ اے۔ پاس کیا ہے تو انھوں نے میری عمر اور "ضخامت" کو دیکھ کر کہا کہ صاحبزادے کمیٹی تم سے تمھاری قابلیت کے بارے میں انٹرویو نہ کرے گی بلکہ یہ پوچھے گی اس نوعمری میں آپ کو ولایت جانے کا شوق کیوں چرایا ہے؟ اس رات کو یہ خیال میرے ذہن کو ستارہا تھا۔ اگلے روز میں ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر میکنزی کے دفتر میں پہنچا۔ انٹرویو ہوا، مختلف قسم کے سوالات کئے گئے۔ جن کا جواب میں نے غالباً تشفی بخش دیا۔ لیکن بالکل آخر میں ایک ممبر نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جس کا مجھے اندیشہ تھا، "تمھیں نہ کوئی تعلیمی تجربہ ہے نہ تم عمر میں دوسرے امیدواروں کے برابر ہو پھر تمھیں تجربہ کار ہیڈ ماسٹروں اور انسپکٹروں کے مقابلے میں کیوں ترجیح دی جائے؟ دفعتہً مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا جواب ذرا "ہلکے پھلکے" انداز میں دینا چاہیئے۔ میں نے کہا "دونوں اعتراض بجا ہیں اور آپ جو چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں اپنی تائید میں آپ کی اجازت سے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ عمر کی کمی ایک ایسا جرم ہے جو عمر کے بڑھنے سے خود ہی معاف ہو جاتا ہے، لہذا میں اس کو زیادہ وقعت نہیں دیتا دوسرا اعتراض زیادہ وقیع ہے۔ لیکن اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہ سوچتا کہ دوسرے امیدوار جو کئی سال کا تجربہ رکھتے ہیں ان کے سوچنے اور پڑھانے کے طریقے ایک حد تک متعین ہو گئے ہیں اور دو سال کی قلیل مدت میں وہ پرانی

عادتوں کو کس حد تک چھوڑ سکیں گے اور نئے اصولوں کو کہاں تک اپنا سکیں گے"!
کمیٹی کے صدر اس جواب کو سُن کر ہنس پڑے اور اپنے ساتھی سے انگریزی میں
کہا کہ "یہاں تو آپ بھی قائل ہو گئے ہوں گے"!

اگلے روز مسٹر میکنزی سے رخصت ہونے ان کے دفتر گیا، اس امید میں کہ
شاید انتخاب کا نتیجہ معلوم ہو جائے۔ نتیجہ تو معلوم نہیں ہوا لیکن ایک لطیفہ ہاتھ آگیا۔
دفتر کے دروازے پر ایک بوڑھا مسلمان جمعدار تعینات تھا جس کی شرعی
داڑھی تھی اور مولویانہ صورت۔ میں نے باادب کہا کہ میں مسٹر میکنزی سے ملنا
چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ پر سر سے پیر تک نظر ڈالی، غالباً یہ فیصلہ کیا کہ میں بضرر
معلوم ہوتا ہوں اور اگر صاحب مجھ سے ملیں تو اس کو اعتراض نہ ہوگا لیکن جواب یہ دیا
کہ "صاحب تو ابھی مس میکریڈی سے مبتلا ہیں جب فارغ ہوں گے اطلاع دوں گا"۔
جب وہ خاتون باہر نکلیں تو میں نے دیکھا کہ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی اور
معلوم اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی لہذا "مبتلا" کے رنگین لفظ سے جو رومانی تعلقات
وابستہ ہو سکتے تھے وہ افسردہ ہو کر رہ گئے۔ جمعدار نے یہ لفظ کہیں سُنا تھا
اس کے ٹھیک معنی اسے معلوم نہ تھے۔ لیکن بڑے لفظ استعمال کرنے کا
شوق تھا۔ لہذا اس کو اپنی بول چال میں شامل کر لیا۔ یہی حال ہمارے تعلیم یافتہ
طبقے کا ہے جو اکثر ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں جس کے صحیح معنی انھیں معلوم
نہیں ہوتے اور بسا اوقات غرض یہ ہوتی ہے کہ سننے والوں کو اپنی قابلیت سے
مرعوب کریں۔ یہ تو "فصاحت و بلاغت" کے پیش پا افتادہ گروں میں شامل
تھا اور غیر زبانوں میں بڑے بڑے نیم مانوس لفظوں کا استعمال عام ہے اس فن
میں مجھے مغربی مفکر، اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ کا قول یاد آتا ہے کہ "کسی شخص کو یہ
حق حاصل نہیں کہ اس کی زبان اس کے خیال سے زیادہ شان دار ہو"۔ کاش ہمارے

لیڈر اور سیاسی رہنما اس مشورہ پر عمل کر سکتے"۔

کچھ عرصے بعد اطلاع ملی کہ اتفاق سے وہ وظیفہ مجھ کو مل گیا اور جلد ہی انگلستان روانہ ہونا پڑے گا۔ دوستوں، عزیزوں، پروفیسروں نے مبارکباد دی اور کئی الوداعی جلسے اور پارٹیاں ہوئیں جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ میرے ایک دوست نے جو شاعری سے شوق فرماتے تھے اور بیخود تخلص فرماتے تھے اس موقع پر چند شعر کہے جو نہ معلوم کیونکر حافظے کے کھلیان میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

ساقیِ خوش کلام زندہ باد   تیرے دم سے تھا میکدہ آباد
کب گوارا مفارقت تیری   کہنا پڑتا ہے با دلِ ناشاد
بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی وباز آئی

مبارکباد دینے والوں کو یہ اندازہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ اس خبر سے میری عزیز ترین ہستی، میری والدہ پر کیا گذرے گی۔ مگر انھوں نے اپنے جذبات کو سب سے چھپایا اور ان کے آنسوؤں کی شورش کسی نے نہ دیکھی، وہ شب کی تنہائی اور تاریکی میں ان کو برساتی رہیں۔ مجھے نہ صرف خوش دلی کے ساتھ اجازت دی بلکہ اصرار کیا کہ ضرور جاؤں۔ "میری جان جس چیز میں تمھارا فائدہ اور نیک نامی ہو اور تم اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بہتر بنا سکو وہی میرے لئے خوشی کا باعث ہوگی"! یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں انگلستان کا سفر اس قدر آسان اور روزمرہ کی چیز نہ تھا جیسا اب ہے اور ہمارے خاندان میں سے کوئی وہاں نہ گیا تھا۔ باقاعدہ خط لکھنے کی فرمائش ضرور کی اور مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے کہ اس دو سال کے عرصے میں کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرا کہ میں نے انھیں خط نہیں بھیجا۔ ایک دفعہ اس کے پہنچنے میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی تو ان کا بہت پریشانی کا تار پہنچا۔ یہ محبتیں ایک حد تک قصّہ پارینہ معلوم ہوتی ہیں اس لئے ان کو یاد کرنا بے محل نہیں، کیسی تسکین بخش، روح پرور تھیں یہ محبتیں!

انگلستان کا سفر

یہ سفر ایک دل چسپ واقعہ سے شروع ہوا جس سے نہ صرف میری بدحواسی ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ اور بھی بعض حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ بمبئی پہنچ کر مجھے اپنا ٹکٹ ٹامس کک کے دفتر سے لینا تھا۔ ٹکٹ تو لے لیا۔ مگر میری اور "دفتر والوں" کی حاضر دماغی کا یہ ثبوت ہے کہ ان سے پاسپورٹ لینا بھول گیا۔ جب سفر ختم ہونے والا تھا تو یہ بات یاد آئی۔ لیکن اب پچھتائے کا ہوت؟ بادلِ پریشان یہ فیصلہ کیا کہ قسمت میں جو بھی لکھا ہے اس کا سامنا کیا جائے! جہاز مارسیلز پہنچا، وہاں پاسپورٹ مانگا گیا تو اشاروں سے (جو فرانسیسی اشارے بھی نہ تھے) سمجھانے کی کوشش اور معذرت کی وہ ان کی خاک سمجھ میں نہ آیا اور مجبور ہو کر انھوں نے ملک سے گذرنے دیا اور جہاں تک میں سمجھ سکا یہ بشارت دی کہ انگلستان پہنچ کر داخلہ میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اس میں کس کافر کو شبہہ تھا؟ انگلش چینل تقریباً ہمیشہ طوفانی رہتا ہے اس لئے راستہ بھر اس قدر دردِ سر اور متلی رہی کہ بار بار ذہن میں یہ خیال آتا کہ بارالٰہا یہ زندگی کیوں دی؟ خدا خدا کر کے یہ پُل صراط عبور کیا اور ڈوور پہنچے تو چہرے کا رنگ مُردوں کا سا تھا۔ اور دل زندگی سے بیزار۔ اب وہ نازک مقام آیا جہاں پاسپورٹ دکھانے پڑتے

ہیں۔ میں نے خود کو پاسپورٹ کے علاوہ اور تمام غیر متعلق ہتھیاروں سے مسلح کر لیا تھا۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری، وظیفہ کا اطلاع نامہ انڈیا آفس کے نام خط جو یونیورسٹی کی طرف سے ملا تھا جب پاسپورٹ مانگا گیا تو ہم نے اپنے خیال میں بڑی روانی کے ساتھ افسر متعلقہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اتفاق سے پاسپورٹ ٹامس کک کے دفتر میں رہ گیا ہے (جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں) اور ہمارے پاس دوسری دستاویزیں موجود ہیں اور گویا یہ وظیفہ کی پیش کش تو شہنشاہ انگلستان کی طرف سے ایک درخواست ہے کہ ان کے ملک کو شرف بخشیں! لیکن اس بندۂ خدا پر ان دلیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ ملک میں پاسپورٹ کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ میرا کہنا تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب نہ تم مجھے یہاں روک سکتے ہو نہ ہندوستان واپس بھیج سکتے ہو۔ اتنے میں دوسرے لوگوں کی لمبی قطار لگ گئی۔ اس نے مجھے ایک طرف ٹھہرنے کو کہا اور باقی مسافروں کو جانے دیا۔ اس کے بعد میرے بارے میں افسروں میں ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی جس میں کچھ فیصلہ نہ ہو پایا۔ پھر میں نے یہ مشورہ دیا کہ ٹیلیفون کر کے انڈیا ہاؤس سے میرے داخلہ کی اجازت لی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہاں سے جواب ملا کہ اس دلے کس بے وقوف (!) طالب علم کو آنے دو۔ میں بمشکل لندن جانے والی ٹرین پکڑ سکا۔ اور میرے ساتھیوں کو تعجب ہوا کہ میں اس مشکل سے کیسے بچ نکلا۔

شروع شروع میں انگلستان کی دنیا مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی۔ بادی النظر میں ہر چیز مختلف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لیڈز کے قیام کے پہلے چند روز میں یہ اجنبیت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ جب پہلی مرتبہ

یونیورسٹی جاتے ہوئے میں نے ایک بلی کو میاؤں کرتے سُنا تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ پہلی آشنا آواز ہے جو کان میں پڑی ہے! ہندوستان میں مجھے انگریزوں سے بہت کم سابقہ پڑا تھا۔ یونیورسٹی میں جو انگریز پروفیسر پڑھاتے تھے وہ عام انگریزوں سے بحیثیت مجموعی مختلف معلوم ہوتے تھے۔ جو لوگ حکومت چلاتے تھے ان کی ذہنیت اور رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ وہی تھا جو ایک حاکم قوم کا بالعموم محکوم قوم کے افراد سے ہوتا ہے اور جو دونوں کو ذلیل کرتا ہے۔ ایک طرف تمرد، برتری کا احساس اور حکومت کا نشہ جو محکوم کی ضرورتوں، تکلیفوں اور عزتِ نفس کی طرف سے انھیں بے حس بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف کمتری کا احساس، خوشامد اور رسوخ پیدا کرنے کے لئے گھٹیا طریقوں کا استعمال یا اس کے بجائے ہر معاملہ میں اپنے کو بہتر سمجھنا اور ماضی کی بے جا پرستش، ان حالات میں لین دین جو زندگی کا معمول ہے اور جس کے ذریعہ اس میں فراوانی پیدا ہوتی ہے، فروغ نہیں پاتا۔ دونوں طرف بعض شریف، معقول اور حق پسند لوگ بھی تھے۔ جن میں اپنی کمزریوں اور دوسرے فریق کی خوبیوں کو بے لاگ پرکھنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن یہ خال خال تھے۔ اس حاکم اور محکوم کے رشتہ کی وجہ سے بیشتر لوگوں کی فطرتیں مسخ ہو جاتی ہیں اور اس کے بدترین پہلو جاگ اُٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے مجھے اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح انگریزوں کی طرف سے ایک بدگمانی تھی۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار تعجب ہوا کہ اپنے دیس میں انگریز ایک مختلف قوم معلوم ہوتے تھے۔ احساسِ برتری تو ان میں بہرحال تھا۔ ایک حد تک دنیا کی تمام دوسری قوموں کے مقابلے میں اور خاص کر ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کے مقابلے میں جہاں انھوں نے زبردستی اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔ ان کے ایک ادیب اور شاعر گولڈ اسمتھ نے تو لکھا تھا

کہ انگریزوں کو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کے حکمراں اور سرتاج میرے سامنے سے گذر رہے ہیں۔ اس مردِ معصوم کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ کس قدر مضحک جذبہ ہے۔ خالقِ کائنات نے کسی قوم کو دوسری قوموں کا حکمراں اور سرتاج نہیں بنایا۔ یہ تو ایک چلتی پھرتی دھوپ ہے جس کا چتر کبھی ایک قوم کے سر پر ہوتا ہے کبھی دوسری قوم کے سر پر۔ کس قدر افضل ہے اس جذبے سے مذہب کی یہ تعلیم کہ کسی فرد یا قوم کو دوسروں پر اپنے رنگ یا نسل یا ذات پات یا دولت کی بنا پر برتری حاصل نہیں بلکہ "تم میں جو زیادہ متقی ہے وہ سب سے افضل ہے . . . ." لیکن باوجود اس احساسِ برتری کے میں نے یہ ضرور دیکھا کہ انگلستان میں ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک اس سے بہتر ہے جیسا وہ ہندوستان میں کرتے ہیں۔ ان کی بعض عادتوں اور قومی خصوصیتوں نے مجھے متاثر کیا۔ مثلاً یہ کہ ان میں قومی ڈسپلن کی روایات زیادہ مستحکم ہیں۔ کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے، خواہ اس کی ہر وقت نگرانی کی جائے یا نہ کی جائے۔ معمول کا کام چلتا رہتا تھا۔ خواہ کسی شخص کو کرسی پر لا کر بٹھا دیا جائے البتہ تخلیقی اور اجتہادی کام کا انحصار تو ہمیشہ کرنے والے کی اپج اور تخیّل پر ہوتا ہے۔ ان میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا، بلکہ بالکل اجنبیوں کی مدد کرنے کا جذبہ بھی زیادہ عام ہے۔ اگر آپ کسی سے راستہ دریافت کریں تو وہ نہ صرف خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دے گا بلکہ ضرورت ہو گی تو خود ساتھ جا کر آپ کو ٹھیک راستہ پر لگا دے گا۔

دوکانوں میں قیمتوں کے بارے میں مول تول، کمی بیشی کا عام طور پر کوئی سوال ہی نہیں (میرے دو سال کے قیام میں صرف ایک مرتبہ ایسا تجربہ

ہوا) نہ دوکان دار قیمت بڑھا کر بیان کرتا نہ خریدار اس کو کم کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر چیز پر قیمت لکھی ہوتی ہے اگر آپ چاہیں تو خرید لیں اور نہ چاہیں تو نہ خریدیں۔ ان کے بارے میں غالباً یہ کہنا صحیح ہے (کم از کم میرے طالب علمی کے زمانے میں تھا) کہ وہ روزمرّہ کے معمولی کاروبار میں بد دیانتی نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص اپنی چھتری، برساتی یا بٹوا بھی موٹر، بس یا ریل میں چھوڑ جائے تو جس شخص کے ہاتھ پڑے گا تو وہ پولیس کے دفتر یا بس کے دفتر یا اگر پتہ معلوم ہوگا تو خود آپ کے پاس پہنچا دے گا۔ (ظاہر ہے کہ اس قاعدے سے پیشہ ور چور اور گرہ کٹ وغیرہ مستثنیٰ ہیں) اس عادت میں کچھ دخل اس بات کا بھی ہے کہ ان کا معیارِ زندگی ہم لوگوں سے زیادہ بلند ہے۔ وہاں تقریباً ہر شخص کے پاس چھتری یا برساتی ہوتی ہے۔ پھر اس کی چوری کیوں کریں؟ غریب ملکوں میں جہاں دیانت داری کی پرانی بنیادیں ہل گئی ہیں، جو کچھ بھی کہیں سے مل جائے اسے غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے جہاں ایک پورے ملک کا، یا کسی بڑے تاجرانہ کاروبار کا، یا کسی کمزور قوم سے معاملہ کرنے کا سوال ہوتا ہے، وہاں بالکل ممکن ہے کہ انگریز اس کو تمام و کمال نگل جائیں اور ڈکار بھی نہ لیں۔ اور لطف یہ کہ جب وہ ایسا کریں گے تب بھی اپنی انصاف پسندی اور اصول پسندی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں گے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ بات صرف انگریزوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بیشتر قوموں کی سیاسی پالیسی اسی قسم کی ہے۔ مغرب کی ساری قومیں اپنے اپنے وقت پر، "بخیال خویش" "سفید فام قوموں کا بوجھ" "سیاہ فام لوگوں" کی خاطر اپنی پشت پر اٹھاتی رہی ہیں۔ گویا دنیا کے بنانے والے نے یہ ذمّہ داری خاص طور پر ان کے کاندھوں پر ڈالی ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ

محض کالے اور سانولے لوگوں کے مفاد میں کرتے ہیں۔ امریکہ کے ایک نامور پریسیڈنٹ وُڈرو وِلسن نے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یا اس کے بعد کہا تھا (کس قدر سادہ لوح اور خوش فہم وخوش عقیدہ تھا وہ) کہ "امریکہ کے بارے میں ایک بہت دل چسپ اور روح افزا بات یہ ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی ایسی چیز نہیں چاہتا جس کو وہ تمام عالمِ انسانیت کے لئے نہ چاہے"۔ البتہ انگریزوں میں، (اور اگر میں زیرِ لب کہہ سکوں تو ہندوستانیوں میں بھی!) تقدس کا دعویٰ کرنے کی عادت دوسری قوموں سے مقابلتاً زیادہ ہی ہے۔

میرا داخلہ لیڈز یونیورسٹی میں طے پایا تھا۔ کچھ اس وجہ سے کہ وظیفہ کا فیصلہ دیر میں ہوا اور اس وقت تک "فیشن ایبل" یونیورسٹیوں میں داخلہ ختم ہو چکا تھا لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ میرا مضمونِ "تعلیم" تھا اور سر مائیکل سیڈلر نے (جن کا نام ہندوستان کی تاریخ میں کافی معروف ہے) اس یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم کو منظم کیا تھا اور اس کی اچھی شہرت تھی۔ لندن میں تین چار روز ٹھہر کر لیڈز پہنچا تو وہاں کسی سے واقفیت نہ تھی۔ اسٹیشن سے نکل کر ٹیکسی والے سے کہا کہ مجھے یونیورسٹی لے چلو لیکن وہ معصوم ہستی "یونیورسٹی" کا لفظ نہ سمجھ سکا۔ پھر اس کو کالج کا حوالہ دیا تو وہ کچھ سمجھا اور مجھے ایک پُرانی سی عمارت کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اب کیا کیا جائے؟ سامان کو ٹیکسی والے کے ایمان کے سپرد کر کے اندر داخل ہوا تو سامنے دیکھا کہ ایک شخص جو لباس اور وضع قطع سے امیرالبحر یا کوئی اسی قسم کا اعلیٰ فوجی افسر معلوم ہوتا تھا کھڑا ہے۔ اس کی طرف ادب سے متوجہ ہوا کیونکہ یہ یقین نہ آسکتا تھا کہ اس جلیل القدر شخصیت کا کوئی تعلق ہال پورٹر کے لفظ سے ہو سکتا ہے جو اس کے کمر کے

ٹکٹ پر لکھا تھا۔ لیکن باوجود اس خوش فہمی کے وہ ہال یورٹر ہی نکلا۔ اور جب میں نے صورتِ حال اس کو سمجھائی تو اس نے چند جگہ ٹیلی فون کر کے میرے قیام کا انتظام ایک لینڈ لیڈی کے ہاں کر دیا۔

اگلے روز داخلہ کا معاملہ درپیش تھا۔ میں صدرِ شعبہ پروفیسر سٹرانگ کے حضور میں پیش ہوا۔ انھوں نے رسمی سی ملاقات کی اور مجھے پروفیسر ویلٹین کے سپرد کر دیا جو بعد میں ایک شفیق و عزیز اُستاد ثابت ہوئے۔ انھوں نے میرے جثہ کو قد و قامت کو دیکھا اور کچھ تامل کے انداز میں کہا کہ تم ابھی بی۔ اے۔ پاس کر کے آئے ہو، تعلیم کا تجربہ نہیں ہے، کیا تم اس بار کو اٹھا سکو گے؟ یہاں تو زیادہ تر ایسے انگریز آتے ہیں طالب علم آتے ہیں جو کئی سال اسکول میں پڑھا چکے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ صرف کوشش کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ بہر حال وہ شروع ہی سے کافی مہربان ہو گئے۔ شاید یہ خیال رہا ہو کہ اس لنگڑی بطخ کو بہر حال پار کرانا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال دور ہو گیا۔ جب انھوں نے پہلی مرتبہ مجھ سے ایک مضمون لکھنے کو کہا تو میں نے کافی مطالعہ کے بعد اور بہت محنت سے اس کو لکھا۔ کئی روز بعد جب کاپی واپس ملی تو دیکھا کہ انھوں نے جا بجا سرخ روشنائی سے حاشیہ پر اور مقابل کے خالی صفحوں پر لمبے لمبے تنقیدی نوٹ لکھے تھے۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی اور جب اگلی مرتبہ ان سے ملا تو باسلوب مناسب میں نے اس کا اظہار کیا۔ مسکرائے اور کہنے لگے "تم سمجھتے ہو کہ میری اس تنقید کا مطلب یہ ہے کہ مضمون اچھا نہیں؟ اگر اچھا نہ ہوتا تو کیا میں اس پر اس قدر وقت صرف کرتا؟ بس کہیں کہیں معمولی غلطیوں پر نشان لگا دیتا۔" اس سے نہ صرف میری ہمت بندھی بلکہ ایک مفید تعلیمی گر بھی ہاتھ آیا جس کو میں نے اپنی معلمی کے زمانے

میں بارہا استعمال کیا۔ سال کے آخر میں جب ڈپلوما کا امتحان ہوا تو خوبیٔ تقدیر سے نظری اور عملی امتحان دونوں میں اوّل پاس ہوا اور اس کامیابی کا خاصا چرچا رہا۔ یونیورسٹی میں اس سے پہلے یہ دوسرا امتیاز صرف ایک طالب علم کو ملا تھا اور وہ بھی اتفاق سے ایک ہندوستانی طالب علم تھا یعنی سلطان محی الدین جو بعد میں ریاست میسور کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے اچھا نام پیدا کیا۔ پروفیسر ولیٹن (اور دوسرے پروفیسروں نے بھی) مجھے بلا کر مبارک باد دی اور ہنس کر کہا کہ میں نے پہلے دن تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم اس بار کو اٹھا سکو گے؟ عملی امتحان میں مجھے جو بہت اچھے نمبر ملے اس کا ایک اتفاقی سبب بھی تھا۔ وہاں یہ طریقہ نہ تھا کہ طالب علم ایک مقررہ وقت پر ممتحنوں کے سامنے دو یا تین سبق پڑھائیں۔ بلکہ وہ اسکول میں دو تین ہفتے تک برابر پڑھاتے رہتے تھے اور اس دوران میں یونیورسٹی کے پروفیسروں یا اسکول کے انسپکٹروں کا جب جی چاہتا آتے اور سبق دیکھ کر چلے جاتے۔ میری جماعت میں جس روز انسپکٹروں کی ٹیم آئی۔ میں انگریزی زبان کا سبق پڑھا رہا تھا جس کا عنوان تھا "ابراہیم لنکن"۔ لنکن کی شخصیت اور کارناموں سے میں بہت متاثر تھا۔ اس کی زندگی کی بابت کئی ڈرامے اور ناول پڑھ چکا تھا۔ سبق کے دوران میں لنکن کا مقابلہ گاندھی سے کیا۔ اس سے طلبہ جنھوں نے کبھی گاندھی کا نام بھی نہ سنا تھا، یا ذکر خیر کے ساتھ نہ سنا تھا کافی متاثر ہوئے۔ اور مجھ سے اس بارے میں سوال پوچھنے شروع کیے جس سے کلاس روم میں ایک ذہنی رونق پیدا ہوگئی اور کمرہ بحث، مباحثہ کی بزم میں تبدیل ہوگیا۔ شاید ممتحن اس علمی فضا سے جو سبق میں پیدا ہوگئی تھی متاثر ہوئے۔ گویا گاندھی جی سے ملاقات

ہونے سے پہلے ان کا ایک احسان مجھ پر یہ تھا کہ انھوں نے عملی امتحان میں مجھے سند امتیاز دلوا دی۔ . . . اگر مجھ میں پیش گوئی کا مادّہ ہوتا تو شاید میں اپنے انگریز طلبہ کو یہ بھی بتا سکتا کہ لنکن کی طرح یہ مہاپُرش بھی ایک قاتل کی گولی کا شکار ہوگا۔

دوسرے سال میں نے ایم۔ ایڈ۔ (ماسٹر آف ایجوکیشن) میں داخلہ لیا۔ اور مقالے کے لئے ایک ذرا مشکل اور بلند آہنگ مضمون کا انتخاب کیا یعنی "یورپ اور امریکہ میں جدید تعلیمی رجحانات!" ریسرچ کے اعتبار سے تو یہ بہت اچھا مضمون نہ تھا۔ لیکن اس سے مجھے ایک فائدہ ہوا، میں نے اس سال بھر میں سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا، بعض پوری بعض نامکمل اور اس کی بدولت تعلیمی مسائل کا جو تعلق زندگی اور اس کے سماجی، اقتصادی سیاسی اور تہذیبی مسائل سے ہے اس میں گہری دل چسپی پیدا ہو گئی اور اس طرح گویا میری آیندہ تعلیمی زندگی اور فکر کی سمت کا تعین ہو گیا۔ اگر میں کسی نفسیاتی یا تعلیمی یا تاریخی یا اصطلاحی مبحث کو پسند کرتا تو شاید ریسرچ کی بہتر صلاحیت پیدا ہوتی۔ اور کیا عجب ہے کہ "عالم" ہونے کا الزام اٹھانا پڑتا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور میں "محقق" ہونے سے بال بال بچ گیا۔ لیکن شاید جو نقصان گہرائی کی کمی سے ہوا اس کی تلافی ایک حد تک اس طرح ہوئی کہ میری دل چسپیوں میں وسعت زیادہ ہو گئی۔ اور علمی حد بندیوں میں نہیں پھنسا۔

میں نے اقلیم معنی میں کسی خاص گوشے کو اپنی میراث نہیں سمجھا۔ بلکہ جہاں کہیں سے اپنے مضمون کے بارے میں روشنی حاصل ہو سکی اس کو کھلے دل اور احترام کے ساتھ قبول کیا۔ اور اس کی مدد سے تعلیمی مسائل کو

سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ "حکمت مومن کی کھوئی پونجی ہے وہ اس کا مستحق ہے خواہ وہ اسے کہیں بھی پائے۔" مومن ہونے کا دعویٰ کرنا تو بہت مشکل ہے۔ لیکن حکمت کو اپنانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ اسی وجہ سے، جیسا میں نے ذکر کیا ہے، میں اپنی دلچسپیوں میں ہمیشہ انتخابیت کا قائل رہا ہوں اور کم از کم فکر و ادب کی دنیا کے بارے میں ایک حد تک کہہ سکتا ہوں کہ ؎

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک

خیر! میں نے ایم۔ایڈ۔ کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔ پروفیسروں کی رائے تھی کہ ایک سال کے لئے اور ٹھہر جاؤ تو پی۔ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری آسانی کے ساتھ مل جائے گی۔ لیکن بعض وجوہ سے اس کا انتظام نہ ہو سکا، اور یہ خیال ترک کر دینا پڑا۔ بہت سال کے بعد امریکہ جانا ہوا تو وہاں ہر کسی نے ڈاکٹر سیدین کہنا شروع کیا۔ اور یہ ڈاکٹری خواہ مخواہ نام کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ اس صورتِ حال پر رحم کھا کر یا اس کے قانونی خطروں کا خیال کر کے علی گڑھ نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری اپنی عنایت سے بخش دی اور اب چاہوں تو حسبِ ضرورت خود کو ڈاکٹر سیدین لکھ سکتا ہوں۔

بچپن اور نوجوانی کے ماحول کے اثر سے جس میں لوگوں سے بے تکلف ملنے جلنے پر پابندیاں تھیں اور باوجود علی گڑھ کے قیام اور تربیت کے، مجھ میں قدرے جو کم آمیزی تھی وہ بہت دیر میں جا کر دور ہوئی۔ شروع میں مجھے لوگوں سے ملنے میں خاصا تامل ہوتا تھا اور اس دیارِ غیر میں یہ بات

اور زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بعض پروفیسروں اور طلبہ سے دوستی اور بے تکلفی کے مراسم قائم ہو گئے جن میں سے بعض اب تک جاری ہیں۔ ان میں سے بعض نے دنیاوی اعتبار سے بڑی ترقی کی اور بعض خاموشی کے ساتھ اپنے پسندیدہ اور چھوٹے چھوٹے کام دیانت داری اور قابلیت سے کرتے رہے۔ مثلاً دوسری قسم کے لوگوں میں ایک دوست نارمن لنگرڈ ورتھ ہیں جو گذشتہ چالیس سال سے زیادہ سے ایک چھوٹے سے اسکول کے صدر مدرس ہیں جن میں وہ خاص کر کے ذہنی لحاظ سے پسماندہ بچوں کو لیتے ہیں۔ وہ جس خلوص محنت اور دانش مندی اور توجہ سے اس اسکول کو چلاتے رہے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اکثر مجھے خیال آیا ہے کہ اگرچہ میں نے ان سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر اور اعلیٰ عہدوں پر کام کیا ہے، لیکن وہ جو اپنی ترازو میں انسانوں کے اعمال کو تولتا ہے، شاید ان کے کام کو زیادہ گراں قدر پائے گا۔ ایک اور ہم عصر ڈاکٹر ڈیوڈ اوون ہیں جو شاید مجلس اقوام کے سکریٹریٹ میں سب سے پہلے ملازم ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ سر سٹیفورڈ کرپس کے سکریٹری تھے اور اب ایک[1] عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں۔ جب ہندوستان آتے ہیں بہت گرمجوشی سے ملتے ہیں۔ ہندوستانی ہم عصروں میں ایک بہت دل چسپ شخصیت یوسف شاہ کی تھی جو جھنگ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ لکھنے پڑھنے میں غیر معمولی طور پر ممتاز نہ تھے۔ لیکن انسان کی حیثیت سے بہت بلند تھے۔ ہوسٹل میں ان کا کمرہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اور ہر کسی کو صلائے عام تھی کہ جس چیز کی ضرورت ہو بغیر ان کی اجازت یا اطلاع کے لے جائے۔ کتابیں، ہیٹ، ٹائی،

---

[1] عہدہ کے نام کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جو معلوم نہ کیا جا سکا۔

سوٹ، کھانے پینے کی چیزیں قفل لگانا وہ انسانیت کی توہین سمجھتے تھے اوران کی نیت کی برکت اور فیض تھا کہ ان کی کوئی چیز شاید ہی گم ہوئی ہو۔ فلسفیانہ بحثوں کا بہت شوق تھا دو سال میرے پڑوسی رہے، شام کو اکثر میرے ہاں آجاتے اور گھنٹوں بیٹھ کر ہر قسم کے موضوع پر گفتگو کرتے رہتے جب میں صریحاً یا اشارتاً کہتا کہ اب رات کے گیارہ بارہ بجنے کا عمل ہے بہتر ہے کہ اب وہ سونے کے فرض کی طرف توجہ کریں تو گھبرا کر گھڑی دیکھتے، پھر میرا منہ دیکھتے، اور یہ طے کرتے کہ اب چلنا چاہیے۔ ان کو پہنچانے کمرے سے باہر جاتا تو پھر کوئی بات شروع کر دیتے اور "بوڑھے ملاح" کی طرح سے میرے اور کوٹ کا ایک بٹن ہاتھ سے پکڑ لیتے اور کبھی کبھی تیس چالیس منٹ تک سردی میں کھڑے باتیں کرتے رہتے۔ میں کہتا یوسف شاہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں چپکے سے اس بٹن کو کاٹ لوں اور چلا جاؤں تو تم اسی طرح کھڑے باتیں کرتے رہو گے۔ تم تو اخفش فلسفی کی طرح ہو جس کی اصلی غرض اظہار خودی ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنا فلسفہ اپنی بکری کے سامنے بیان کر کے بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ بڑا صاف دل، صاف باطن، محبت کا انسان تھا یوسف شاہ! ایسے آدمی عام طور پر زندگی میں کامیاب نہیں ہوتے۔ لیکن اس نے دنیاوی اعتبار سے بھی کافی ترقی کی۔ تعلیم کے میدان میں تو جگہ نہ ملی (ایسے ہیں ہمارے معیارِ انتخاب) لیکن بیرسٹری میں خاصہ نام پیدا کیا، روپیہ کمایا، میونسپل بورڈ کے صدر اور پنجاب اسمبلی کے ممبر رہے۔ اور ہر جگہ نیک نامی سے کام کیا۔ لیکن ان کی شخصیت ان کے کاموں سے زیادہ بلند تھی۔ بے ریا، محبت شعار، ہر قسم کے تعصب سے پاک، ہر آدمی سے انسانیت اور مساوات کا سلوک کا نہ صرف دعویٰ بلکہ اس پر عمل۔ ایک

اور ہم عصر سید نوراللہ تھے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ تحریر اور تقریر دونوں میں کمال حاصل تھا۔ ہر کام اس قدر سرعت کے ساتھ کرتے تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔ جب موت کا پیغام آیا تو اسے بھی نہایت سُرعت کے ساتھ قبول کیا۔ یعنی ایک جلسے میں تقریر کرتے کرتے سر جُھک گیا اور اپنے مالک سے جا ملے۔ ایک اور دوست ڈاکٹر جے ناتھ کاک تھے۔ جو میڈیکل کالج میں تعلیم پاتے تھے لیکن تعلیم کو جلد ختم کرنے کے قائل نہ تھے۔ ہندوستانی طلبہ میں سب سے سینئر تھے۔ ہاکی اور کرکٹ دونوں بہت اچھی کھیلتے تھے اور بیک وقت دونوں کے کپتان تھے۔ استادوں اور طلبہ خصوصاً لڑکیوں میں بہت مقبول تھے۔ اب الہ آباد میں پریکٹس کرتے ہیں اور باوجود اپنی اصول پسندی اور معیار پرستی کے نہ صرف نیک نام ہیں بلکہ کامیاب بھی۔

انگلستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کی طرح لیڈز میں بھی مردوں اور عورتوں کی مشترک تعلیم ہوتی تھی۔ اور چونکہ معلموں میں عورتوں کا بڑا تناسب تھا۔ اس لئے شعبۂ تعلیم میں مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ مجھے ابتدا میں ہندوستانی روایات اور ماحول کے اثر کی وجہ سے، ان سے ملنے میں کافی جھجک ہوتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ایک دستور تھا کہ شہر کے بعض اچھے گھرانے، جن میں زیادہ تر مذہبی خیال کے لوگ تھے، اتوار کے روز غیر ملکی طلبہ کو اپنے ہاں چائے یا کھانے پر مدعو کرتے تھے تاکہ انھیں یونیورسٹی سے باہر انگریزوں سے ملنے کا موقع ملے اور ان کی اجنبیت دور ہو جائے۔ اس طرح میری اور میرے ساتھیوں کی کچھ اچھے اور شریف لوگوں سے ملاقات ہو گئی جن کا رویہ عام طور پر غیر ملکی طلبہ کی طرف سے دوستانہ ہوتا تھا۔ اور ان کے میل جول میں بظاہر کسی احساسِ برتری کا شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔ ان میں خاندان کی عورتیں پیش پیش ہوتی

تھیں۔ اور کوشش کرتیں کہ ان مہمانوں میں اجنبیت کی وجہ سے جو ہچکچاہٹ ہے وہ دور ہو جائے۔ اس طرح مجھ میں کسی حد تک عورتوں سے ملاقات اور گفتگو کا سلیقہ پیدا ہو گیا۔

تعلیم کے دوران میں نے کوشش کی کہ حتی الامکان یونیورسٹی کی نیم نصابی تحریکوں اور دلچسپیوں میں بھی پوری طرح حصّہ لوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی کی "نقلی پارلیمنٹ" کا مجھے دوسرے سال پرائم منسٹر چنا گیا۔ ایک مرتبہ مجھے "ڈائی کاونٹ کرزن" سے یونیورسٹی یونین میں بحث کرنے کا موقع ملا جس کا موضوع تھا "ہندوستان کی آزادی" وہ گویا ایک قولِ فیصل کہنے آئے تھے لیکن اتفاق سے یونین نے بہت بڑی کثرتِ رائے سے میرے ساتھ اتفاق کیا اور کرزن صاحب بیک بینی و دوگوش واپس سدھارے۔ اس بحث کا انگلستان و ہندوستان کے اخباروں میں خاصا چرچا ہوا۔ ایک دفعہ یونیورسٹی میں جیمز ایل رائے فلیکر کا ڈراما "حسن" جس کی کوئی خاص ادبی اہمیت نہیں ہے، سٹیج کیا گیا۔ اس میں "حسن" کے پارٹ کا قرعہ فال مجھ دیوانے کے نام پڑا۔ اس کی تفصیلات تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ایک مقام پر خلیفہ ہارون رشید کی جلو میں "حسن" کو ایک ٹوکرے میں بٹھا کر کھڑکی کے ذریعہ مکان کی اوپری منزل میں کھینچا جاتا ہے اور اس کا دل اس وقت ہچکولے کھاتا رہتا ہے کہ رسّی ٹوٹ جائے گی تو کیا ہو گا؟ اس کا ایک فقرہ آج تک ذہن میں محفوظ ہے:۔ "AND SO WILL YOUR BLOOD FALL,-- DROP BY DROP, DROP BY DROP, AND PAINT THE LILIES OF THE CARPET RED-"

اس جملہ کو رک رک کر ایک ایک لفظ کو الگ کر کے بولنا پڑتا تھا۔ جیسے

دراصل اس خون کے قطرے آہستہ آہستہ گر رہے ہوں۔ انسان کا حافظہ بھی عجیب چیز ہے، کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا چیز اس میں جم جائے گی اور کیا چیز بہہ کر نکل جائے گی۔

لیڈز کے قیام کے دوران میں (یاد نہیں پڑتا کس تقریب سے) ایک دفعہ دو روز کے لئے خلیفہ عبدالحکیم تشریف لائے وہ غالباً اس زمانے میں جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہے تھے۔ ہندوستانی طلبہ نے ان کا سواگت کیا ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ ہم لوگوں کو ان کے طرزِ عمل سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کی خواہش ہے کہ ان سے ایک نامور پروفیسر کا سا سلوک کیا جائے اور ہم سب نیاز مند طلبہ کا پارٹ ادا کریں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ وہ بہت خوش ہوگئے اور جاتے ہوئے کہا کہ میں نے انگلستان کی کسی اور یونیورسٹی میں ایسے مہذب اور خوش مذاق طلبہ نہیں دیکھے۔ بڑے ذہین، طباع، خوش فکر آدمی تھے۔ ان سے بعد میں کافی سابقہ پڑا خصوصاً جب وہ میری ڈائرکٹری کے زمانے میں سری پرتاب کالج کے پرنسپل رہے۔ بعد میں پاکستان چلے گئے اور بحیثیت ایک مفکر کے کافی شہرت پائی۔ جرمنی میں میرے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا (جو عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور رجسٹرار ہوئے) تعلیم پاتے تھے۔ ان سے برلن میں جا کر ملاقات ہوئی۔ اور وہاں بہت اچھا وقت گزرا۔ ۱۹۲۵ء میں چند روز کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین لیڈز تشریف لائے اور وہاں بعض ہندوستانی اور انگریز طلبہ سے ملاقات ہوئی۔ ان کا معاملہ وہاں بھی وہی تھا جو زندگی بھر رہا۔ یعنی "وہ آئے، انھوں نے ایک نظر دیکھا اور سب کا دل جیت لیا"۔

اس وقت ان سے ملنے کے بعد جے ناتھ۔ کاک نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا: "یہ ایک روز قومی زندگی میں اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچیں گے۔" پہنچے اور اس انداز سے کہ:-

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اور پھر کوئی پینتالیس سال بعد ایک منحوس دن پانچ منٹ کے اندر اندر شاید اِنہیں سہمے ہوئے فرشتوں کی نظر انھیں کھا گئی۔

میرے ہم عصروں میں انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں بعض اور عزیز دوست یا ملاقاتی زیرِ تعلیم تھے جنھوں نے اپنے اپنے خاص میدان میں کافی نام پیدا کیا۔ نواب علی یاور جنگ جو ایک خوش مذاق، خود اعتماد اور قابل آدمی ہیں۔ حیدر آباد کے تعلیمی اور انتظامی محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ کئی ملکوں میں ہندوستان کے سفیر رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بڑے چاؤ سے قبول کی، لیکن بعض ناگوار واقعات کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ اب امریکہ میں ہندوستان کے سفیر ہیں۔ خواجہ سرور حسین نے جو میرے عزیز ہوتے ہیں، کیمبرج سے قانون اور لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ میں کئی سال تک پریکٹس کرنے کے بعد دہلی آئے اور یہاں لاڈیپارٹمنٹ میں لکچرر ہو گئے۔ علی گڑھ میں بحیثیت مقرر کے ان کی بڑی شہرت تھی۔ کبھی مجمع سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اور اپنے نقطۂ نظر پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت پاکستان چلے گئے۔ وہ وہاں کی "کونسل آف ورلڈ افیئرز" کے سکریٹری

جنرل ہیں اور پاکستان کے دستور پر ایک مستند کتاب کے مصنف۔ آغا سید ابراہیم کے چھوٹے بھائی آغا سید اسحاق ایک غیر معمولی طور پر ذہین، بذلہ سنج، رونق محفل اور ہونہار طالب علم تھے۔ ان کی قابلیت سے امید بندھتی تھی وہ علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کریں گے۔ لیکن کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ انسان کی زندگی کیا راستہ اختیار کرے گی۔ چند سال عثمانیہ یونیورسٹی میں معلمی کرنے کے بعد ان کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بھائی کی طرح انھوں نے بھی ایک طرح سے دنیا کو خیرباد کہا اور آروبندو آشرم میں جا بسے۔ مدتوں بعد چند سال ہوئے ان سے آشرم میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے لئے یہ کام چنا ہے کہ باورچی خانہ کے لئے جو ترکاری آتی ہے اس کو کاٹیں۔ میں نے ان کے بعض دوستوں سے پوچھا کہ کیا یہ انسانی قابلیت کی توہین نہیں کہ انگریزی زبان کے ایک قابل ادیب اور پروفیسر کو آلو چھیلنے کے کام پر لگا یا جائے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اگر ان کو اس کام کے کرنے میں اظہارِ خودی کا لطف ملتا ہے تو ہم اس پر اعتراض کرنے والے کون؟ اس کا کوئی خاطر خواہ جواب میں نہ دے سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی ذات اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہے کہ اس کو پوری طرح سمجھنا در اصل ناممکن ہے۔

انگلستان کے قیام کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ لندن میں پنڈت جواہر لال نہرو کا دیدار نصیب ہوا۔ وہ انڈیا لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسے میں تقریر کرنے والے تھے۔ معلوم ہوا تو میں بھی وہاں پہنچا۔ وہ اس وقت روس یاترا سے لوٹے تھے اور روس کے سیاسی اور معاشی انقلاب سے بہت متاثر تھے۔ بہت اچھی تقریر کی اور وہاں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا بہت جوش کے ساتھ ذکر کیا اس کے بعد سوالات ہونے لگے۔ میری جو شامت آئی تو پوچھ بیٹھا کہ اگر یہ سب باتیں

اس قدر جلد ہوگئی ہیں تو وہاں گویا جنت ارضی بن گئی ہوگی۔ ان کا جواب تو ٹھیک یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ پنڈت جی نے کچھ سخت جواب دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں تمھاری جنت کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ میری ذہنی ساخت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اگر کوئی کسی چیز کی تعریف یا مذمت میں غلو کرتا ہے (یا کم ازکم مجھے وہ غلو معلوم ہوتا ہے) تو مجھ میں احتجاج کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی عادتاً غلو نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کی ایک بڑی حسین کمزوری یہ تھی، جو دراصل ان کی ذہنی دیانت داری تھی کہ ان کو ہر معاملے کے دونوں بلکہ کئی پہلو بیک وقت نظر آتے تھے لیکن جو لوگ اپنے فکر و بیان میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں وہ انصاف اور غیر جانب داری کی حدوں سے باہر نکل جاتے ہیں، ان کے ساتھ میرے لئے اتفاقِ رائے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی کمیونسٹ اس بات کا دعویٰ کرے کہ روس یا کسی دوسرے سوشلسٹ ملک میں ہر چیز مکمل ہے، وہاں غیر معمولی علمی یا عملی اور آرٹ کی ترقی کے علاوہ پوری ذہنی آزادی بھی حاصل ہے تو میرا قدرتی ردِ عمل یہ ہوگا کہ وہاں جو کمزوریاں اور نقص ہیں اس کو اس طرف توجہ دلاؤں۔ یا اگر کوئی کانگریسی صرف اپنی حکومت کے کارناموں کو اجاگر کر کے دکھائے اور ان کی غلطیوں اور ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے تو میں اس کو تصویر کے تاریک پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ لیکن اگر کوئی شخص کمیونسٹ یا کانگریسی حکومت میں خرابیاں ہی خرابیاں دیکھے اور ان کی خوبیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلے تو میری خواہش ہوگی کہ اس کے روشن پہلو کو اجاگر کروں۔ میرے لئے سخن فہم بننا ممکن ہے صرف غالب کی طرف داری میرے بس کی بات نہیں۔ اس وجہ سے اگر میں سیاست کا پیشہ اختیار کرتا تو اس میں ناکامیاب ہوتا۔ یا کیا

معلوم دوسرے بعض مشاہیر کی طرح اپنی طبیعت کو ایک دوسرے قالب میں ڈھال لیتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ عدل دوسروں کے معاملات میں اور بے لاگ احتساب اپنے معاملات میں، ایسی قدریں ہیں جن کو کسی داموں بیچا نہیں جاسکتا کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ اپنی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھا کر زندگی کو اس طرح دیکھے کہ اسے صرف ایک ہی رنگ نظر آئے باقی سب رنگ چھپ جائیں۔

اس دوران میں میں نے ہندوستانی طلبہ کی کئی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ یہ عموماً جاڑے کے موسم میں "ایسٹ بورن" یا "بورن متھ" میں منعقد ہوتی تھیں۔ علاوہ ہندوستانی طلبہ کے اس میں بعض انگریز طلبہ اور دوسرے غیر ملکی طلبہ کو بھی بلایا جاتا تھا اور چند روز تک چہل پہل رہتی تھی۔ وہاں بھی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ خود کو دوسری نسبتاً جدید یونیورسٹیوں کے طلبہ کے مقابلے میں برتر سمجھتے تھے۔ دوسرے طلبہ کے ساتھ ذرا مربیانہ برتاؤ کرتے اور ایک خاص لہجے سے بولتے تاکہ کسی کو اس بارے میں شبہہ نہ رہے کہ وہ بلند مرتبہ یونیورسٹی سے آئے ہیں (اس میں کبھی کبھی مستثنیٰ صورتیں بھی ہوتیں) لیکن اپنی بے حسی کی وجہ سے مجھ میں اس سلوک سے کوئی احساس کمتری پیدا نہیں ہوا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے فرانس، سوئٹزرلینڈ جرمنی وغیرہ کی سیر کی۔ تھوڑی سی فرانسیسی زبان بھی سیکھی جو بعد میں فرانس میں خصوصاً یونسکو کی کانفرنسوں میں مفید ثابت ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مختصر مدت میں نہ تو ان ملکوں کو اچھی طرح دیکھ سکا نہ لوگوں کی سیرت اور مزاج سے پوری طرح واقف ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ شروع میں اجنبیت کا جو احساس تھا وہ کم ہو گیا اور یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ بہت سے اختلافات، جو بظاہر

اہم معلوم ہوتے ہیں، دراصل سطحی ہیں۔ اور انسانوں میں مشترک اقدار نہ صرف زیادہ ہیں بلکہ وہی بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس وقت، جیسا میں نے کہا یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا تھا۔ زندگی جیسے جیسے گذرتی گئی یہ زیادہ مستحکم ہوتا گیا۔ جوں جوں چہرے سے نقاب اٹھتی جاتی ہے اور آنکھوں کی چکا چوند کم ہوتی ہے ایک چہرہ دیکھا بھالا معلوم ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات محبوب کے چہرے کے بارے میں نہ کہی جا سکے۔ کیونکہ اس کے متعلق تو غالب کا قول ہے "نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا"۔ لیکن عام انسانوں کے بارے میں میرا تجربہ یہی ہے اور صرف میرا ہی تجربہ نہیں بلکہ بہت سے لوگوں نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ جرمنی کے ایک مصنف نووالس نے لکھا کہ "سائس کے مندر میں ایک دفعہ ایک شخص نے دیوی کی نقاب کو اٹھا کر دیکھا تو اُسے کس قدر حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ وہاں وہ خود چھپا ہوا تھا!"...... وہی شرافت اور رزالت، دیا اور اتیا چار، دیانت داری اور بد دیانتی، امن دوستی اور جنگ دوستی، فرشتوں سے بازی لے جانے کی آرزو اور شیطان کو ہرا دینے کا حوصلہ" یہ اور اس قسم کے دوسرے تضاد نہ صرف مختلف قوموں اور افراد میں پائے جاتے ہیں بلکہ بعض دفعہ مختلف حالات اور موقعوں پر ایک ہی شخص کی ذات اور اعمال میں ان کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ کیا ہم نے خود اپنے ملک میں تقسیم ہند کے موقع پر اس حقیقت کے روشن اور بھیانک پہلوؤں کو نہیں دیکھا؟ اور اب بھی وقتاً فوقتاً اس کے مظاہرے ہمارے تجربے میں نہیں آتے؟ اس انسانی "وحدت" کے احساس سے خواہ وہ اچھی باتوں میں ہو یا بُری باتوں میں، ہم میں احتسابِ نفس کا بلکہ عجز و انکسار کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ خود کو غیر ضروری اہمیت دینا یا دوسروں کے مقابلے میں برتر سمجھنا، محض اس وجہ سے کہ ہم ہم ہیں اور وہ، وہ ہیں

کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اس "انا" کے بت کو توڑنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے بغیر اچھی زندگی کی بنیاد رکھنا ناممکن ہے۔ انگلستان سے روانہ ہونے سے چند ہفتے پہلے میں نے خواجہ سجاد حسین کو ایک خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ جوں جوں میں دنیا کو دیکھتا ہوں اپنی ذات کے بارے میں میرا انکسار کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے کسی کارنامے کے بارے میں فخر کرنا بڑی گھٹیا بات ہے۔ دنیا میں بے شمار انسان ایسے ہیں جن کے کاموں کے مقابلے میں اپنے کام کی کوئی بھی اہمیت نہیں۔ جب میں ہندوستان واپس آیا تو مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انھوں نے میرے تمام خطوں میں سے اس جملہ کو پسند کیا تھا اور اس کی داد دی۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ہے اور میں نے حتی الامکان کبھی اس کو نظر انداز نہیں کیا۔ عام طور پر مطالعہ اور زیادہ خیالات کی بدولت اور خاص کر اقبال کی شاعری اور فکر سے متاثر ہو کر میں نے خودی کی اہمیت اور عظمت کو پہچانا۔ لیکن کبھی اس کو خود پسندی کا بہانہ نہیں بنایا۔ کم سے کم عمداً نہیں۔ کبھی یہ شبہہ نہیں پیدا ہوا کہ جب اقبال نے کہا تھا کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو اس کا یہ مطلب تھا کہ خدا آ کر میرے دروازے پر دستک دے گا اور مجھ سے ذاتی طور پر پوچھے گا کہ اے میرے خاص بندے جس کا نام سیدین ہے تیری اس معاملے میں کیا رائے ہے؟

شاید اسی وجہ سے غیر شعوری یا شعوری طور پر بھی میرے نزدیک کمال کی منزل اس مقام سے شروع ہوتی ہے جس سے آگے میرے پروں کو اڑنے کا یارا نہ ہو جہاں تک پہنچ جائیں وہ مقام کمال نہیں ہو سکتا (یعنی مطلق "کمال" نہیں ویسے تو ہر شخص کے لئے اس کی صلاحیت کے مطابق ایک کمال کی منزل ہوتی ہے۔

جس تک پہنچنے کی کوشش کرنا اس کا فرض ہے) اس کا نتیجہ ہے کہ میں دوسروں کے دعائے کمال کا احتساب بھی کسی قدر سختی کے ساتھ کرتا ہوں اور ہر مدعیِ کمال کے دعوے کو قبول کر لینا میرے بس کی بات نہیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ انسان کا دل نرم ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے ہم جنسوں پر حکم لگانے میں سختی اور ادّعا کو دخل نہ دے لیکن اس کا دماغ "سخت" ہونا چاہئے تاکہ وہ ان کی صلاحیت اور کارکردگی کا ٹھیک اندازہ لگا سکے۔

میرا ایم۔ایڈ۔ کا نتیجہ ابھی نکلا ہی تھا کہ مجھے علی گڑھ کے وائس چانسلر آفتاب احمد خاں کا تار ملا کہ یونیورسٹی علی گڑھ ٹریننگ کالج کی پرنسپلی پیش کرتی ہے۔ منظوری سے مطلع کرو۔ وہ میرے والد اور دوسرے بزرگوں سے بخوبی واقف تھے۔ لندن میں جب وہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر تھے تو ان سے چند مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے لئے مناسب لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ یہ پیشکش نہ صرف میرے لئے بہت عزت افزائی کا باعث تھی بلکہ خلافِ توقع بھی تھی۔ کیونکہ میں نے اس کے لئے درخواست نہیں دی تھی میں نے گھر والوں سے مشورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ اس دعوت کو قبول کر لوں البتہ یہ جھجک محسوس ہوتی تھی کہ میں جو ابھی اپنی تعلیم سے فارغ ہوا ہوں (گویا کوئی کبھی تعلیم سے "فارغ" بھی ہو سکتا ہے) اس بار کو اٹھا سکوں گا یا نہیں۔ لیکن شاید مصلحت یہی ہے کہ انسان آیندہ راستے کی آزمائشوں اور صعوبتوں سے ناواقف رہے ورنہ ممکن ہے سفر سے پہلے ہی اس کی ہمت پست ہو جائے! بہر حال میں نے ارادہ کیا کہ اس فرض کی ذمہ داریوں کو بساط بھر اچھی طرح ادا کروں گا۔ اور اس وقت یہی خیال تھا کہ یہی عمر بھر کا کام ہے اور زندگی علی گڑھ ہی میں ختم ہو گی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس سے پہلے تقرر سے لے کر میرے آخری تقرر تک جب مجھے کشمیر میں تعلیمات

کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ میں نے کبھی کسی اسامی کے لئے از خود درخواست نہیں دی۔ ہر موقع پر جگہ پیش کی گئی جس کو میں نے قبول کیا یا بہت دفعہ نہیں کیا، جس میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چار پانچ صوبوں کی ڈائرکٹری بھی شامل ہے) ہاں ایک مرتبہ ابتدا میں بمبئی کی انسپکٹری تعلیمات کے لئے درخواست دی تھی لیکن جب انٹرویو کا بلاوا آیا تو خیال ہوا کہ "کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر" اور نہ آنے کی معذرت کر دی۔ لیکن چونکہ قسمت کو بمبئی بلانا منظور تھا، اس لئے بہت سال کے بعد وہاں کے چیف منسٹر بی۔ جی۔ کھیر کی دعوت پر تین سال وہاں گذارے۔

وطن کو واپسی

ہندوستان پہنچا اور عزیزوں دوستوں سے ملاقات ہوئی (کسی روح پرور تھی یہ ملاقاتِ محبت) تو میرے بارے میں ایک دلچسپ رائے کا اظہار کیا گیا۔ بعض نے تنقیدی انداز میں بعض نے تعریفی انداز میں "تم جیسے گئے تھے بالکل ویسے ہی واپس آئے"۔ اس ریمارک کی شانِ نزول یہ تھی کہ اس وقت تک بالعموم جو طلبا مغرب سے تعلیم پا کر واپس آتے ان کی بات چیت اور برتاؤ سے یہ ظاہر ہوتا جیسے اپنی ہندوستانی تہذیب اور روایات سے خاصے کٹ گئے ہوں۔ اور خود کو حکمران قوم کا (ایک کم درجے کا) ممبر سمجھنے لگے ہیں۔ یہ رجحان میرے آنے تک ذرا کم ہو چلا تھا۔ بلکہ سیاسی بیداری کی وجہ سے بعض طلبا انگریزوں کی مخالفت کی ذہنیت لے کر واپس آنے لگے تھے لیکن اس وقت ان سے بیشتر کے لباس انداز گفتگو اور نشست برخاست میں مغربیت کی ذہنیت کا مبالغہ آمیز اظہار ہوتا تھا۔ میں واپس آیا تو اچکن پہنتا، بجائے "ہلو ممی" اور "ہلو انکل" کہنے کے اپنے بزرگوں سے معمول کے مطابق خطاب کرتا، اردو بولتا۔ تمام لوگوں سے بات چیت کو خلاف شان نہ سمجھتا۔ اور یہ چیزیں لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی میں نے اپنے عہدے کا چارج نہیں لیا تھا کہ خبر ملی کہ ایم اے او

کالج علی گڑھ کی پچاس سالہ جوبلی دسمبر ۱۹۲۵ عیسوی میں منائی جائے گی۔ اس کا ایک بہت بڑا پروگرام بنایا گیا جس میں ایک اہم مدیونین کی جوبلی ڈبیٹ تھی۔ مجھے دعوت دی گئی کہ بحیثیت یونین کے سابق نائب صدر اور ایک (نام نہاد) نمایاں مقرر کے اس بحث کا آغاز کروں۔ مضمون زیر بحث کچھ اس قسم کا تھا...... ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ دوسرے تمام فرقوں کے قوم پرستوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ اور جنگ آزادی میں کھلے دل سے شریک ہوں۔ اس مقصد کے لئے انہیں اپنا ایک علیحدہ پلیٹ فارم بنانا ضروری نہیں۔ جوبلی کے وسیع و عریض شامیانہ میں رات کو آٹھ بجے اس تاریخی بحث کا آغاز ہوا تھا۔ طلبہ، ممبران اسٹاف اور مقامی و بیرونی مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنی تقریر کو خاصے اہتمام سے تیار کیا تھا۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں جو دلیلیں دی جا سکتی تھیں ان کو مضبوطی اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ کیوں کہ میں جو کہہ رہا تھا وہی میرا عقیدہ بھی تھا۔ اور بظاہر حاضرین اس سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ایک سٹاف کے ممبر نے جو ذرا الغربہ خواہ مخواہ مرد آدمی، واقع ہوئے تھے (جسمانی لحاظ سے بھی اور ایک معنی میں دماغی لحاظ سے بھی) اس تحریک کی مخالفت میں تقریر کی۔ اور کہا کہ اس طریقۂ کار میں مسلمانوں کے لئے کوئی فلاح نہیں۔ انہیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنانی چاہیئے، اور میں کہ ابھی انگلستان سے لوٹا تھا، اور ملک کے حالات سے بے خبر تھا، ناواقفیت کے اعتماد کے ساتھ اظہار خیال کر رہا تھا۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ جس قدر باہر کے مشاہیر موجود تھے جن میں سر علی امام، محمد علی جناح، آغا خاں، غالباً بہار کے مولوی محمد شفیع داؤدی، وغیرہ عمائدین وقت شامل تھے۔ سب نے میری مخالفت

میں تقریر کی اور کہا کہ مسلمانوں کو سیاست میں اپنا راستہ الگ بنانا چاہئے
میں بیٹھا نوٹ لیتا رہا اور دل ڈوبتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب میری شکست
لازمی ہے، کیوں کہ ایک بھی تقریر میری حمایت میں نہیں کی گئی۔ جب مجھے یونین
کے دستور کے مطابق آخری جوابی تقریر کا موقع دیا گیا تو میں نے سوچا کہ انجام
تو ظاہر ہی ہے (لیکن بقول ایک ناکارہ سے فلمی گیت کے) جب عشق کیا تو
ڈرنا کیا؟ اور یہ طے کیا کہ بجائے ہر دلیل پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کرنے کے
جس میں رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب سامعین کے اکتا جانے
کا اندیشہ بھی تھا۔ کالج کے لڑکوں کی سی فقرہ بازی سے کام لیا جائے۔
چنانچہ میں نے سب تقریروں پر ادب کے ساتھ مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا۔
یاد پڑتا ہے کہ اپنے مخالف پروفیسر صاحب کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ
وہ سارے وقت خیالی انڈوں کو ایک بھاری گرز سے توڑنے کی کوشش
اور وہ بھی ناکام کوشش کرتے رہے ہیں۔ شاید تبصرہ کا انداز اور مقرر کی
یہ ناقابلِ معافی جراَتِ رندانہ سامعین کو پسند آئی۔ آخر میں جو بنیادی بات
تھی اس کو میں نے سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ پیش کیا۔ وہ یہ تھی کہ الگ
الگ کیمپ بنا کر کام کرنے سے کسی قوم کو مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ نہیں...
آتا اس لئے فریقین میں مفاہمت بھی پیدا نہیں ہوتی جو اشتراکِ عمل کا ثمر
ہے بلکہ ذہنیت بھی علیحدگی پسند ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر ہمیں واقعتاً
اپنے ملک کے مستقبل کو سنوارنا اور آزادی کی جنگ جیتنا ہے تو سب جماعتوں
کو اس کے لئے دوش بدوش جدوجہد کرنی اور قربانیاں دینی چاہئیں۔ اس
بحث کا انجام کیا ہوا یہ خواجہ احمد عباس کی زبانی سن لیجئے جنھوں نے
تقریباً چالیس سال بعد ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا تھا جو انھوں نے

میری ساٹھویں سالگرہ کی تہنیت کے طور پر جو کتاب شائع ہوئی تھی اس کے لئے لکھا تھا۔ ان کو میرے بارے میں جو خوش فہمی ہے اس کو نظر انداز کر دیجئے:۔

"میرے بچپن کا ایک یادگار واقعہ جس نے میرے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا وہ بحث ہے جو ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر ہوئی تھی۔ یہ کالج اب یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے تقریباً تمام نامور لیڈر وہاں موجود تھے۔ سیدین اس وقت اعلیٰ تعلیمی کامیابی حاصل کر کے انگلستان سے لوٹے تھے۔ ان کو اس موقع پر یہ اعزاز دیا گیا کہ وہ یونین میں اس بحث کا افتتاح کریں۔ اس لئے انھوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا تھا جو اب چالیس سال بعد بھی مسلمانوں کے لئے ایسی ہی اہمیت رکھتا ہے جس قدر اُس وقت .... انھوں نے شروع میں ایک مختصر مگر مدلّل تقریر کی اس کے بعد تقریروں کا ایک سیلاب شروع ہوا جس میں مسلمانوں کے اُس وقت کے تقریباً سب بڑے بڑے لیڈر شریک تھے۔ محمد علی جناح، آغا خاں، سر علی امام وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ گویا ایک پہلوان تھا۔ انھوں نے زوردار تقریریں کیں اور نوجوان مقرر کی دلیلوں کو سرپرستانہ انداز میں یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ نوجوانی کی عین پسندی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سیدین اس وقت ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تیزی کے ساتھ نوٹ لے رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کی وزنی اور باوقار آوازوں سے کافی مرعوب ہیں۔ پھر وہ

وقت آیا جب وہ بحث کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں اس وقت اتنا کم عمر تھا کہ ان کی دلیلوں کا پورا مطلب تو نہیں سمجھ سکا (شاید یہی عباس کے متاثر ہونے کی وجہ ہوگی!) لیکن ایک گیارہ سالہ طالب علم بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ ان کی فصاحت اور زورِ بیان میں کس قدر خلوص اور جذبہ بھرا ہوا ہے۔ اس تقریر کی چوٹ غالباً میرے تحت الشعور پر بہت کاری لگی۔ کیونکہ اس کے بعد کبھی فرقہ پرستوں کے جذباتی دلائل نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ اگر زندگی کا سیکولر اور انسانیت دوستی کا نظریہ میرے عقیدے کا ایک اٹل جزو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے اس تقریر پر ہے اور اس کے بعد ان چند سالوں پر جو میں نے بعد میں اپنی اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران میں سیدین کی نگرانی میں بسر کئے۔ شاید انھیں کے اثر سے میرا علمی تجسس بیدار ہوا اور میں نے ادب، ڈرامہ اور آرٹ میں دلچسپی لینی شروع کی (اس ضمن میں آرٹ کا ذکر بھی زیادہ تر عباس کی خوش فہمی ہے)...... ہاں تو بحث کا انجام یہ ہوا کہ اپنے دلائل کی مضبوطی اور زورِ بیان کی ترغیب سے ان کے تمام مخالفین کو شکست ہوئی۔ اور مجمع نے بہت بڑی اکثریت سے سیدین کی رائے سے اتفاق کیا......"

اس بحث کا ذکر میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس وجہ سے کیا کہ یہ گویا میری طالب علمی اور معلمی کے درمیان ایک حد فاصل تھی۔ میرا

انتخاب شعبہ تعلیم میں ریڈر کی حیثیت سے ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تقرر نہ ہوا تھا۔ اور میں گویا دو دنیاؤں کے بیچ میں معلق تھا جن میں اس وقت بہت فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس بحث کا اخباروں وغیرہ میں کافی چرچا رہا اور میں نے اپنی معلمی کا آغاز ایک سازگار ماحول اور سازگار تاروں کی چھاؤں میں کیا۔ علی گڑھ کے تمام پرانے استادوں اور بیشتر طالب علموں سے تو پہلے ہی سے ملاقات تھی اور اس بحث کے طفیل نئے استادوں سے اور بہت سے نامور لیڈروں سے بھی شناسائی ہو گئی۔

شناسائی تو ہو گئی مگر اب دل میں یہ دگدا تھی کہ میں ان گریجویٹ طلبہ کو پڑھانے کا کام بخوبی کر سکوں گا یا نہیں؟ استادوں کے کالج کو جو بہت ابتدائی اور نامکمل حالت میں تھا، یونیورسٹی کے شایان شان کس طرح بناؤں گا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیسی گذرے گی۔ یہ سوال دل میں اٹھتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھروسہ تھا کہ میری طبیعت میں کسی سے بے جا مخالفت یا کسی سے لڑائی کرنے کی صلاحیت نہیں۔ اگر ان کے ساتھ مناسب سلوک کروں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی میرے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں اور بہر حال ان کو بھی میری طرح یہ خواہش ہوگی کہ وہ اس کالج یا یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ درس گاہ بنائیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۶ء

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہِ مجریہا و مرسٰہا

کہہ کر کام شروع کر دیا۔

میں نے اپنی ملازمت کے تقریباً بارہ سال علی گڑھ میں گذارے۔ اور اس عرصہ میں وہاں کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی اور ایک حد تک

سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا کافی موقع ملا۔ نہ میں علی گڑھ کے لئے نیا تھا، نہ علی گڑھ میرے لئے۔ البتہ اس منصبی تعلق قائم ہونے کے بعد اس میں ایک نیا احساس یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی کامیابی اور نیک نامی گویا میرا ذاتی فرض ہے۔ میرا منصبی کام تو بظاہر محدود تھا، یعنی استادوں کے کالج کو، جو دو تین سال پہلے ہی قائم ہوا تھا، بہتر بنانے کی کوشش، تاکہ ملک میں اس کی علمی ساکھ قائم ہو جائے۔ اور وہاں کے پڑھے ہوئے استادوں کو سرکاری اور نجی اداروں میں آسانی سے جگہ مل سکے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی میں رہ کر کوئی شخص اپنے کو صرف منصبی فرائض تک محدود نہیں رکھ سکتا نہ اس کو چاہیئے کہ ایسا کرے۔ یونیورسٹی تو ایک علمی رفاقت ہے، ایک مرکز فکر ہے، ایک ساجھے کا ادارہ ہے۔ جہاں بہت سے علوم وفنون کی سرحدیں آکر ملتی ہیں۔ بہت سے مقاصد اور آدرش شانہ بشانہ تربیت پاتے ہیں، مختلف عمروں کے افراد، استاد اور شاگرد مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اس لئے اس کی زندگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام اراکین رسمی دیواروں کو توڑ کر ایک وسیع تر ذہنی اور سماجی فضا میں رہنے کا سلیقہ سیکھیں اور چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ جاری رہے۔ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا بھی اس صداقت کا احساس ہو اس ماحول کے تقاضوں سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ میں بھی نہیں رہ سکا نہ میں چاہتا تھا کہ رہوں۔ ان تقاضوں کے مثبت اور منفی پہلو دونوں تھے۔ اور میں نے اپنے قیام کے دوران میں دونوں کا بوجھ محسوس کیا، گو میری کوشش یہ رہی کہ جہاں تک ہو سکے اس کے منفی پہلوؤں سے خود کو محفوظ رکھوں، جس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے ٹریننگ کالج کی تھوڑی سی داستان

بیان کر لوں!

جب میں نے ٹریننگ کالج میں کام کرنا شروع کیا وہ بالکل ابتدائی منزل میں تھا۔ نہ اس کی کوئی باقاعدہ سکیم بنائی گئی، نہ خرچ کا اندازہ لگایا گیا، نہ تعلیمی سامان اور آلات کی فراہمی کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین اس وقت یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر تھے۔ اور ان کا ایک کمال یہ تھا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں بہت آسانی سے جما سکتے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں تین کمرے لئے اور ان کو کالج کا نام دے دیا۔ اسٹاف میں دو استاد پورے وقت کے ملازم تھے اور پرنسپل کے عہدے پر مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو کچھ الاونس دے کر آدھے یا تہائی وقت کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اور ان کے بل بوتے پر بیک وقت بی۔ ٹی۔ سی۔ ٹی۔ اور جے۔ ٹی۔ کی ٹریننگ جاری کر دی گئی اور کافی طلبہ کا داخلہ ان میں کیا گیا۔ عملاً سبق پڑھانے کی نگرانی کبھی کبھار بے چارے ممبران اسٹاف کر لیتے اور باقی وقت کے لئے افسانہ یہ تھا کہ جن اسکولوں میں طلبہ پڑھانے جاتے ہیں وہاں کے استاد ان کی نگرانی کر لیتے ہیں۔ جو دوسری ضرورتیں تھیں مثلاً ایک اچھا کتب خانہ، تعلیمی سازوسامان، آرٹ اور دست کاری کی تعلیم کا انتظام ان کے ضمن میں ایثار اور ضبطِ نفس سے کام لیا گیا۔ نصاب تقریباً جوں کا توں الہ آباد گورنمنٹ ٹریننگ کالج کے نصاب سے نقل کر لیا گیا کہ اس میں کفایت نکر تھی اور یہ تنقید سے محفوظ رہنے کا بھی ایک اچھا طریقہ تھا۔ جب میں نے اس نصاب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی نزدیک یا دور کا تعلق بھی، نہ زندگی کے تقاضوں اور مطالبات سے تھا، نہ قومی فکر اور فلسفہ سے، نہ قومی معاشیات سے؛ نہ بیشتر جیتے جاگتے تعلیمی مسائل

ہے۔ سالہا سال پہلے شاید الہ آباد ٹریننگ کالج کے کسی پرنسپل یا پروفیسر نے اس کو بنایا تھا - وہ سب اس زمانے میں بالعموم انگریز ہوتے تھے جن کو قومی زندگی سے بہت کم سروکار تھا۔ اس لئے وہ چاہتے بھی تو اس بے جان نصاب میں جان نہ ڈال سکتے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ تعلیمی نفسیات کے نصاب میں پہلی مد تھی....

PRESENTATiVE AND REPREBENTATiVE ELEMETS OF CONSCiOUS-NESS

(جو کچھ بھی اس کا مطلب ہو۔ اور شاید مجھے اس عنوان سے جو تعصب ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ میں خود اس کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پایا تھا) اس میں کہیں یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے گا، جو اثرات ان کے ذہن اور شخصیت کو بناتے یا بگاڑتے ہیں ان کو سمجھانے کی کوشش کی جائے گی - یا سماجی اداروں کا جو ردعمل ان پر ہوتا ہے ان کا تجزیہ کرکے مروجہ تعلیم کی پرکھ یا اصلاح سے بھی اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ شاید کسی درسی کتاب میں :........ یہ عنوانات تھے، لہذا ان کو نصاب میں جگہ دینا مناسب خیال کیا گیا۔ یہی حالت درسی کتابوں کی تھی جو نصاب میں شامل کی گئی تھیں۔ غرض:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

خیر خانقاہ تو وہاں نہ تھی لیکن بہرحال مدرسہ تو تھا.... ایک دفعہ میں نے، ابتدا ہی میں اس نصاب پر کسی تعلیمی رسالے میں اظہار خیال کیا تو

اس وقت کے خداوندانِ تعلیم (صوبہ متحدہ کے) اس پر خاصے چراغ پا ہوئے کہ یہ ایک نو آمد، نا تجربہ کار، برسوں کے مسلّمہ نصاب پر تنقیدی تبصرہ کر رہا ہے! لیکن بدقسمتی سے اس نو آمد نے مصلحت شناسی (کم سے کم اس وقت تک) سیکھی ہی نہ تھی ... خیر میں نے اور میرے ساتھیوں نے باہمی مشورہ کرکے اس میں ضروری ترمیم کی تاکہ اس کو ہندوستان کے سماجی اور نفسیاتی ماحول کے ساتھ کسی حد تک ہم آہنگ بنایا جا سکے پہلے سال تو اس کام میں خاصی مشکل ہوئی کیوں کہ بعض ذاتی مصلحتوں سے پرو وائس چانسلر مجھے پرنسپل نہ بنانا چاہتے تھے۔ میرا گریڈ ریڈر کا تھا، لیکن انھوں نے ایک لکچرر کو "اعزازی ریڈر" بنا کر ان کو پرنسپل کے عہدے کا چارج دے دیا۔ لیکن یہ غیر منطقی انتظام زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ آئندہ سال سے جب میں نے کام ہاتھ میں لیا تو سٹاف میں اضافہ کرایا۔ طلبہ کی تعداد میں کمی کی۔ داخلے کے معیار کو بلند کیا۔ جے۔ ٹی۔ کی ٹریننگ جو دراصل یونیورسٹی کے دائرۂ عمل میں نہ آتی تھی، بند کی۔ عملی اسباق کی تعداد بڑھائی، نصاب پر نظرِ ثانی کی۔ اور درسی کتب میں ایسی کتابیں شامل کیں جو جدید تعلیمی تحریکوں اور ترقی یافتہ ملکوں کے تعلیمی تجربوں پر روشنی ڈالتی تھیں اور تعلیم اور زندگی کے بنیادی رشتوں کو پہچانتی تھیں۔ یہ سب "میں" نے نہیں کیا۔ بلکہ سٹاف نے مل کر اکیڈمک کونسل کے مشورہ اور اجازت سے کیا، لیکن بہرحال اقدام سٹاف ہی کی طرف سے ہوا۔ میں نے اپنے طلبہ کو یہ بھی بتایا کہ ملک کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ہمیں ان کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ اس وقت ارباب اختیار کو (جائز یا ناجائز طور پر) ہمارے

طلبہ کے خلاف ایک سوءِ ظن پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ اس وقت تک دور نہ ہو گا جب تک ہم دوسرے کالجوں کے مقابلہ میں بہتر استاد اور تعلیمی ملازمتوں کے لئے بہتر امیدوار پیدا نہ کر سکیں۔ یہ توقع کہ ہمارے طلبہ کو فی سبیل اللہ یعنی خدا واسطے کی قسم کے کوٹا کی مدد سے کچھ آسامیاں مل جائیں گی نہ صرف غلط ہو گا بلکہ ایک اچھے ادارے کے شایان شان بھی نہیں ...... بہر حال ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ داخلے کے لئے عرضیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور طلبہ کا داخلہ ایک مقابلہ کی جانچ کے بعد ہونے لگا۔ نظری اور عملی تعلیم کا معیار بہتر ہو گیا اور استاد اور طلبہ بحیثیت مجموعی، زیادہ دل چسپی سے کام کرنے لگے۔ اور چند سال کے اندر اندر کالج نے تعلیمی دنیا میں اپنی ساکھ قائم کر لی۔ اس زمانے میں حیدر آباد، میسور، کشمیر، رامپور اور راجستھان کی بعض ریاستوں اور چند صوبوں سے بعض بہت اچھے اور سینئر استادوں کو ٹریننگ کے لئے علی گڑھ بھیجا جاتا تھا اور ان میں سے بعض نے واپس جا کر معلموں، انسپکٹروں، ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کی حیثیت سے بہت اچھا کام کیا۔ اور بعض ڈائرکٹر تعلیمات کے منصب تک پہنچے۔ مجھے اس خیال سے خوشی ہوتی ہے کہ اس بارہ سال میں اچھے اچھے طلبہ سے مجھے سابقہ پڑا جنھوں نے بعد میں ملک کی تعلیمی زندگی میں نمایاں حصہ لیا اور شاندار تعلیمی خدمات ...

انجام دیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بعد میں میرے بہت عزیز دوست بنے اور انھوں نے اپنے کام سے یونیورسٹی کا نام بلند کیا مثلاً فضل الحق جو جموں میں انسپکٹر مدارس تھے۔ اور جن کی قابلیت، سمجھداری، دیانت داری اور عملی سوجھ بوجھ کا میں بہت معترف تھا۔ تقسیم ہند کے بعد

جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اس میں وہ بہت بے بسی کی حالت میں اور بے رحمی کے ساتھ مارے گئے۔ سید عبدالباقی جو اجمیر کی تعلیمی ملازمت میں تھے جہاں وہ ایک دیانتدار، راست باز، وضعدار اور قابل استاد اور تعلیمی افسر ثابت ہوئے۔ عبدالرزاق داؤد جو شاید میرے سب سے قابل اور نامور شاگرد ہیں۔ اور جن کی تعلیمی نظر تحریر اور تقریر کی قابلیت، جرأت اور فرض شناسی کا مجھ پر گہرا اثر رہا ہے۔ زیادہ وقت ایک پرائیویٹ اسکول کے پرنسپل رہے اس کو بنایا اور جو "بہتر" جگہیں انہیں پیش کی گئیں ان کو بالعموم نامنظور کر دیا ہے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ حال ہی میں میرے ساتھ ہندوستانی تعلیمی کمیشن کے ممبر رہے اور اس حیثیت سے دوسرے لوگوں پر بھی وہی نقش قائم کیا جو میرے دل پر ہے۔

کسی معلم کی خواہ مخواہ دنیاوی اعتبار سے وجاہت، شہرت اور دولت سے محروم ہو یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کے طالب علم نیک نامی کے ساتھ کام کریں۔ اور جب اسے بعد کی زندگی میں اُن سے ملنے کا موقع ملے تو وہ محبت اور شکریہ کے ساتھ اس سے ملیں۔ یہ خوش قسمتی میرے نصیب میں معلم ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ آگے چل کر تعلیمی افسر کی حیثیت سے بھی آئی۔

مجھے استادوں کی تربیت میں یہ فکر ہمیشہ رہتی تھی کہ ان کی نظر کو وسیع کیا جائے اور انہیں نہ صرف اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، اور تہذیبی مسائل میں دلچسپی پیدا کی جائے بلکہ جو تحریکیں اور قوتیں بین الاقوامی پیمانے پر کام کر رہی ہیں وہ ان کو اور تعلیم پر ان کے اثر کو

سمجھیں۔ علاوہ اس کے میں نے، غالباً پہلی مرتبہ، ان کے نصاب میں نامور اور تخلیقی ہندوستانی مفکروں کے تعلیمی خیالات کا مطالعہ بھی شامل کیا، ورنہ اس وقت تک (شاید چند ہی مستثنیٰ کالجوں کو چھوڑ کر) مغربی ماہرین تعلیم کے خیالات کا مطالعہ بالکل کافی سمجھا جاتا تھا۔ اپنی دولت سے شناسائی ہی نہ تھی۔ ابتدا میں تو مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ طلبہ اس کو غیر ضروری سمجھیں گے۔ اور شاید بعض کے بارے میں یہ صحیح بھی تھا۔ لیکن برسوں بعد یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پرانے طلبہ کے ذہن میں اکثر اس قسم کی بحثوں کی یاد تازہ تھی!

مگر ساتھ ہی افسوس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی تک ہمارے استادوں کے کالجوں میں (بلکہ دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی) یہ بات عام نہیں ہوئی۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا میں ایک کمیٹی کا ممبر تھا۔ جس کو ایک یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم کے لئے پروفیسروں کا انتخاب کرنا تھا۔ اس میں اس کافی تجربہ کار اور قابل امیدوار نے اس خیال کا اظہار کیا کہ استادوں کی تعلیم میں اس قسم کے غیر ضروری آرائشی عناصر داخل نہیں کرنے چاہئیں۔ اسے بھی ایک کاریگر، بڑھئی یا معمار کی طرح ایک اچھا کاریگر بنا دینا کافی ہے تاکہ وہ کلاس میں سبق پڑھا سکے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ اسے دنیا کے عام حالات اور تحریکوں اور دل و دماغ کے ان انقلابوں سے بھی کوئی دلچسپی ہو جو چاروں طرف پیش آ رہے ہیں؟ اور یہ شاید ایک خاص امیدوار ہی کا خیال نہیں بلکہ بہت سے تعلیمی افسروں اور پروفیسروں کا بھی ہے۔

علی گڑھ میں مجھے کئی وائس چانسلروں اور پرو وائس چانسلروں

کے عہد میں کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اس میں زیادہ مدت تک ڈاکٹر ضیاء الدین کے ساتھ کام ہوا۔ ان کے یونیورسٹی پر یقیناً بہت سے احسانات ہیں اور انھوں نے پروفیسر، پرانسپل، پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر کی حیثیت سے ایم۔اے۔او۔ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی اپنی طبیعت اور سمجھ کے مطابق کافی خدمت کی۔ طلبہ کی تعداد میں اضافہ کیا۔ ان کو نوکریاں دلائیں، ایک حد تک، اس غرض سے، وہ ہمیشہ انگریزی حکومت اور اس کے افسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ سیاسی پارٹیوں میں بھی اسی خیال سے شریک ہوئے کہ ان کے ذاتی اثر میں اضافہ ہو اور وہ اسے یونیورسٹی کے مفاد اور اس کے لئے زیادہ سرمایہ اور گرانٹ حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکیں (مگر مجھے کبھی ان کا اور بعض دوسرے وائس چانسلروں کا یہ شوق سمجھ میں نہ آیا کہ وہ برسوں جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد بھی اپنے عہدے اور غیر فوجی بدن پر لیفٹیننٹ کرنل کی وردی کیوں پہنتے رہے، جیسے وہ ایک نشان اعزاز ہو!) ان کو اپنی ذات کے بارے میں کوئی خاص غرور نہ تھا۔ استادوں اور طلبہ سے ملنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے مگر یہ ضروری نہ تھا کہ اس کا کوئی خاص نتیجہ نکلے۔ یا کسی قسم کی فیضان حاصل ہو۔ ایک زمانے میں ان کے بارے میں یہ شہرت بھی تھی کہ وہ بہت بڑے ریاضی داں ہیں۔ انھوں نے جب کیمرج یونیورسٹی سے ڈگری لی تو انہیں ---- SENIOR WRONGLER کا اعزاز ملا تھا۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ان کی قابلیت اور امکانات بہت جلد افسردہ ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی سیاست میں بری طرح گھر گئے۔ وہ سیاست جس میں لوگ انتخاب کی لڑائی لڑتے ہیں، اپنے "گروہ"

کو مضبوط اور "مخالفوں" کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ گویا یونیورسٹی چنگی کی کمیٹی ہے، یا سیاست کا اکھاڑہ، اور تعلیمی اداروں کو ایک قسم کی ذاتی جائداد بنا دیا جاتا ہے۔ اس نامبارک مقصد کے بھنور میں پھنس کر وہ ریاضی میں وہ نام نہ پیدا کرسکے جس کا کم سے کم امکان ضرور تھا۔ بجائے تعلیمی اور علمی مقاصد کو اپنا مطمح نظر بنانے کے، انھوں نے اپنی بیشتر توجہ اور کوشش الیکشن کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے میں صرف کردی۔ ان کے بارے میں علی گڑھ میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اگر خدا بھی ان کے خلاف (معاذ اللہ) الیکشن لڑے تو اسے کامیابی نہ ہوگی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے مختلف تعلیمی اور انتظامی جماعتوں میں، وائس چانسلر کی مخالفت کے باوجود (اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) اپنی اکثریت پیدا کرلی اور اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان میں قوت حاصل کرنے کا ہوکا تھا۔ اور جوڑ توڑ کی اچھی صلاحیت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی میں برسوں کی صحیح تعلیمی آب وہوا نہ پیدا ہوسکی۔ جو استادوں اور طلبہ میں، طلب علم کی سچی لگن لگاتی۔ قابل پروفیسر کبھی کبھی آئے۔ بعض نے اچھا علمی کام بھی کیا۔ اچھے طالب علم بھی درس گاہ سے نکلے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یونیورسٹی میں علم اور ادب، سائنس اور فلسفہ، تاریخ اور ریاضی اور دوسرے مضامین کا وہ ذوق اور علمی تحقیق کا وہ شوق پروان نہ چڑھا جس پر ایک یونیورسٹی کی علمی صحت اور شگفتگی کا دارومدار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی اس اعتبار سے صورت حال زیادہ اچھی نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین نے اصولی غلطی یہ کی کہ استادوں کے انتخاب میں اکثر قابلیت اور طبعی مناسبت کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ پارٹی کے مفاد کا خیال اور یہی اصول،

اُن کے ترقی کے موقع پر اور انتظامی عہدوں کے لئے ان کے انتخاب میں کارفرما رہا۔ ان کو یہ فکر نہ تھی کہ ہونہار اور قابل طلبہ کی ہمت افزائی کریں، ان کے علمی ذوق کو ابھاریں؛ بلکہ ایسے طلبہ کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے جن کے ذریعہ سے باقی طلبہ پر اثر قائم رہے۔ اس وقت داخلوں کی یورش آج کل کی سی تھی، انہیں تعداد بڑھانے کی دھن تھی۔ خواہ اس کے لئے ضروری لوازمات فراہم ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ ان کی مدافعت میں کہا جا سکتا ہے کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند" لیکن ان کے شہر میں یہ گناہ اس وقت سے شروع ہو گیا تھا جب شاید ایسا کرنا لازم نہ تھا وہ بہت سے ایسے طلبہ کو داخل کر لیتے تھے جنھوں نے نہ صرف تیسرے درجہ میں امتحان پاس کیا ہوتا بلکہ جو علمی اعتبار سے بھی تیسرے درجہ کے ہوتے۔ ان کی نظر میں بحیثیت مجموعی کمیت، کیفیت سے زیادہ اہم تھی۔ لہذا تعلیم کا اور ایک حد تک اس کی وجہ سے امتحانوں کا معیار بھی گر گیا تھا۔ وہ غالباً وہی کام کرتے تھے جو ان کی رائے میں یونیورسٹی کے لئے مفید ہوتے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس میں حکومت کی بے جا خوشامد، طلبہ کو محض سرکاری نوکریوں کے لئے تیار کرنا، سفارش کو قابلیت پر ترجیح دینا بھی شامل تھا اور ہمیشہ رہا اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ جس کا تعلق میری اپنی ذات سے ہے۔

جو لوگ علی گڑھ کی تعلیمی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے رحمت اللہ کمیشن کی تحقیقات کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین کو پرو وائس چانسلر کے عہدے سے الگ ہونا پڑا تھا۔ کچھ عرصے تک عارضی طور پر سر شاہ سلیمان اور نواب اسمٰعیل خاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اس کے بعد سر راس مسعود نے اس عہدہ کو سنبھالا اور اپنی قابلیت، حسن انتظام

اور ذاتی خوبیوں کی وجہ سے یونیورسٹی کی شہرت اور معیار کو کافی بلند کیا لیکن چند لوگوں کی مخالفت سے بددل ہو کر انھوں نے وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا اور بھوپال چلے گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی پارٹی... جو ابھی تک یونیورسٹی میں کافی مضبوط تھی، اس موقع کی منتظر تھی۔ کمیشن کی سفارشات کو نظر انداز کر کے ان کا نام وائس چانسلری کے لئے پیش کیا گیا۔ حکومت بھی اپنے مصالح کی وجہ سے اس انتخاب کے خلاف نہ تھی۔ کیوں کہ اس کو ڈاکٹر ضیاء الدین کی وفاداری پر بھروسہ تھا۔ ووٹوں کا کاروبار شروع ہوا۔ ان کے موافقین ہر ممبر کورٹ کے پاس جاتے اور اس کا ووٹ مانگتے۔ میں اس زمانے میں کوٹ کا ممبر تھا۔ ان کے ایلچی میرے پاس بھی پہنچے اور عقلِ دنیادار کے حوالے سے مجھ کو راضی کرنا چاہا۔ میں نے باسلوب مناسب انہیں بتایا کہ میرے لئے ان کے حق میں ووٹ دینا ممکن نہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنا مفادِ یونیورسٹی کے خلاف ہوگا۔ میں نے کمیشن کی تحقیقات کا حوالہ بھی دیا۔ آخر کار ایک صاحب نے کہا "ممکن ہے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہو۔ لیکن اب ہمارے پاس اتنے ووٹ ہو گئے ہیں کہ ان کا انتخاب یقینی ہے لیکن تمھارے لئے یہ مخالفت مہنگی پڑے گی۔" میں نے عرض کیا کہ میں اپنی آزادی رائے کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں..... ایک اور صاحب تشریف لائے۔ فرمایا "اچھا اتنا کرو کہ کسی طرف ووٹ نہ دو۔" میں نے زچ ہو کر کہا کہ "ہم لوگ جو علمی اداروں میں کام کرتے ہیں ان کے پاس نہ روپیہ ہے نہ رسوخ، نہ قوت ہے نہ شہرت، ان کے پاس صرف ایک چیز ہے۔ اور وہ ان کی رائے کی آزادی ہے۔ اس کو فروخت کرنے کو میں تیار نہیں ہوں۔" اس زمانے میں یونیورسٹی کے رجسٹرار سید سجاد حیدر یلدرم تھے جو میرے والد اور چچا کے ہمعصر تھے۔

اور میرے بہت عزیز و محترم دوست تھے۔ اب انہیں میرے پاس بھیجا گیا اور انھوں نے وہ سب دلیلیں دہرائیں جو دوسرے ایلچیوں نے پیش کی تھیں۔ میں نے انھیں بھی وہی جواب دیا کہ میں اس معاملے میں اپنے ضمیر کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں رکھتا!" جب میں اپنا قطعی جواب دے چکا تو انھوں نے کھڑے ہو کر مجھے گلے لگا لیا اور کہا "اب تک جو کچھ میں نے کہا تھا وہ ایک پیغامبر کی حیثیت سے کہا تھا۔ لیکن مجھے بہت خوشی ہے کہ تم اپنے اصول پر پختہ نکلے۔ مجھے خواجہ غلام الثقلین کے فرزند سے یہی توقع تھی"۔ ان کے اس اظہار کرم سے واقعہ کی ساری تلخی میرے کام و دہن سے بالکل دور ہو گئی۔ بہرحال ڈاکٹر ضیاء الدین کا انتخاب ہو گیا اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اتنا بیان کر دوں کہ دو تین موقعوں کے علاوہ کبھی انھوں نے میری کوئی خاص مخالفت نہیں کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں حتی الامکان اپنے کام سے کام رکھتا۔ اور اکیڈمک کونسل وغیرہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ لیکن میں نے اس اختلاف رائے کو حتی الامکان ذاتی مخالفت نہیں بننے دیا۔

وہ بالآخر خدا خدا کر کے یونیورسٹی سے رخصت ہو گئے۔ اور بارگاہ الٰہی میں پہنچ گئے۔ جہاں اس ترازو میں اعمال تولے جاتے ہیں جس میں خیر اور شر کا ایک ایک ذرہ اپنی جگہ پاتا ہے۔ خدا کرے کہ ان کی نیکیوں کا پلہ کسی قدر بھاری ثابت ہو۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو ذہنی روایات اور انداز فکر کی میراث چھوڑی اس کا یونیورسٹی کے مستقبل پر اچھا اثر نہیں ہوا۔ ان کے رکھے ہوئے بعض استادوں نے بعد میں وہی شیوہ اختیار کیا جو ان کا تھا، ترقی پانے اور قوت و اختیار حاصل کرنے کے لئے سازشوں اور پارٹی بازی

کا سلسلہ جاری رہا۔ اور یونیورسٹی میں "اعزاز" حاصل کرنے کے لئے علم کی خدمت اور تلاش کے بجائے بعض اساتذہ نے "حکام وقت" کی خوشامد اور درباداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ علم کی خدمت اور اس کے ذریعے انسان کی خدمت، دولت اور قوت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بعض علم دوست اور بعض خوددار لوگ یا تو یونیورسٹی سے الگ ہو گئے، یا اس کی "سیاست" سے بے تعلق ہو گئے۔ دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا۔ یا انھوں نے خودداری کو چھوڑ دیا اور خودی کو سستے داموں فروخت کر دیا۔

سر راس مسعود کا دور یونیورسٹی میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ مدت کے بعد ایک ایسا وائس چانسلر ملا تھا کہ اس کے پاس جا کر، اس کی باتیں سن کر، اس کے گداز قلب کو محسوس کر کے نہ صرف خوشی ہوتی تھی بلکہ زندگی کا حوصلہ بلند ہوتا تھا۔ ان کی ذات ایک انجمن بھی تھی اور شمع انجمن بھی۔ طلبہ اور بیشتر اساتذہ ان کی شخصیت سے متاثر تھے۔ ان میں سے بعض پروانوں کی طرح ان کے گرد رہتے۔ اور ان کی ظرافت، بذلہ سنجی، انسان دوستی، گرم جوشی اور ادبی و علمی ذوق سے لطف اندوز ہوتے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ اگر ایک دفعہ کسی شخص سے مل لیتے تو اس کا نام، چہرہ، لباس، ملاقات کا وقت اور مقام بعض دفعہ جو بات چیت ہوئی تھی، برسوں ان کی یاد میں اس طرح محفوظ رہتی جیسے کسی کیمرے نے تصویر لے لی ہو اور ٹیپ ریکارڈر نے بات چیت کو محفوظ کر لیا ہو۔ وہ بیشتر طلبہ کا نام جانتے تھے اور نام لے کر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے خواہ مخواہ بھی ایک قسم کا ذاتی تعلق پیدا ہو جاتا تھا۔ انھوں نے چند سال کے اندر یونیورسٹی کی ساکھ از سر نو پبلک اور

حکومت میں قائم کی۔ ہندوستان اور بیرونی ہندوستان سے قابل اساتذہ
کو انتخاب کیا، اور اس معاملے میں ہندوستانی، غیر ہندوستانی، ہندو، مسلم،
سکھ یا عیسائی وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں کی۔ قابل، فرض شناس اور دیانتدار
استاد، خواہ کسی مذہب یا قوم کے ہوں، طلبہ کے لئے ایک نعمت ہیں۔ ان کے انتخاب
میں محض مذہب کو معیار بنانا (اور اس جملہ میں میرا زور محض کے لفظ پر ہے)
ان کے مذہب میں جائز نہ تھا۔ ان کے لائے استادوں میں سے بعض نے (جن
میں ہندوستانی اور باہر کے استاد دونوں شامل ہیں) بعد میں علمی دنیا میں بڑا
نام پیدا کیا۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ وہ ریاضی کے لئے فرانس سے ایک نوجوان پروفیسر
لائے تھے جن کا نام آندرے وائل" تھا۔ ان کے بارے میں دو روائتیں
تھیں۔ اور جب تک وہ علی گڑھ میں رہے دونوں ہی روائتیں چلتی رہیں۔ ایک
یہ کہ وہ بالکل ایک معمولی شخص ہیں۔ راس مسعود محض اپنی دوستی میں انہیں لے
آئے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ در اصل ایک غیر معمولی قابلیت کے ریاضی داں ہیں۔
چند سال ہوئے جب میں پیرس اور امریکہ گیا تو معلوم ہوا کہ اندرے وائل"
(جو علی گڑھ میں چند سال ہی رہے) واقعی بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں
راس مسعود نے علی گڑھ میں سائنس کی شاندار لیبارٹریاں قائم کیں۔ کتب خانہ
کو توسیع دی، طلبہ میں نیم نصابی، علمی ادبی اور آرٹ کی دلچسپیوں کو ابھارا
اور یونیورسٹی میں بحیثیت مجموعی ایک علمی فضا پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اگر وہ
چند سال اور وہاں رہ جاتے تو شاید یونیورسٹی بہت کچھ سنبھل جاتی۔ ان میں
لیڈرشپ کی بہت سی غیر معمولی صفات تھیں۔ لیکن ایک صفت کی کمی تھی۔ وہ
برخلاف اپنے دادا سید احمد خاں کے، مخالفت اور تنقید کو صبر اور ٹھنڈے
دل کے ساتھ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جب کورٹ کے بعض ممبروں نے شاید

صرف ایک ہی اہم معاملہ میں ان کی سفارش منظور نہیں کی تو انھوں نے استعفےٰ دے دیا۔ بقول ان کے" سیدین جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو اس کو دوبارہ نہیں جوڑا جا سکتا۔ کوئی کاغذ کا بنا ہوا تو نہیں کہ گوند سے چپک جائے!" لوگوں نے بہت کوشش کی۔ مگر انھوں نے استعفا واپس نہیں لیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد بھوپال وزیر تعلیم ہو کر چلے گئے جہاں انھوں نے پھر بعض اعتبار سے جنگل میں منگل منایا۔ اور خود ان کی کوٹھی اس ادبی صحرا میں ایک نخلستان کا حکم رکھتی تھی جہاں ان کی اور لیڈی مسعود کی مہمان نوازی، دلنوازی، ادب اور علم پروری کے چرچے تھے۔ لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے خدا اُن کو اپنے پاس جلد بلا لیتا ہے۔ اور بہت سے لوگ جن کی زندگی میں کوئی خاص مصلحت، ہم ظاہر بینوں کو نہیں دکھائی دیتی ان کی عمریں طویل ہوتی ہیں! راس مسعود بھی اسی طرح مقابلتہً کم عمر میں.... خدا کو پیارے ہو گئے۔

سر راس مسعود کے سامنے رحمت اللہ کمیشن کی سفارشوں پر عمل کرنے کا مسئلہ تھا۔ ان میں بہت سی سفارشوں پر انھوں نے عمل کیا اور بعض پر بر بنائے مصلحت نہیں کیا۔ ان میں سے ایک سفارش یہ تھی کہ ٹریننگ کالج میں ایک جگہ پروفیسر تعلیم کی بنائی جائے اور اس پر چند سال کے لئے کسی انگریز کا تقرر کیا جائے۔ اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ کیوں کہ کمیشن کے دو ممبر انگریز تھے۔ یعنی سر جارج اینڈرسن اور سر فلپ ہارٹوگ۔ اور صدر سر ابراہیم رحمت اللہ جنھوں نے باوجود آزاد خیال ہونے کے ایک ایسے زمانے میں پرورش پائی تھی جب درود شریف کی طرح انگریزوں کو ہر مرض کی دوا سمجھا جاتا تھا۔ سر راس مسعود نے لیڈز یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی (اور غالباً انڈین

ہائی کمیشن کو بھی) لکھا کہ کسی مناسب شخص کا نام پروفیسری کے لئے پیش کریں۔ اتفاق سے لیڈز یونیورسٹی اور ہائی کمیشن میں متعلقہ اصحاب میرے کام سے واقف تھے۔ اور شاید لندن میں بھی میرا مقالہ دیکھنے کے بعد بعض لوگ واقف ہو گئے تھے۔ اس وقت تک میری وہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ وہاں سے جواب آیا کہ جب آپ کے یہاں فلاں شخص موجود ہے تو ہمارے خیال میں انگلستان سے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انتخابی کمیٹی نے سب مقامی امیدواروں کا انٹرویو کرنے کے بعد میرے تقرر کی سفارش کر دی اور میں غالباً شروع سنہ ۱۹۳۱ء میں تعلیم کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ چونکہ اکثر تعلیمی کانفرنسوں میں شریک ہوتا تھا اس لئے اس وقت تک دوسرے معلموں اور ماہرین تعلیم سے میری خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہاں مجھے اس بات کا موقع ملا کہ میں ان کے خیالات سے استفادہ کروں اور وہ میرے خیالات سے واقف ہو سکیں، لیکن مجھے اندازہ یہ ہوا کہ چند لوگوں کے سوا، تعلیم کے میدان میں، کام کرنے والے، موجودہ صورت حال سے خاصے مطمئن تھے۔ اور جو کچھ عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں ہوتا تھا اس کو یا تو ٹھیک سمجھتے تھے۔ یا اس کی اصلاح (کم سے کم بنیادی اصلاح) ناممکن سمجھتے تھے۔ ملک میں ایک تعلیمی جمود کی کیفیت طاری تھی۔ اور اگر کوئی شخص کسی انقلابی تبدیلی کی تجویز پیش کرتا تو اسکو تصور پسند یا غیر علمی کہہ کر رد کیا جاتا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ "کارگہِ شیشہ گر" میں کوئی دیوانہ، نہ پہنچ جائے![1]

میرے ساتھ کالج اور یونیورسٹی میں جن استادوں اور رفیقوں نے

---

[1] یہاں سات آٹھ سطریں خالی چھوڑ دی گئی تھیں۔

کام کیا اور جن سے قریبی تعلقات قائم ہوئے۔ ان میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے۔ کیوں کہ وہ میری طالب علمی کے زمانے میں وہاں پڑھاتے تھے۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے مجھے بہت متاثر کیا ان میں سے ایک سید تجمل حسین صاحب تھے۔ جو ٹریننگ کالج میں لکچرر تھے۔ یونیورسٹی میں حفظ مراتب کے اعتبار سے لکچرر کو مقابلتہً کم حیثیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن خدا کی نگاہ اور ارباب بصیرت کی نظر میں، آدمی کی قدر اس کے عہدے یا تنخواہ یا اختیار کے لحاظ سے نہیں کی جاتی۔ "ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" یعنی تم میں زیادہ قابل عزت آدمی وہ ہے جو نیک عمل ہو۔ اور جس کے دل میں خدا کا ڈر رہو۔ سید تجمل حسین اپنے ہر فرض کو خواہ وہ منصبی طور پر اُن کے سپرد ہو یا وہ خود کوئی کام اپنے سپرد کرلیں۔ نہایت دیانتداری اور مستعدی سے ادا کرتے۔ اور کبھی کوئی بات خلاف اصول نہ کرتے، خواہ اس سے انھیں کتنا ہی فایدہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ کالج کے طالب علم ان کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اور کیوں نہ پڑھتے کہ وہ ہر وقت ان کی ہر مشکل، ہر مصیبت کو حل کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ امتحان کے کمرے میں بحیثیت نگراں کے ان کی ایسی شہرت تھی کہ جس روز ان کی نگرانی کا نمبر ہوتا، وہ منچلے طالب علم جو نقل کرنے کے خیال سے اپنے ساتھ نوٹ یا حوالے لکھ کر لاتے، امتحان سے پہلے ہی نگراں کی میز پر رکھ دیتے تھے کہ آج کام نہ چلے گا۔ ایک دفعہ ایک بے خبر طالب علم نے ان کی موجودگی میں نقل کرنا چاہی۔ انھوں نے اس کو فوراً پکڑ لیا اور امتحان کے کمرے سے باہر نکال دیا۔ وہ طالب علم خوبی قسمت (یا شومی قسمت) سے یونیورسٹی کے ایک اعلیٰ عہدے دار کا عزیز تھا۔ سید صاحب پر سفارشوں کے بہت ڈورے ڈالے گئے۔ نامنظور! ان کو ایک طرح دھمکایا گیا کہ وہ

اس کو معاف کر دیں ورنہ شاید ان کو نقصان پہنچ جائے۔ انھوں نے جواب دیا "آپ جاکر اپنے افسرِ اعلیٰ سے کہہ دیں کہ تجمل حسین تو ایک مشین ہے جو طالب علم امتحان کے وقت مشین میں ہاتھ ڈالے گا وہ ہاتھ کٹ جائے گا۔ اگر انھیں اپنے لڑکے کا ہاتھ عزیز ہے تو اسے ہدایت کریں کہ ہاتھ مشین میں نہ ڈالے۔" کوئی قوت انھیں ادائے فرض سے روک نہیں سکتی تھی......

لوگوں کی خدمت اور حقوقِ عباد کی ادائیگی کی اس قدر فکر تھی کہ ہمیشہ اپنے ہم وطن اور دوسرے اجنبی طلبہ کی تعلیم کا اہتمام کرتے اور انھیں اپنے چھوٹے سے مکان میں جگہ دیتے۔ مجھے مشورہ دیا کہ علی گڑھ میں مکان بنوالوں۔ میں نے کہا یہ تو نہ میرے بس کا کام ہے نہ میرے پاس نقد روپیہ۔ کہا میرے اوپر چھوڑ دیجئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ باوجود ہر قسم کی مشکلات کے میرا مکان بن کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھے چھنگلی نہیں ہلانی پڑی۔ اور خیر میں تو ان کا عزیز دوست تھا۔ ایک استاد اسکول سے ریٹائر ہوئے جس سے ان کی سرسری سی ملاقات تھی، بلاکر ان سے پوچھا کہ ماسٹر صاحب اب آپ کیا کریں گے؟ کہا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تھوڑا سا پراویڈنٹ فنڈ ملا ہے اسی پر گزارہ کروں گا۔ پوچھا کتنے روز؟ ماسٹر صاحب خاموش۔ آخر ان سے کہا کہ جتنا روپیہ ملا ہے میرے سپرد کر دیجئے۔ چنانچہ اس قلیل رقم میں ایک چھوٹا سا مکان ان کی رہائش کے لئے اور دو چھوٹے چھوٹے مکان کرائے کے لئے بنا دیئے اور اس طرح ان کا گزارہ ہو گیا...... بڑے عالم نہیں تھے۔ ان کی کوئی خاص تصنیفات بھی نہیں ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت ایک سچے معلم کی شخصیت تھی۔ اس میں وقار تھا، انسان دوستی تھی۔ مروت اور رحم کا جذبہ تھا ظرافت تھی۔ عقل دنیا شناس تھی، عملی صلاحیت تھی اور ایسا بے پناہ خلوص جو

دوست دشمن سب کو گرویدہ بنا لیتا تھا۔ تعلیم کے علمی معاملات میں غیر معمولی سمجھ بوجھ تھی۔ جب میں کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیم ہوا تو میں نے وہاں کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے ممبروں میں سید تجمل حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین شامل تھے (میں کہا کرتا تھا کہ آپ تو سید ہیں مگر آپ میں تو پٹھانوں کی سی شان جلال ہے۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین پٹھان ہیں لیکن ان میں سیدوں کی سی روایتی اور شانِ جمال ہے) انھوں نے کمیٹی میں بہت مفید کام کیا اور اس کے بعد واپس علی گڑھ چلے گئے۔ ایک دن اچانک یہ منحوس خبر ملی کہ وہ اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔

موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

علی گڑھ کے دوران قیام ہی میں پہلی مرتبہ سید بشیر حسین زیدی سے ملاقات ہوئی جو یونیورسٹی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور میرے علی گڑھ پہنچنے سے ذرا پہلے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انہیں اس جگہ کے لئے انتخاب کیا تھا۔ انھوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی، بیرسٹری پاس کی تھی لیکن صاحبزادے صاحب نے انھیں تعلیم کے میدان میں ڈال دیا۔ جس میں وہ کئی........ سال تک بہت قابلیت اور نیک نامی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ لیکن انکو بھی اس وجہ سے دشواریاں پیش آئیں کہ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی پارٹی کے آدمی نہ سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ آفتاب احمد خاں کے ساتھ منسلک تھے۔ طلبہ کی ذہنیت کو خوب سمجھتے تھے اور انھوں نے بعض اعتبار سے اسکول کو بہت ترقی دی۔ لیکن رحمت اللہ کمیٹی نے یہاں بھی یہی رائے دی کہ اس اسکول کے شایانِ شان کوئی انگریز ہیڈ ماسٹر ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ علی گڑھ سے علیحدہ ہو گئے اور بعد میں دنیاوی اعتبار سے بہت ترقی کی

ریاست رام پور میں جج اور چیف جسٹس رہے پھر چیف منسٹر ہوئے اور جب تک
تقسیم ہند کے بعد ریاستوں کا خاتمہ نہیں ہوا رام پور نے ان کا اور انھوں نے
رام پور کا دامن نہیں چھوڑا۔ ریاست میں بھی انھوں نے اپنی انتظامی قابلیت کا
بہت اچھا ثبوت دیا۔ بعض نازک موقعوں پر جب رئیس کی ناتجربہ کاری یا
ناعاقبت اندیشی نے ریاست کو خطرے میں ڈال دیا تھا، اس کو محفوظ رکھا۔
عمارتیں بنوائیں، سڑکیں بنوائیں، رفاہ عام کے کام کئے اور ان تمام کاموں
میں انہیں اپنی قابل "مردم شناسی" اور باغ و بہار بیوی بیگم قدسیہ زیدی
سے بہت مدد ملی۔ اگرچہ انھوں نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ ریاستوں کی کشش
عارضی اور سطحی ہے، اور اس میں ان کے شوہر کو، نہ انھیں خود اظہار خودی کے
مواقع مل سکتے ہیں۔ دراصل ان ہی کی کوشش سے زیدی صاحب رام پور
سے رہائی حاصل کر سکے۔ ورنہ ان میں تو اس درجہ مروت ہے کہ اگر کوئی شخص
بھی ان سے کسی معاملے میں بار بار اور مضبوطی کے ساتھ اصرار کرے تو وہ اسکو
نہ نہیں کہہ سکتے خواہ اس میں اپنا کتنا ہی نقصان ہو۔۔۔۔ بعد میں وہ علی گڑھ
یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے، ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے، حکومت ہند کی
طرف سے یو۔ این۔ او۔ میں شامل ہوئے، بہت سی کمیٹیوں اور کمیشنوں کے
ممبر رہے۔ اپنے تجربے اور عملی سوجھ بوجھ کی وجہ سے کئی کمپنیوں کے ڈائریکٹر
ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آنریری خازن ہیں۔ مقامی اور قومی مسائل میں
بہت دلچسپی لیتے ہیں بشرطیکہ کوئی ان کو اس میں کھینچ لے۔ درود شریف
کی طرح ہر مرض کی دوا ہیں۔ جس کو کوئی کام لینا ہوتا ہے یا سفارش کرانی ہوتی
ہے ان کے پاس پہنچ جاتا ہے، ان کی چوکھٹ پر قبضہ جما لیتا ہے یا ان کے
ہاں دھرنا دے دیتا ہے، اور وہ اپنی مروت اور عادت سے مجبور۔۔ اس کا

کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عام اس کے کہ وہ ان کی اس رعایت کا مستحق ہے بھی یا نہیں۔ بہت شریف اور محبت کے آدمی ہیں۔ ریاست کے ساتھ دیر تک وابستہ رہنے کی وجہ سے آئین درباداری ان کی فطرت کا جزو ہو گئے ہیں اور وہ ایک حد تک ان کے راستہ میں حارج ہوتے ہیں۔

میرے زمانے کے نامور اور قابل اساتذہ میں جن میں سے بیشتر اس مسعود کا تحفہ تھے، پروفیسر ڈاکٹر زآمویل (جو سائینس دان ہونے کے باوجود خاصے توہم پرست تھے۔ ہندوستان کی بیشتر چیزوں کو جراثیم زدہ سمجھتے تھے۔ اور کمرے کا پردہ بھی کھولتے تھے تو ہاتھ سے نہیں کہنیوں سے) ڈاکٹر ہنٹر کشمیری کے پروفیسر اور انگلستان سے آئے تھے۔ ہندوستانی پروفیسروں میں قابل ذکر بی۔ این۔ کول تھے۔ جو اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ اور انھوں نے بعد میں مجلس اقوام کے کسی ادارے میں ممتاز خدمات انجام دیں، ڈاکٹر کوسامبی تھے، جن کی ریاضی میں کافی شہرت ہے۔ لیکن ان کے میدانِ فکر دوسرے ہیں...... ان لوگوں کی وجہ سے یونیورسٹی میں کافی علمی رونق پیدا ہو گئی تھی اور اس کا وقار دوسری یونیورسٹیوں کی نظر میں بڑھ گیا تھا۔ اگرچہ میرا اندازہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مختلف علوم کے ماہروں میں جو تبادلہ خیال اور تعاون ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا۔ یہ اچھے لوگ زیادہ تر اپنے اپنے مخصوص دائرہ میں کام کرتے رہے۔

لکھنے کا مرض ابتدائی عمر ہی سے تھا اور اس سے کبھی نجات نہیں ملی۔ طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے لئے بہت سے رطب دیابس

مضمون لکھے۔ اور جیسا کہ میں نے ذکر کیا، اس کا ایڈیٹر بھی رہا۔ پھر لیڈز یونیورسٹی کے جرنل میں جس کا نام GRYPHON تھا خامہ فرسائی کرتا رہا۔ اس کے بعد جب مسلم یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو "مشق ستم" جاری رہی۔ وہاں کے قیام کے دوران میں کئی چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

"علی گڑھ کی تعلیمی تحریک" (انگریزی اور اردو) "اقبال کا فلسفہ تعلیم" (انگریزی) "مدرسہ عمل" (انگریزی جو ایک نامور سوئس ماہر تعلیم کی فرانسیسی کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن ہے) "تعلیم نو کا پیغام" (جو یونیورسٹی ایجوکیشن فیلوشپ لندن کے زیر اہتمام شائع ہوا) "شہید وفا" (اردو) "اصول تعلیم" (اردو) "مدرسہ مستقبل" (انگریزی) "اردو ادب" وغیرہ جب "مدرسہ مستقبل" شائع ہوئی۔ تو ایجوکیشن فیلوشپ کی طرف سے تین ماہرین تعلیم کا ایک وفد ہندوستان میں آیا ہوا تھا جس کے صدر ڈاکٹر زلیا کس تھے جو ٹیچر کالج نیویارک میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے اس کتاب پر ایک مفصل اور کسی قدر مبالغہ آمیز ریویو لکھا تھا۔ ان کتابوں میں شاید سب سے زیادہ مقبولیت "اقبال کے فلسفۂ تعلیم" کو حاصل ہوئی وہ لیورپول دانش سے عرفات ہیلی کیشنز کے زیر اہتمام ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اور پاکستان میں اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ہوا یہ کہ اقبال کی شاعری سے مجھے طالب علمی کے زمانے ہی میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت ان کے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا تھا یعنی بانگ درا۔ میں اس کی نظموں کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتا تھا اور ان کے خیالات اور جذبات کی چوٹ براہِ راست میرے دل پر پڑتی تھی۔ اس عرصے میں ان کے کچھ اور مجموعے اردو اور فارسی کے شائع ہوئے اور مجھے جو ان سے عقیدت

بھی اور ان کی فکر کا جو مجھ پر اثر تھا وہ بڑھتا گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ انھوں نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے شاعری میں جن فلسفیانہ اور اخلاقی اور عالمانہ خیالات اور اعلیٰ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی بہت تعلیمی اہمیت ہے اور میں نے جن نئے تعلیمی افکار اور تحریکوں کا مطالعہ کیا وہ بعض لحاظ سے ان کے خیالات سے بہت قریب ہیں۔ چنانچہ میں نے پہلے ایک ذرا طویل مضمون لکھا اور اس میں ان کے بعض بنیادی خیالات سے بحث کی اور اسے اپنی یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں پڑھا اور بعض دوسری یونیورسٹیوں میں بھی ان کا خاصا استقبال کیا گیا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر اقبال سے میری ملاقات ہوگئی تھی اور میرا جب کبھی لاہور جانا ہوتا یا وہ دہلی آتے تو میں کوشش کرکے ان سے ملتا اور ان کی شخصیت ان کی فکر و نظر، ان کی ظرافت، ان کی ہمہ گیر انسانیت، انکی رواداری اور وسیع المشربی مجھے مسحور کرتی۔ جب ان کی مشہور تصنیف "فکر اسلامی کی تنظیم جدید" کے نام سے شائع ہوئی۔ (جس کی بدولت مجھے مذہب اور سائنس اور فلسفہ کے تعلق اور اسلام کی معنویت میں کچھ نظر پیدا ہوئی) تو یونیورسٹی نے انھیں بلایا۔ انھوں نے دو لکچر علی گڑھ میں دیئے۔ ان کے نام کی کشش سے لوگ تو کافی تعداد میں لکچروں میں شریک ہوئے لیکن میرا خیال ہے ان میں، ان کی اہمیت کو سمجھنے والے کم تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا جو ہمیشہ میرے لئے باعث افتخار رہے گا..... خیر نتیجہ یہ.... کہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کے فکر اور شاعری کی جو اہمیت تعلیمی نقطۂ نظر سے ہے۔ اس پر ایک کتاب لکھوں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ کتاب مکمل ہوگئی۔ میری بڑی آرزو تھی کہ وہ خود اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس زمانے میں بیمار ہو چکے

تھے۔ جب میں آخری بار ان سے ملنے گیا تو میں نے کتاب کا ذکر کیا۔ کہنے لگے، میں تو بہت شوق سے پڑھتا، لیکن ڈاکٹروں کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا اگر میں اس کا خلاصہ چند صفحوں پر لکھ کر بھیج دوں تو آپ اس پر ایک نظر ڈال سکیں گے؟ انھوں نے بخوشی وعدہ کیا اور جب میں نے وہ خلاصہ ان کو بھیجا تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا، جس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی۔

میں نے حتی الامکان درسی کتابیں لکھنے میں ہمیشہ تامل کیا۔ لیکن یہ قسم ایک دفعہ ٹوٹی۔ ایک پبلشر کی درخواست پر میں نے اس زمانے میں درجہ پانچ تا آٹھ کے لئے اردو ادب کے نام سے چار کتابیں مرتب کیں۔ جس میں تین باتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا، سبق ایسے ہوں جو بچوں کی دلچسپی کے ہوں۔ ہر سبق کے بارے میں ایک یا دو تمہیدی پیراگراف ہوں جس میں مصنف اور مضمون کا تعارف کرایا جائے اور بچوں کو دلچسپی دلائی جائے۔ اور آخر میں کچھ ایسی تخلیقی مشقیں دی جائیں جن کی مدد سے بچے سبق کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اور انہیں لکھنے کی مشق بھی ہو جائے۔ غالباً ان کتابوں کا اچھا اثر ہوا اور بعد میں دوسرے مولفوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں انھوں نے اس روایت کو قائم رکھا۔

میری دوسری کتابوں پر بھی جو ریویو نکلے وہ عام طور پر ہمت افزا تھے۔ غالباً استحقاق سے زیادہ۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تعلیم کے موضوع پر اس وقت تک بہت کم کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی تھیں۔ اور پڑھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کو ہر کتاب غنیمت معلوم ہوتی تھی میں نے ایک احتیاط اپنی تقریباً ہر کتاب میں پیش نظر رکھی ہے اور وہ

یہ کہ اس کو لکھتے وقت ہمیشہ پڑھنے والوں کو ذہن میں رکھوں اور بجائے "علمیت" کا سکہ جمانے کے، یہ کوشش کروں کہ جو کوئی اس کو پڑھے مصنف کے خیال کو سمجھ سکے اور انداز تحریر ایسا ہو کہ اس کا جی نہ گھبرائے۔ اس مقصد کے لئے بعض دفعہ فنی اور علمی تصانیف کو بھی عام فہم بنانے کی کوشش ضروری ہوتی ہے[1]

میں ابھی یونیورسٹی ہی میں تھا کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے اپنی تعلیمی مہم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے چند مضامین ہندوستان کی تعلیمی حالت پر، اور اس کی اصلاح کے لئے جو خیالات ان کے ذہن میں تھے، ان کے بارے میں لکھے۔ جب وہ کوئی کام شروع کرتے تو ان کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دفعتاً چونکا دیتے تھے۔ یہی انھوں نے اس سلسلہ میں کیا۔ مروجہ طریقہ تعلیم پر نہایت سخت نکتہ چینی کی۔ اور بنیادی تعلیم کا تصور اس انداز میں پیش کیا کہ ملک کے بیشتر ماہرین اور ارباب اقتدار نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک قومی تعلیمی کانفرنس منعقد کی۔ اس میں مختلف خیال کے لوگوں کو بلایا۔ ان کی رائے کو بہت صبر کے ساتھ سنا، اپنی رائے بہت معقولیت لیکن مضبوطی کے ساتھ پیش کی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی مدعو تھے۔ انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ گاندھی جی کی اسکیم کے اکثر خیالات کی تائید کی اور بعض پہلوؤں سے، اپنے مخصوص اور دل نشیں انداز میں، اختلاف کیا۔ گاندھی جی ان سے بہت متاثر ہوئے۔ اور جب انھوں

---

[1] یہاں دس بارہ سطریں خالی ہیں۔

نے اسکیم کو عملی جامہ پہنانے اور اس کی نوک پلک درست کرنے کے لئے بنیادی قومی تعلیم کمیٹی کو قائم کیا۔ تو اس کی صدارت کے لئے ذاکر صاحب کو چنا گیا۔ اس کے ممبروں کے انتخاب میں بھی انھوں نے ذاکر صاحب سے مشورہ کیا۔ اور غالباً انھیں کے ایما سے مجھے بھی اس کمیٹی میں شامل کیا۔ حکومت ہند جو کمیٹیاں مقرر کرتی تھی، یا اب بھی مقرر کرتی ہے وہ بالعموم دو تین سال کا کام کرتی ہیں۔ ان کے ممبروں کے سفر خرچ اور روزانہ الاؤنس پر ہزاروں، بعض دفعہ لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ گاندھی جی کی اس کمیٹی کو ہدایت تھی کہ دو ماہ کے اندر اس کا کام ختم کر دیا جائے۔ اور اس پر بہت کم روپیہ خرچ کیا جائے۔ چنانچہ اگر کوئی ممبر تیسرے درجہ کا ریل کا کرایہ مانگتا تو اس کو ملتا ورنہ نہیں۔ اس کے شاید دو جلسے جامعہ ملیہ میں ہوئے، دو سیواگرام میں جہاں آشا دیوی اور آریا نائیکم جو گاندھی جی کے خاص معتقدوں اور تعلیمی مشیروں میں تھے، ہمارے میزبان تھے۔ اور ایک جلسہ جو کئی روز تک ہوتا رہا، میری دعوت پر علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں ہوا جس میں کالج کے تمام اسٹاف نے کمیٹی کا ہاتھ بٹایا اور وہیں رپورٹ مکمل کی گئی۔ جب ہم نے اس قدر جلد رپورٹ گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کمیٹی کے کام کو سراہا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ سب کچھ ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ تو گاندھی جی مسکرائے اور کہنے لگے "! مگر جاکر (ذاکر) صاحب تو کہتے ہیں کہ رپورٹ کے پیچھے اصل شکتی تمھاری ہے"! میں نے کہا ان کا انداز بیان ایسا ہی ہوتا ہے اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ مجھے اس سلسلے میں کئی بار گاندھی جی سے ملنے کا موقع ملا۔ اور میں نے دیکھا کہ ان کی انسانیت کس قدر حساس اور گہری

ہے اور کس طرح شانتی اور دھیرج کے ساتھ ہر شخص کی بات سنتے ہیں۔ میں نے ان کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں جب ایک دو اعتراض کیے تو انھوں نے بہت خندہ پیشانی کے ساتھ سنا، اپنی رائے پیش کی، کچھ میری بات کو مانا، کچھ مجھے قائل کیا کہ ان کا نقطہ نظر صحیح ہے۔ ساتھ ہی ان میں ایک بچوں کی سی معصوم سادگی تھی۔ اور ایک خاص قسم کا ذوقی ظرافت جو دل کو لبھاتا تھا۔ وہ اپنے خیالات اور عقاید میں مضبوطی دکھاتے تھے۔ مگر کٹر نہیں تھے۔ جب میں سیوا گرام میں ٹھہرا ہوا تھا تو کہنے لگے "کہو کوئی تکلیف تو نہیں۔" میں نے جواب دیا "آپ اجازت دیں تو سچ کہہ دوں؟" مسکرا کر بولے "میں تو ہمیشہ ہی کہتا ہوں کہ سچ کہنا چاہیے۔" میں نے کہا "باپو جی بات یہ ہے کہ ترکاری تو میں کھا لیتا ہوں، گوشت نہ ملے تو اسکی پروا نہیں۔ لیکن یہاں چائے نہیں ملتی اس کی وجہ سے تکلیف ہے۔ ہنسے اور آریا نائیکم سے کہا "اچھا کل سے اس کا انتجام (انتظام) ہو جانا چاہیے"

جب میں اس کمیٹی کے کام میں مصروف تھا تو علی گڑھ میں جہاں اس وقت تک مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی اختلافات کا اثر خاصا پھیل گیا تھا۔ بعض لوگوں نے جس میں شاید ایگزیکیٹو کونسل کے ایک کارکن بھی شریک تھے، یہ سوال اٹھایا کہ میں نے یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر اس کمیٹی کی ممبری کیوں قبول کی۔ دراصل اعتراض کمیٹی کی ممبری پر نہ تھا۔ بلکہ اس بات پر تھا کہ وہ کمیٹی گاندھی جی اور کانگرس کی مقرر کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی اسٹاف کے ممبر کا وابستہ ہونا نامناسب ہے۔ میری یہ مشکل کہ اول تو میں اس قسم کے قاعدے اور قوانین سے زیادہ واقف ہی نہ تھا (اور یہ صفت شاید کم و بیش ساری عمر قائم رہی!) دوسرے میں ان کا قائل نہیں تھا۔

میرا خیال تھا اور ہے کہ یونیورسٹی ایک آزاد ادارہ ہے۔ اور اس میں کام کرنے والوں کو اختیار ہے کہ اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھیں چنانچہ میں نے اعتراض کا اصولی جواب یہ دیا کہ یہ میرا حق ہے۔ جو کوئی انتظامی جماعت مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ مجھ سے مزید باز پرس نہیں کی گئی، اور نہ کی جا سکتی تھی۔ اور میں کمیٹی کا کام مکمل ہونے تک اس کا ممبر رہا۔ اس کی وجہ سے میری بہت سے ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے بعد میں نہ صرف بنیادی تعلیم میں بلکہ ملک کی سیاسی ترقی میں کافی حصہ لیا۔ مثلاً کاکا کالیکر، جی رام چندرن آریانائیکم، آشادیوی آچاریہ ونوبا بھاوے۔ جی۔سی۔کمارایا وغیرہ۔ بعض سے تو کمیٹی کے کام میں ملاقات ہوئی۔ اور بعض اس بنیادی تعلیمی بورڈ کے ممبر تھے جو گاندھی جی نے رپورٹ پیش ہونے کے بعد قائم کیا۔ جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور ایک ممبر میں بھی تھا۔ ان سب حضرات سے مل کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اگرچہ ان سب نے اپنے اپنے طریقہ پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ مگر ذاتی طور پر گاندھی جی کا مقام، بحیثیت ایک انسان کے بھی سب سے اونچا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان سے سابقہ پڑا یہ تاثر اور گہرا ہوتا گیا۔ ان سے آخری ملاقات کوئی دس سال کے بعد اس زمانے میں ہوئی۔ جب تقسیم ہند کی وجہ سے ملک میں ایک قیامت برپا تھی۔ سرحد کے دونوں طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ نہ لوگوں کی جان و مال محفوظ تھے۔ نہ معصوم بچوں کی زندگی نہ عورتوں کی عصمت، انسانیت کی جھوٹی نقاب جو بہت سے لوگوں کے چہروں پر پڑی ہوئی تھی وہ اٹھ چکی تھی اور اندر سے درندے نکل آئے تھے۔ اس زمانے میں کچھ روز کے لئے میں دہلی آیا ہوا تھا اور دو بار گاندھی جی اور مولانا آزاد

سے ملا اور میں نے علاوہ ان باتوں کے کہا، کہ مشرقی پنجاب میں ہندو مسلم مفاہمت کی ایک چھوٹی سی اور اچھی مثال پانی پت کا قصبہ ہے۔ اگر اس کو علامت کے طور پر ہی سہی، فرقہ وارانہ بلووں سے محفوظ رکھا جائے جو قصبہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کی عین خواہش ہے تو اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد دونوں، میری درخواست پر اور صورت حال کو دیکھ کر دو مرتبہ وہاں گئے اور کوشش کی کہ امن قائم رہے۔ لیکن جب دوسری بار انہیں معلوم ہوا کہ اب صورت حال مقامی افسروں کے قابو میں نہیں رہی۔ اور ایک لاکھ کے قریب شرنارتھی پانی پت کے چاروں طرف پڑے ہوئے ہیں اس لئے بلوے سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تو انھوں نے کوشش کر کے پانی پت کے مسلمانوں کو پاکستان بھیجنے کا انتظام کر دیا اور قتل و غارت کے، مقابلتاً بہت کم واقعات ہوئے —— یہ تو میں پھر آگے نکل گیا۔ لیکن یہ بتانا مقصود ہے کہ گاندھی جی کو میں نے اپنے تجربے میں ایک صاف دل اور کھرا انسان پایا۔ ایک زمانہ میں مسلمانوں کو ان سے بہت شکائتیں پیدا ہوئیں جن کو لیگ اور کانگرس کی مخالفت کی وجہ سے ہوا لگی۔ اور پھر زبان کے معاملے میں گاندھی نے بعض ایسے بیان دیئے، جو شاید ان کی ایمان دارانہ غلط فہمی پر مبنی تھے۔ لیکن مسلمانوں نے بالعموم ان کا بہت برا مانا اور ان کی نیت پر حملے کئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ محض ان کی غلط فہمی تھی۔ چنانچہ جب آزمائش کا کڑا وقت آیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کی کوشش ہی میں انھوں نے اپنی جان دی۔ "چالز ڈکنس" نے اپنے ناول "دو شہروں کی کہانی" میں لکھا ہے "کوئی دوست، دوستی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت دے سکتا ہے کہ وہ اپنے

دوست کی خاطر اپنی جان قربان کردے؟" لیکن گاندھی جی سے جو ہر معاملے میں اپنی آزاد اور بے لاگ رائے قائم کرتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت ہندو سماج اور ہندوؤں کے رویہ پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرنے میں تامل نہ کرتے تھے، یہ توقع بے کار تھی کہ وہ جن باتوں میں مسلمانوں کے طرز عمل کو غلط یا ناجائز سمجھتے تھے ان پر نکتہ چینی نہ کریں۔ کسی نہ کسی طرح ہر کسی کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، خواہ وہ آواز ضمیر...... کے خلاف ہو، خواہ اس کا مخاطب اپنے ہم مذہب ہوں یا دوسرے لوگ، ایک بہادر انسان کی شان کے خلاف ہے سب فریقوں کو خود میں اتنی رواداری اور برداشت پیدا کرنی چاہئے کہ اپنے پر تنقید ٹھنڈے دل سے سن سکیں، اگر اس میں سچائی ہو تو اپنی اصلاح کی کوشش کریں، اگر وہ غلط ہے، لیکن نیک نیتی پر مبنی ہے تو اس سے درگذر کریں۔ لیکن اس پر آپے سے باہر ہو جانا اور جیسا کہ دنیا کی اور ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیوں یا مذہبی جماعتوں کا معمول ہے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہ شرافت ہے نہ عقلمندی ہے[1]

اس کمیٹی کی ممبری کا ایک نتیجہ ایسا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا اور میں کہ علی گڑھ میں جم چکا تھا، وہاں مکان بنا لیا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ یہیں زندگی کا خاتمہ ہوگا، ایک دوسری راہ پر چل نکلا۔ ہوا یہ کہ جب کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی اور اس کے کچھ عرصے کے بعد کانگریس نے صوبوں کی حکومت کو سنبھالا تو کوشش یہ کی گئی کہ وہاں بنیادی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ اسی زمانے میں ریاست جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم

---

[1] یہاں چار سطریں خالی ہیں۔

سر گوپالا سوامی آئنگر تھے۔ جو ایک مضبوط اور بیدار مغز منتظم تھے۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ ریاست میں بھی یہ تعلیمی تجربہ کیا جائے چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بلایا۔ اور انھیں یہ دعوت دی کہ وہ ریاست کی تعلیمی ڈائریکٹری قبول کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کام کو نہیں چھوڑ سکتا، لیکن اگر آپ واقعاً اپنی ریاست میں بنیادی تعلیم کا کام کرنا چاہتے ہیں تو غلام السیدین کو بلائیں۔

اس وقت وزیر اعظم کے پیش نظر بعض اور نام بھی تھے جن میں دو میرے عزیز پروفیسروں کے نام تھے (یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی) ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ دیا۔ اور اپنی عادت اور انداز کرم کے مطابق مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ عرصے کے بعد کشمیر ایک تار ملا کہ وزیر اعظم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں حیران ہوا کیوں کہ میں ان سے بالکل واقف نہ تھا۔ وہاں جانے سے پہلے میں ... ذاکر صاحب سے ملا ..... اور ان سے مشورہ لیا کہ آخر مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا شاید وہ آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست میں بنیادی تعلیم کو کس طرح نافذ کیا جائے اور ممکن ہے کہ وہ آپ سے ... یہی کہیں کہ یہ ذمہ داری قبول کرلو۔ میں نے جواب دیا کہ میں انتظامی امور سے ناواقف ہوں سنتا ہوں کشمیر میں سازشیں اور باہمی جھگڑے بہت ہوتے ہیں۔ اور پھر بنیادی تعلیم کی اسکیم بنانے میں آپ کی مدد کرنا اور بات ہے،

ہے۔ لیکن اس کو چلانا بہت مشکل ہے۔ اگر انھوں نے واقعاً پیش کش کی تو میں کیا جواب دوں ؟۔ کہنے لگے یہ سب باتیں میں سوچ چکا ہوں اور اب کہ آپ پوچھتے ہیں تو بات یہ ہے کہ انھوں نے مشورے کے لئے بلایا تھا۔ اور کہا تھا کہ کسی مناسب شخص کو اس کام کے لئے تجویز کردوں تو میں نے عابد صاحب (ڈاکٹر سید عابد حسین جو جامعہ میں ان کے شریک کار تھے) سے مشورہ کرکے آپ کا نام تجویز کیا ہے۔ رہا انتظامی امور سے ناواقفیت کا سوال، تو ان باتوں میں ہمیشہ کبھی نہ کبھی پہل کرنی ہوتی ہے۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ آپ کو..... اندازہ نہیں کہ کیسے کیسے بے وقوف اس کام کو کرتے ہیں (میں نے کہا شکریہ اس ہمّت افزائی کا!) سازشیں ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ ان سے الگ رہیں گے تو وہ آپ کو نہیں چھو سکیں گی۔ اور پھر اگر بنیادی تعلیم کو ملک میں پھیلانا ہے تو کسی نہ کسی کو یہ کام کرنا ہوگا، ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو اس میں حصہ لینا ہوگا۔ ان میں سے کوئی بھی تو یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ اس میں ایک ماہر خصوصی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ کام، کام کرنے سے آتا ہے، اس کا سلیقہ تجربہ سے حاصل ہوگا۔ آپ اس کی تھیوری کو جانتے ہیں۔ تعلیم کے عام اصولوں اور مسائل سے واقف ہیں۔ بس اگر وہ یہ پیش کش تو خدا کا نام لے کر اس کو قبول کرلیجئے۔ اور یہ ثابت کرکے دکھایئے کہ ہم نے بنیادی تعلیم کی جو اسکیم بنائی ہے وہ محض ایک نظری چیز

نہیں۔ بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ غرض انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا کہ میں نے دلیل اور صاحب دلیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور کشمیر جانے کو تیار ہو گیا۔

وہاں پہنچا تو پہلے وزیر تعلیم صاحب زادہ سر عبدالصمد سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کسی قدر واقف تھے۔ بہت تپاک اور خلوص سے ملے۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ جب وزیر اعظم سے ملو تو ان کو "سر" کہہ کر خطاب کرنا۔ اس زمانے میں میرا خیال تھا کہ کسی شخص کو اس کی منصبی حیثیت سے "سر" کہہ کر خطاب کرنا گویا ایک یونیورسٹی پروفیسر کے خلاف شان ہے! (اب تو میں ہر شخص کو "SIR" کہہ کر بات کر سکتا ہوں۔ خواہ وہ مجھ سے چھوٹا ہو یا بڑا!) چنانچہ جب میں ان سے اگلے روز ملا تو عبدالصمد صاحب کے جائز مشورہ پر بالکل عمل نہیں کیا۔

گوپالا سوامی آئینگر بہت کم گو اور لئے دیے رہنے والے آدمی تھے اور انھیں اپنے عہدے اور حیثیت کا خاصا احترام تھا۔ مجھ سے بہت باتیں دریافت کیں۔ جن کا غالباً میں نے تسلی بخش جواب دیا۔ اس کے بعد کہا کہ میں نے تمھاری ایک کتاب ACTIVITY SCHOOL پڑھی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا وہ کہاں سے آپ کے ہاتھ لگی۔ اور وہ تو دراصل میری کتاب نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ کے ایک نامور ماہر تعلیم "اڈولف فیریر" کی فرانسیسی تصنیف ہے۔ جس کے امریکی ترجمہ کو میں نے ہندوستان کے طلبہ اور معلموں کی ضرورتوں کے پیش نظر ایڈپٹ کیا

ہے، اس میں کچھ چیزیں بڑھائی ہیں، کچھ گھٹائی ہیں، کچھ ہندوستانی مفکروں کے مضامین نئی تعلیم کے بارے میں شامل کئے ہیں۔ انھوں نے کہا، ہاں یہ میں نے تمھارے مقدمہ میں پڑھا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص کسی کتاب پر اس قدر محنت کرتا ہے وہ ایک معنی میں اسی کی ہو جاتی ہے۔

غرض نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ریاست کے ڈائریکٹر تعلیم کا عہدہ مجھے پیش کر دیا اور میں نے وعدہ کیا کہ میں علی گڑھ پہنچ کر اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے مشورہ کر کے آپ کو جواب دوں گا۔ انسان کو کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ زندگی کے اگلے موڑ پر اس کے لئے کیا چھپا ہوا ہے!۔

اس پر ایک دل چسپ قصہ یاد آیا۔ کشمیر کی پیش کش سے کوئی چھ مہینے پہلے میرے ایک کرم فرما اور بزرگ خان بہادر محمد کفایت اللہ خاں جو ریاست گوالیار میں اسسٹنٹ ریذیڈنٹ تھے۔ مجھ سے ملنے علی گڑھ آئے۔ ان سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انھیں PALMISTRY میں بہت دل چسپی اور نظر ہے۔ انھوں نے اصرار کر کے میرا ہاتھ دیکھا اور اس کے بارے میں بعض بہت تعریفی باتیں کہیں (جن کا میں نے سنجیدگی سے یقین نہیں کیا) اور پھر کہنے لگے کہ تمھارا ہاتھ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے چھ ماہ کے اندر اندر کسی اور "بڑی جگہ" پر چلے جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ میرا ارادہ علی گڑھ چھوڑ کر کہیں اور جانے کا نہیں ہے، میں نے یہاں مکان بنوا لیا ہے۔ اور میری زندگی اسی "گوشۂ عافیت" میں بسر ہوگی۔ انھوں نے کہا، نہیں دیکھ لینا کہ اگلے جون کے مہینے میں تمھارا علی گڑھ کا قیام ختم ہو جائے گا۔

میں اس بات کو بھول بھی گیا تھا۔ لیکن جب واقعتاً جون میں مجھے کشمیر جانا پڑا اور حکومت کشمیر نے ڈائریکٹری کی پیش کش کی اور اس کی خبر اخباروں میں چھپی تو کفایت اللہ صاحب کا تار آیا کہ میری پیش گوئی پوری ہونے پر مبارک باد قبول کرو۔[1]

---

[1] یہاں تین صفحات مسودہ میں سادے ہیں۔

اگر فردوس بر روے زمین است

حکومت کشمیر نے میری خدمات یونیورسٹی سے دو سال کے لئے مانگی تھیں۔ لیکن میں وہاں سات سال رہا۔ کیوں کہ ہر میعاد کے ختم ہونے کے بعد حکومت نے دوبارہ اس مدت کی توسیع کے لئے لکھا جو یونیورسٹی نے ذرا مشکل سے (اور سفارش کے ذریعہ!) دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے دفتر سے باہر نکل کر FIELD میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ابتدا میں مجھے اس عہدہ کو قبول کرنے میں کافی تامل تھا۔ یونیورسٹیوں میں بالعموم اور ہندوستانی یونیورسٹیوں میں خاص کر تعلیم بالکل نظری طور پر دی جاتی ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے گوناگوں مسائل سے بہت کم ہوتا ہے۔ عملی مشکلات کو حل کرنے کے گر اس تعلیم کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتے۔ ٹریننگ کالجوں میں تو خیر کچھ نہ کچھ سروکار اسکولوں اور ان کے طلبہ اور معلموں سے ضرور پڑتا ہے۔ لیکن دوسرے شعبوں میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ مجھے فکر یہ تھی کہ میں دفتری کاروبار اور اس کے "سرخ فیتے" کے انتظام کو کس طرح سنبھالوں گا۔ فائلوں سے مجھے طبعاً الجھن ہوتی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی جانتا تھا کہ دفتروں کے کاروبار میں تقدم فائلوں کو ہی حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی جیسا میں نے ذاکر صاحب سے کہا مجھے کشمیر کے تفصیلی حالات سے واقفیت نہ تھی۔ لیکن سننے میں آیا تھا کہ وہاں سازشوں کا بازار

گرم رہتا ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہاں کے مقامی حالات ایسے ہیں کہ کوئی شخص جو اپنی خودداری بیچ دینے کو تیار نہ ہو، اس کی دال وہاں نہیں گل سکتی۔ ایک دو سال کے اندر اندر ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ اسکو وہاں سے بیک بینی و دوگوش رخصت کر دیا جاتا ہے۔ کشمیریوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ ناشکر گزار ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کچھ بھی کرو وہ اسکا اثر نہیں لیتے۔ جب تک کسی شخص کے ہاتھ میں اختیار ہے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ جب اختیار ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو اس کو دودھ کی مکھی کی طرح خاطر سے نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ ان پر مدتوں سے دوہری تہری غلامی مسلط رہی ہے۔ انگریزوں کی، مہاراجہ کی اور پھر ریاست کے باقی باشندوں پر کشمیری پنڈتوں کی۔ اس لئے ان کی فطرت میں وہ تمام عادتیں پیدا ہوگئی ہیں جن کے ذریعہ کمزور اپنا کام نکالتے ہیں۔ یہ سب میری رائے نہیں بلکہ دوسروں کی روایات بیان کر رہا ہوں۔ اپنے تجربے کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔

کشمیر پہنچ کر میں نے وہاں کے تعلیمی حالات کا سرسری جائزہ لیا تو اس کو بہت ناقابلِ اطمینان حالت میں پایا۔ وہ اس وقت ہندوستان میں (کہ خود تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ ملک ہے) شاید سب سے زیادہ پسماندہ ریاست تھی، کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے۔ سوائے کشمیری پنڈتوں کے جن میں تعلیم خاصی عام تھی۔ دوسرے تمام طبقے تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ چند بڑے شہروں اور قصبوں میں کچھ ابتدائی اور ثانوی مدرسے تھے۔ لیکن گاؤں بیشتر اس نعمت سے (اگر اس کو نعمت کہا جا سکے) محروم تھے۔ کالج اس وقت تک صرف جموں اور سری نگر میں تھے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ

بات یہ تھی کہ جو اسکول تھے ان میں سے بیشتر میں تعلیم برائے نام ہوتی تھی۔ استادوں کا تعلیمی معیار بہت کم تھا۔ بعض مڈل پاس بھی نہ تھے، ٹریننگ بہت محدود اور ناقابل اطمینان، تنخواہیں برائے نام۔ مثلاً سات روپے، نو روپے، تیرہ روپے پانے والے بہت سے استاد ابتدائی مدارس میں کام کرتے تھے۔ اور بالعموم جتنی تنخواہ پاتے تھے اتنا ہی کام کرتے تھے! عمارتیں اکثر اتنی خراب تھیں کہ ان میں بچوں کی صحت اور نگاہ کے خراب ہونے کا نہ صرف اندیشہ تھا بلکہ یقین۔ بعض عمارتیں جو کسی اور محکمہ کے کام کی نہ ہوتی تھیں ان میں مرحمتِ خسروانہ سے اسکول قائم کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض جگہ مہاراجہ کے پرانے اصطبلوں تک کو (جب وہ شکستہ و بے کار ہو گئے تھے) اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے مظفر آباد کے قصبہ میں ایک اسکول دیکھا جو سڑک کی سطح سے نیچے تھا۔ یعنی ایک قسم کا تہ خانہ، جس میں روشنی اور ہوا کا کوئی گذر نہ تھا۔ کمرے ہمیشہ مرطوب رہتے تھے۔ اور طلبہ مختلف بیماریوں کا شکار۔ میں نے کئی بار محکمہ فنانس کو لکھا کہ اسکول کو اس کی موجودہ عمارت سے ہٹا کر کسی مقابلتہً بہتر عمارت میں منتقل کیا جائے۔ اور چونکہ کوئی سرکاری عمارت موجود نہیں اس لئے عمارت کرایہ پر لینے کی اجازت دی جائے۔ (اس وقت ڈائرکٹر تعلیم یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر چیز کے لئے محکمہ فنانس کی دریوزہ گری کرنی پڑتی تھی!)۔ شاید زیادہ سے زیادہ دس روپے ماہوار پر اس سے بہتر مکان مل سکتا تھا۔ لیکن محکمہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ بالآخر میں نے نہ صرف تنگ آکر بلکہ غصہ میں وزیر تعلیم کے نام ایک خط لکھا کہ اگر چند ہزار سال بعد جب ہماری شاندار تہذیب کا خاتمہ ہو چکے گا اور کوئی آثار قدیمہ کا ماہر اس

علاقے میں زمین کھودتے ہوئے اتفاقاً اس عمارت کو دریافت کرے گا اور اسے اندازہ ہوگا کہ یہ اسکول کی عمارت تھی تو مجھے یہ خیال کرتے ہوئے کپکپی لگتی ہے کہ وہ ہماری تہذیب کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ شاید وہ سمجھے کہ اس ملک میں نیم متمدن لوگ بستے تھے! یہ خط لکھ کر میں نے اس کی نقل پرائم منسٹر کے پاس بھی بھیج دی۔ وزیر تعلیم تو وہاں ذرا کمزور قسم کے ہوتے تھے۔ لیکن پرائم منسٹر سر گوپالا سوامی آئینگر، زوردار آدمی تھے۔ اپنی رائے خود قائم کرتے تھے اور ان کے سامنے محکمہ فنانس کی بھی نہ چلتی تھی۔ چنانچہ کرایہ منظور ہوگیا۔ لیکن اس قسم کی پیروی کوئی شخص ہر معاملے کی تو نہیں کرسکتا۔ لہٰذا میرے قیام کے دوران میں (اور اس کے بعد بھی) عمارتوں کی حالت قابل اطمینان نہیں ہوسکی اگرچہ کچھ بہتر ضرور ہوئی۔ بیشتر اسکول کرایہ کے مکانوں میں تھے، کرایہ بہت کم، مکانیت خراب اور محدود، ماحول نامساعد اچھے اور فرض شناس استادوں کے لئے بھی اپنا کام کا شوق قائم رکھنا بہت مشکل تھا اس پر مستزاد یہ کہ تعلیمی سامان اور آلات اور کتابیں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔

مجھے خاص طور پر اس لئے بلایا گیا تھا کہ ریاست میں بنیادی تعلیم کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن مجھے فکر تھی کہ اس قسم کی آب و ہوا اور ایسے ماحول میں بہتر تعلیم کس طرح جاری ہوسکے گی۔ جب سرے سے استادوں کے لئے اچھا کام کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے چارج لینے اور حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ حکومت کی اجازت سے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جو تعلیم کی تنظیم جدید کے لئے اپنی تجویزیں اور سفارشیں پیش کرے۔ اس کمیٹی میں خاص کرکے میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، سید تحمل حسین اور کشمیر کے ایک مشہور تعلیمی کارکن

رورنڈ ٹنڈل بسکو، کو شامل کیا۔ آخرالذکر نے گویا کشمیر میں انگریزی تعلیم کی داغ بیل ڈالی تھی اور خود ایک بہت اچھا مدرسہ چلا کر دکھایا تھا۔ جب میں نے اس مدرسہ کا معاینہ کیا تو میں بہت متاثر ہوا کیوں کہ اس میں "نئی تعلیم" کے بہت سے بنیادی عناصر موجود تھے۔ کمیٹیاں تو حکومت ہمیشہ مقرر کرتی ہے اور وہ بعد میں نقش و نگار طاق نسیاں بن جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ میں اس سے چند ماہ پہلے قومی بنیادی تعلیم کمیٹی کے کام سے فارغ ہوا تھا۔ اور میں نے دیکھا تھا کہ ایسے کاموں کو سنجیدگی اور تیزی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہم نے ایک ماہ میں کمیٹی رپورٹ تیار کر لی اور اسے حکومت کے سامنے پیش کر دیا کہ جلد اس پر احکام صادر ہو جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور کمیٹی کی بہت سی سفارشیں حکومت نے منظور کر لیں۔ بجٹ میں روپیہ تو کم منظور رہا۔ لیکن مجھے یہ اجازت دے دی گئی کہ اس رقم کے اندر اندر جو کچھ ممکن ہو سکے اس کو شروع کر دیا جائے۔

جہاں کام کرنے میں بہت سی مشکلیں تھیں وہاں ایک سہولت بھی تھی اور وہ یہ کہ میرے ٹریننگ کالج کے بہت سے شاگرد اسکولوں میں پڑھاتے تھے۔ یا اسکولوں کی نگرانی کرتے تھے۔ ان سب سے میرے تعلقات ایسے تھے کہ میں نے جو کام انہیں کرنے کو کہا انھوں نے حتی الامکان بغیر کسی تامل کے پوری محنت اور شوق سے کیا۔ (اگر سب نے نہیں تو ان میں سے اکثر نے) میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ اگر میں دوسرے استادوں سے ایک حصہ کام لوں گا تو ان سے دو حصے اور اگر وہ میرا حق شاگردی ادا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس سکتے میں ادا ہو سکتا ہے۔

چنانچہ پہلا سوال یہ اٹھا کہ استاد اور تعلیمی افسر تو سب کے سب بنیادی تعلیم سے بالکل ناواقف ہیں۔ لہٰذا کام کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ ہر نئے کام کو شروع کرنے میں یہ سوال اُٹھتا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کام محض کرنے سے آتا ہے، بشرطیکہ کچھ ضروری علمی قابلیت اور اتنی ٹریننگ جو اس کے لئے بالکل ہی لازمی ہو، اس کا انتظام کر دیا جائے۔ ہم نے ریاست کے چند اچھے تعلیمی کارکنوں کا انتخاب کیا۔ چند ہفتے کے لئے ان کی ٹریننگ کے لئے باہر سے دو تین قابل اشخاص کو بلایا۔ جنھوں نے کچھ بنیادی تعلیم کا کام شروع کر دیا تھا یا رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد انھوں نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور نظری طور پر وہ اس سے باخبر تھے۔ جب ان کی ٹریننگ مکمل ہو گئی جس میں، میں خود بھی سارے وقت شامل تھا، تو بنیادی تعلیم کے لئے ایک چھوٹی سی کارکن جماعت تیار ہو گئی۔ جن کی فنی قابلیت خواہ کم ہو لیکن ان میں جوش اور کام کرنے کا ولولہ تھا۔ ان کی مدد سے چند ماہ کے اندر اندر ایک مرکزی ٹریننگ کالج قائم ہو گیا۔ جو جموں اور کشمیر کے لئے مشترک تھا۔ اور اس میں تعلیم شروع ہو گئی۔ میرے ایک شاگرد غلام احمد مختار تھے۔ جو بہت سال بعد ریاست کے ڈائرکٹر بنے۔ وہ اس وقت جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایک مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان میں انتظام کی اچھی صلاحیت تھی۔ اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا فن خوب جانتے تھے۔ ان کو اس اسکول کے پرنسپل کے لئے چنا گیا۔ اور انھوں نے واقعتاً دیکھتے دیکھتے چند ہفتوں میں اسے ایک چلتا کاروبار بنا دیا۔ جب وہاں سے نو ماہ کے بعد استاد فارغ ہو کر نکلے۔ تو ان کے ذریعہ ریاست میں پہلے بنیادی اسکول قائم کئے گئے۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ یہ سب یا ان میں سے بیشتر اسکول

کامیاب تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے اسکولوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں سدھر گئی۔ اور اس کی دیکھا دیکھی اور محکمہ تعلیم کی کوشش سے، جس میں میں نے کوشش کی تھی کہ اپنی سماجی حیثیت کا ایک نیا احساس پیدا ہو جائے، دوسرے اسکولوں میں بھی استادوں نے بعض نئے تعلیمی تجربے کرنے شروع کئے اور اسکول اور سماج میں ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا۔ اور نصاب میں مختلف قسم کی دستکاریوں اور ہاتھ کے کام کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ چوں کہ یہ بنیادی تعلیم کے پہلے تجربوں میں سے تھا اور کشمیر میں یوں بھی ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی آمد رہتی تھی۔ اس لئے ان میں سے کافی لوگوں نے، جن کو تعلیم میں براہ راست یا بالواسطہ دلچسپی تھی۔ سری نگر اور جموں کے ٹریننگ اسکولوں اور بنیادی مدرسوں کا معائنہ کیا اور بالعموم ان کی ترقی پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان میں پنڈت نہرو مولانا آزاد، سر تیج بہادر سپرو، سر عبدالقادر۔ سر بی۔ این۔ راؤ۔ مسٹر شوا راؤ، سر عزیز الحق، میاں بشیر احمد، سر جان سارجنٹ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور بعض مسلم لیگ کے ممتاز قائدین بھی شامل تھے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آخر الذکر میں سے کئی حضرات نے جو کچھ دیکھا، اس کی وجہ سے انھیں جو تعصب اس اسکیم کی طرف سے تھا وہ ایک حد تک دور ہو گیا۔ ٹریننگ اسکول اور ان کے ملحقہ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر بالعموم ان حضرات سے ان کی رائے رجسٹر میں لکھوا لیتے تھے (تاکہ ان کا نفس بھی مطمئن رہے اور وہ مجھے بھی خوش کر سکیں) ان میں سے بعض کی رایوں میں سے مختصر اقتباسات شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔

پنڈت جواہر لال نہرو :-

"مجھے بنیادی تعلیم میں گہری دلچسپی ہے، اور جتنا میں اسے دیکھتا ہوں مجھے یقین ہوتا جاتا ہے کہ عام لوگوں میں صحیح تعلیم پھیلانے کا یہی راستہ ہے۔ گذشتہ چند سال میں... ہندوستان میں جو تعمیری کام ہوئے ہیں، ان میں یہ سب سے اہم ہے۔ دوسرے اچھے مرکزوں کی طرح میں نے یہاں بھی اس کے کارکنوں میں ایک نیا جوش پایا جس کی بدولت انھوں نے بہت سی مشکلوں کو دور کر لیا ہے..... میں نے اس مرکز میں تقریباً ایک گھنٹہ بہت پر لطف طریقہ سے بسر کیا۔ اور جو کچھ یہاں ہوا ہے اور ہو رہا ہے اسے بہت پسند کیا۔"

یو۔ با۔ لون (ڈپٹی پریذیڈنٹ برما سینٹ)

"میں نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ لیکن کسی اور ٹریننگ اسکول میں، میں نے استادوں کی تعلیم کا ایسا مکمل اور بھرپور پروگرام نہیں دیکھا جس میں وار دھا اسکیم کی روح صحیح معنوں میں جھلکتی ہو۔ ایسی درس گاہ کا دیکھنا خود ایک تعلیم ہے۔ اس نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت نمایاں کام کیا ہے۔"

سر جان سارجنٹ (ایجوکیشن کمشنر حکومت ہند)

"ان دونوں درس گاہوں میں (ٹریننگ اسکول

اور بچوں کا اسکول) جو جوش اور مقصدیت پائی جاتی ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ استاد اور طلبا دونوں اس طریقۂ تعلیم سے پورا عملی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ مجھے خاص طور پر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس میں آرٹ اور کرافٹ دونوں پر زور دیا گیا ہے۔"

گوپالاسوامی آئینگر (وزیر تعلیم حکومت جموں و کشمیر)

"ان دونوں درس گاہوں کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ان میں مناسب طریقے سے نئے تعلیمی خیالات پر عمل کیا جا رہا ہے۔ جس طریقہ سے ان میں حرفوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان کو عام تعلیم سے مربوط کیا گیا ہے۔ اور نہ صرف تعلیم کو مربوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ بچوں کی جمالی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے منتظمین نے غیر معمولی ذہانت اور سمجھ داری سے کام لیا ہے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

"تھوڑے سے عرصے میں، استادوں کے ٹریننگ اسکول نے تعلیم میں قیادت کا جو کام کیا ہے اس کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا۔ کام بہت مشکل

کا تھا اور اس کے لئے پہلے سے کوئی بنے بنائے طریقے نہ تھے لیکن ہیڈ ماسٹر اور ان کے ساتھیوں کو بنیادی تعلیم کے اصولوں پر یقین ہے اور انھوں نے بہت لگن اور محنت سے کام کیا ہے اور وہ اس کے نتائج پر فخر کر سکتے ہیں۔"

سر عزیز الحق، ڈاکٹر سراج الدین، عبد الحسن!

"استادوں کی ٹریننگ کے لئے جو نئے طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ انھوں نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔ ان کی تربیت کے لئے جو اہتمام کیا گیا ہے وہ اس تحریک کے چلانے والوں کی اعلیٰ کارگذاری کا ثبوت ہے۔ کشمیر صدیوں سے اعلیٰ صناعی اور صنعت کاروں کا گھر رہا ہے۔ اگر اس قابلِ قدر میراث کو اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں تک پہنچایا جا سکے اور اس کے ساتھ ہی انھیں جدید آرٹ اور کرافٹ سے واقفیت ہو تو اُس سے یقیناً موجودہ تعلیمی طریقوں میں ایک خوش گوار تبدیلی ہوگی۔"

اے۔ ای۔ فُٹ (پرنسپل ڈیرہ دون اسکول)

"میں نے بنیادی اسکولوں میں خاص طور پر یہ محسوس کیا کہ بچے بہت خوش ہیں اور اپنے کام کو مستعدی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ سال میں جن طلبہ نے کاتنے (اور بننے) کا حرفہ اختیار کیا ہے وہ ان کے لئے بارِ خاطر

نہیں بنا۔ ان کو اس بات سے خوشی تھی اور فخر بھی کہ وہ زیادہ مہارت کے ساتھ اپنا کام کر سکتے تھے۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے یقین نہ آتا کہ وہ اس قسم کی چیزیں اپنے ہاتھ سے بنا سکتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سرچشمہ سے یہ نئی تعلیم ساری ریاست میں پھیل سکتی ہے۔ جو لوگ اس تحریک کو چلانے کے ذمہ دار ہیں ان کو اس بات سے بہت خوشی ہو گی کہ یہ ان کے دیکھے ہوئے خواب کے مطابق ایک پختہ شکل اختیار کر رہی ہے۔"

لیکن ایسا نہ تھا کہ سب نے اسکول میں چرخے کی تعلیم دیے جانے کو جو بنیادی اسکیم کا ایک لازمی جز تھی تسلیم کر لیا ہو۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے پاس اس زمانے میں راجہ نریندر ناتھ کا (جو پنجاب کے ایک مشہور لیڈر اور مسز رامیشوری نہرو کے والد تھے) ایک خاصا مفصل خط آیا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:-

"مجھے معلوم ہوا کہ کام تو تم اچھا کر رہے ہو۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کشمیر میں، جہاں دست کاری کا اس درجہ چرچا ہے، اسکولوں میں اس کو کیوں رائج کیا گیا ہے؟"

میں نے انھیں ایک مناسب جواب دے دیا۔ لیکن میں سوچتا تھا کہ یہ اس ذہنیت کا اظہار ہے جو تعلیم اور زندگی کو دو مختلف چیزیں قرار دیتی ہے اور ان میں کوئی زندہ رابطہ قائم کرنا غیر ضروری سمجھتی ہے۔ دل نے یہ بھی

کہا کہ — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی!

کام اچھا خاصا ہو رہا تھا لیکن مجھے اس سے پورا اطمینان کبھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس کے لئے کم سے کم بھی جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ فراہم نہ ہو سکتی تھیں۔ یعنی تعلیمی ساز و سامان، کتابیں، مطمئن استاد جن کو کم سے کم پیٹ بھر کر کھانا مل سکے، اور ان کی اقل ترین ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس کی بڑی وجہ تو روپے کی کمی تھی۔ لیکن دوسری وجہ یہ تھی کہ اور صوبوں اور ریاستوں کی طرح یہاں بھی یہ احساس بہت کم لوگوں کو تھا کہ قومی تعلیم کی بنیادی اہمیت کیا ہے۔ اور اگر بچوں کی صحیح تعلیم نہ ہو تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں کامیابی ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اگر کسی ملک میں بالفرض محال ہر چیز قابل اطمینان ہو، زراعت، صنعت و حرفت، تجارت آرٹ، دستکاری وغیرہ لیکن وہاں کے اسکول خراب ہوں تو مجھے اس کے مستقبل کی طرف سے اطمینان نہ ہوگا۔ اگر اس کی حالت اور سب لحاظ سے ناقابل اطمینان ہو لیکن تعلیم کا انتظام اچھا ہو تو مجھے اس کے مستقبل کی طرف سے امید ہوگی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بیشتر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ زندگی میں جہاں کہیں کام کیا ہر جگہ یہی مشکل پیش آئی کہ ارباب اختیار نے کبھی اپنی مجبوریوں، کبھی اپنی بے حسی کی وجہ سے تعلیم کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا۔ جانتا ہوں کہ حکومتوں کو قومی زندگی کے ہر شعبہ کی فکر ہوتی ہے۔ اور ان کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ لیکن جب کبھی، مثلاً کسی جنگ میں پھنس جاتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو تو کروڑوں، اربوں روپے

یا ڈالر یا پاؤنڈ یا فرانک یا مارک یا روبل کہاں سے آجاتے ہیں؟ کاش ہم بحیثیت انسان کے اس حقیقت کو سمجھ پاتے کہ بچوں کی فطری صلاحیتوں کی تربیت کرنا، ان کے اخلاق و عادات کو سنوارنا، ان کو زندگی کی صحیح قدروں کا احساس دلانا، ان کے ذوقِ جمال اور شوق تعمیر کو ابھارنا، انسانوں کو درندگی کے ساتھ قتل کرنے، ان پر ہر قسم کے ناقابل یقین ظلم کرنے اور عذاب دینے سے بہتر ہے۔ کاش ہم یہ سمجھ سکتے کہ انسان کی تاریخ میں چنگیز خاں، ہٹلر، مسولینی اسٹالن کی اور ان کی امّت کی اہمیت افلاطون، ارسطو، میڈیم منٹی سوری، پروفیسر ڈیوئی، گاندھی ٹیگور، ذاکر حسین اور ان کے سلسلہ روشن سے بہت کم ہے۔

میں نے ایک اور تجربہ کشمیر پہنچنے کے چند ماہ کے اندر اندر شروع کر دیا تھا، یہ تھا "اسکولوں میں محنت کا ہفتہ" کا اجرا۔ گرمی کی تعطیل سے قبل جب سالانہ امتحان ختم ہو جاتے اور طلبہ مقابلتہً فارغ ہوتے تو ان کو ایک پورا ہفتہ اور ہر قسم کے کاموں سے آزاد کر کے اس مقصد کے لئے صرف کرنا ہوتا کہ وہ اپنے اسکول اور اس کے کمپاؤنڈ، فرنیچر سامان وغیرہ کو صاف کریں، کمروں میں سفیدی کریں، باغ (جتنا بھی ہو) اس میں کام کریں اور اسکول کے ارد گرد اور اس کے علاوہ گاؤں کے بعض حصوں میں جو اسکول کے استادوں سے مشورہ کر کے مخصوص کر دیے جاتے، صفائی کریں۔ جو لوگ مثلاً سرینگر یا جموں یا بارہ مولا یا مظفر آباد یا دوسرے قصبوں اور گاؤں میں گئے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ صفائی کے اعتبار سے کشمیر میں کس قدر پسماندگی ہے (جموں اس اعتبار سے کسی قدر بہتر ہے) اس تجربہ سے میرا مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں اس بات کا احساس پیدا ہو اور

نہ صرف احساس بلکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے اس کام میں شریک ہوں۔ اس کے لئے ابتدا میں کافی اہتمام کرنا پڑا۔ استادوں اور انسپکٹروں کی ذہنیت کو بدلنا اور ان کو یہ یقین دلانا کہ یہ کام مفید بھی ہے اور ممکن بھی۔ والدین کی مخالفت یا بے اعتنائی کو دور کرنا، طلبہ کے سامنے اس خدمت کے تصور کو اس طرح پیش کرنا کہ یہ ایک ناگوار سرکاری حکم کی تعمیل نہیں بلکہ ایک عملی اڈونچر میں شرکت ہے جو ان کے اور ان کے گرد ونواح کے لوگوں کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پھر ہر اسکول کے لئے اس کے استادوں اور شاگردوں کے ذریعہ ایک مفصل اسکیم تیار کرنا جو محکمہ تعلیم کی عام سکیم کے اندر ٹھیک بیٹھ سکے۔ جب میں نے سب سے پہلے اس خیال کا اظہار کیا اور اس کے بارے میں نہ صرف تعلیمی کارکنوں بلکہ بعض مقامی لیڈروں سے بھی مشورہ کیا۔ تو عام ردِ عمل یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی ہے تو نیک نیت لیکن اس کی دماغی صحت میں شبہ ہے۔ خیر رفتہ رفتہ دلیل اور ترغیب کے ذریعہ اور بعض اچھے اسکولوں کی مثالیں دے کر جیسے ٹنڈل بسکو کا اسکول تھا جس کی شہرت سے وہ واقف تھے۔ یا پانی پت کے حالی مسلم ہائی اسکول جس کا مجھے ذاتی تجربہ تھا۔ ان کو راضی کیا اور ساتھ ہی یہ یقین دلایا کہ یہ کام کرنا لازمی نہ ہوگا۔ جو بچے چاہیں اس میں شریک ہوں جو نہ چاہیں وہ کوئی دوسرا کام اپنے لئے پسند کر سکتے ہیں۔ البتہ مجھے یہ خوشی تھی کہ اس قسم کے کام میں زیادہ تر طلبہ نے بہت دلچسپی دکھائی۔ اور اس میں تعجب کی بات نہیں کیوں کہ بچے کی فطرت فعّال ہوتی ہے۔ اور اس کو ہفتہ بہ ہفتہ، ماہ بہ ماہ، سال بسال کے نو مہینے چٹائی یا ڈسک پر ٹھا کر بغیر نقل و حرکت کے محض کتابی تعلیم

دینا اس کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ پہلے سال کام ہر اسکول میں تو نہیں ہو سکا لیکن بہت سے اسکول اس میں شریک ہوئے۔ البتہ بعض بچوں کے والدین نے (جن میں کشمیری پنڈتوں کی تعداد زیادہ تھی) یہ اعتراض کیا کہ ہمارے بچے نالیاں صاف کرنے، غلاظت اٹھانے، جھاڑو دینے کا کام نہیں کریں گے۔ یہ ان کے نزدیک "ازالہ حیثیتِ عرفی" کا معاملہ تھا۔ اور بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ سینکڑوں برسوں سے وہ خاندان جو ذرا بھی خوش حال ہوتے تھے۔ وہ ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھتے آئے تھے۔ میں نے ہیڈ ماسٹروں وانسپکٹروں کو دوبارہ تاکید کردی کہ ہرگز کسی طالب علم پر جبر نہ کیا جائے پہلے ہی سال سے طلبہ نے بالعموم اتنا اچھا کام کیا کہ اہل محلہ اور قصبہ جو ابتدا میں مخالف تھے اس سے خاصے متاثر ہوئے۔ وہ بقول گولڈسمتھ "مضحکہ اڑانے آئے تھے، لیکن عبادت کے لئے ٹھہر گئے"۔ رفتہ رفتہ یہ کام بڑھتا رہا۔ زیادہ اسکول اس میں شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ میرے قیام کے آخر زمانے میں شاید ہی کوئی اسکول ایسا رہا ہو جو اس تجربے میں شریک نہ ہوا ہو۔ جو بچے پہلے ایک دو سال اپنے والدین کے ایما سے اس چیلنج کرنے والے منصوبے سے علیحدہ رہے تھے، انھیں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم تو گھاٹے میں رہے، ہمارے ساتھی سب کام کرتے ہیں اور ہم کھڑے تماشا دیکھتے ہیں، ان کے والدین کی مخالفت کچھ تو کام دیکھ کر خود ہی کمزور پڑ گئی تھی اور کچھ بچوں کے اصرار سے متاثر ہو کر انھیں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس تجربے میں جو کامیابیاں ہوئیں انھیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اسکول اور مقامی سماج میں بہتر رشتہ قائم ہو گیا اور سال بہ سال بچوں کے کام میں ان کے والدین

اور دوسرے عزیزوں نے زیادہ حصہ لینا شروع کر دیا۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے اس کے مفید نتائج کو دیکھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس اسکیم کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے محکمہ تعلیم نے یہ تجویز پیش کی کہ علاوہ سال میں صرف ایک ہفتہ صرف کرنے کے سال کے دوران میں بھی اس قسم کا کام جاری رہنا چاہیئے اور متفرق چھٹیوں میں بچوں کو سماجی خدمت کی عادت ڈالی جائے۔ میں نے اس تجربے کی ایک مختصر رپورٹ "کشمیر کے اسکولوں میں محنت کا ہفتہ" کے عنوان سے تیار کی تھی جو بعد میں ہندوستان میں اور یونسکو کے ایک رسالے میں بھی شائع ہوئی۔ اور اس کی ملک میں اور باہر کے تعلیمی حلقوں میں خاصی اشاعت ہوئی۔

اس رپورٹ سے ایک مختصر سا اقتباس دیتا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ بچوں نے کس کس قسم کے کام کئے اور ہماری معمولی توقعات سے کس قدر زیادہ کام کر سکتے ہیں اگر ان کو صحیح طور پر تیار کیا جا سکے۔

مجھے کشمیر میں ذریعہ تعلیم کے بارے میں ایک قابل ذکر تجربہ پیش آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں اسکولوں کی تعلیم اردو زبان اور رسم خط میں ہونی چاہیئے۔ اور پرائم منسٹر (اور ان کی وجہ سے حکومت کا) عندیہ یہ تھا کہ یہاں اردو (یا ہندوستانی) کو ہندی اور اردو دونوں رسم خط میں جاری کرنا چاہیئے۔ یہ ذکر غالباً ۱۹۳۹ء کا ہے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ یہاں ایک رسم خط عام طور پر جاری ہے۔ اس لئے دوسرے رسم خط کے اجرا کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میں نے اس بارے میں وزیر اعظم کی مجوزہ پالیسی کی تنقید میں ایک مفصل نوٹ لکھا

اور ان کو بھیجا - میرے بعض دوستوں نے اس نوٹ کو بھیجنے کی
مخالفت کی تھی - اور کہا تھا کہ وزیر اعظم بہت خود رائے ہیں - اور وہ
اس نوٹ سے ناخوش ہو جائیں گے - میرا کہنا تھا کہ میرا فرض کسی
کو خوش یا ناخوش کرنا نہیں - بلکہ جو بات ٹھیک سمجھوں اس کو مضبوطی
اور وضاحت کے ساتھ پیش کر دینا ہے - پالیسی کا تعیّن بہر حال
بالآخر حکومت کا کام ہے - چنانچہ نوٹ وزیر اعظم کے پاس گیا انھوں
نے پڑھا اور اس پر لکھا کہ میں ڈائریکٹر تعلیم کے خیالات کی قدر
کرتا ہوں اور ان کو یقیناً یہ حق ہے کہ وہ اپنی رائے صفائی کے
ساتھ حکومت کے سامنے پیش کریں لیکن فلاں فلاں وجوہ سے میرے
خیال میں حکومت نے جو پالیسی تجویز کی ہے وہی ٹھیک ہے - اب
جو اس بحث پر نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو میرا خیال ہے کہ میں غلطی
پر تھا اور ان کی رائے ٹھیک تھی - اور اگر بعد میں سارے ملک کے
لئے زبان کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کی جاتی جیسا کہ گاندھی جی
پنڈت جواہر لال، مولانا آزاد چاہتے تھے تو بہت سی گتھیاں سلجھ
جاتیں - اور بہت سی غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں - اس معاملہ کا ذکر میں
نے اس وجہ بھی کیا کہ ایک اونچے معیار کا انسان ہر رائے کو سننے اور
اس پر غور کرنے کو تیار رہتا ہے - گھٹیا درجے کے لوگ اپنی رائے
کو خواہ وہ کیسی ہی کم مایہ کیوں نہ ہو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ہر اختلاف
کو مخالفت کا درجہ دیتے ہیں - مجھے بعد میں کھیر صاحب کے ساتھ
بمبئی میں اور مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دلی میں
یہی تجربہ پیش آیا - ان کا ذہن کشادہ تھا اور وہ اختلاف رائے

کی قدر کرتے تھے۔ برخلاف اس کے ایسے برخود غلط لوگوں سے بھی سابقہ پڑا۔ جن کو کھلے ادّعا کی بیماری تھی اور وہ اس کو خدا کی ایک دین سمجھتے تھے۔

باوجود ان سب کوششوں کے جو عام طور پر پسند کی گئیں مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بہت سے اسکول ایسے تھے جن کی تعلیمی حالت میں نمایاں ترقی نہیں ہو سکی۔ کچھ جمود دُور ہوا، استادوں کی آنکھیں کچھ کھلیں۔ بچوں پر سے شاید ڈسپلن کی سختی کچھ کم ہوئی (کیونکہ میں نے جسمانی سزا کو بالکل بند کر دیا تھا۔ لیکن کوئی حکم دینے سے اسکو نافذ کرنے میں خاصی خلیج حائل ہوتی ہے!) استادوں کی تنخواہوں میں تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ اور ان کی ٹریننگ کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ لیکن تعلیمی انقلاب لاتے، اور اس کو مستقل بنانے کے لئے جن حالات اور شرائط کی ضرورت تھی وہ پوری نہ ہو سکیں۔ اب کہ تجربے نے آنکھیں کھول دی ہیں اور شاید فسخ عزائم نے نتائج کے لئے بیتابی کو بھی سمو دیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ بہت جلد نتائج کی امید رکھنا، امید پروری ہے، عقل مصلحت شناس کا تقاضا نہیں۔ لیکن امنگ اور امید کے بدلے عقل کا سودا کرنا کون سی عقل مندی ہے!۔

جہاں بعض جگہ ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا، کہیں کہیں کامیابی ایسے روشن روپ میں نظر آئی کہ اس کی یاد آج تک میرے حافظے میں باقی ہے یہ وادی سری نگر کے ایک چھوٹے سے پرائمری اسکول کا قصہ ہے۔ جو شاہراہ سے کئی میل دور تھا، جہاں ساٹھ پینسٹھ بچے

داخل تھے۔ جس کا واحد مدرس انٹرنس پاس بھی نہ تھا اور اس لئے ٹریننگ بھی برائے نام پائی تھی۔ گاؤں تمامتر کشمیری پنڈتوں کا تھا۔ اور استاد اتفاق سے مسلمان۔ وہاں صرف لڑکوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن لڑکیاں اپنے یا اپنے والدین کے شوق سے داخل ہوتی تھیں مجھ سے کسی مدرسے کے انسپکٹر نے اس اسکول کا ذکر کیا کہ استاد نے بہت اچھا کام کیا ہے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس اسکول کا معائنہ کروں۔ میں راضی ہوگیا۔ لیکن یہ شرط طے کرلی کہ یہ معائنہ بغیر سابقہ اطلاع کے ہوگا۔ تاکہ معائنہ تماشے میں تبدیل نہ ہوجائے۔ جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ استاد ایک طرف کھڑا ہے۔ اور بچے مختلف قسم کے مشاغل اور منصوبوں میں، جس میں باغ بانی، محنت، مزدوری، سکاؤٹنگ، ورزش، کھیل کے طریقے سے تعلیم، سماجی خدمت، غرض ساری ہی اچھی چیزیں جو ایک اچھے اسکول میں ہوسکتی ہیں موجود تھیں۔ اگرچہ ظاہری شان وشوکت کے اعتبار سے وہ ایک بہت ہی معمولی اسکول تھا۔ اس میں صرف ایک بڑا کمرہ تھا، ایک برآمدہ، ایک چھوٹا سا صحن۔ آلات تعلیم نہ ہونے کے برابر تھے۔ کتابیں کم تھیں۔ لیکن جو تھیں بچوں کے استعمال میں رہتی تھیں۔ نہ استاد، انسپکٹر یا ڈائرکٹر سے مرعوب تھا نہ بچے ان سے خائف۔ استاد اسی طرح ایک طرف کھڑا رہا اور سب مشاغل اور منصوبے بچے خود ہی دکھاتے رہے۔ جب میں اسکول سے روانہ ہونے لگا تو دیکھا کہ گاؤں کی تقریباً ساری آبادی دروازے پر کھڑی ہے۔ اور انھوں نے باتفاقِ رائے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں یہ وعدہ کروں کہ میں اس استاد کو کبھی اس اسکول سے تبدیل نہ کروں گا۔ میں نے کہا کہ کبھی کا وعدہ کرنا تو بہوے

بس کی بات نہیں البتہ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے قیام کے دوران میں استاد کا تبادلہ نہ کروں گا بشرطیکہ اس کی خود بھی یہ خواہش ہو۔ اس کے بعد میں خود دو یا تین مرتبہ اس کو دیکھنے گیا۔ اپنے ساتھ ایک دفعہ پرائم منسٹر کو لے گیا، ان کے بعض معزز مہمانوں کو جن میں مشہور صحافی شیوا راؤ بھی شامل تھے، لے گیا۔ دو تین ریاستوں کے تعلیمی ڈائرکٹروں نے بھی اس مدرسہ کا معائنہ کیا۔ میں نے اس اسکول کا ذرا تفصیل سے ذکر کیا کیوں کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شخصیت اور فطری قابلیت کا طلسم ہر مشکل کو پار کر سکتا ہے۔ اور ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیتا ہے۔ لیکن اس قصہ کا مقطع کا بند یہ ہے کہ باوجود استاد کی قابلیت اور غیر معمولی کارگذاری کے اعتراف کے قاعدہ کے مطابق میں اس کی تنخواہ میں ایک روپے کا اضافہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ محکمہ کے تعلیمی رسالہ میں اس اسکول کا خاص کر کے ذکر کیا۔ اپنی تقریروں میں کئی جگہ اس کی تعریف کی۔ اس قسم کا اعتراف بھی ایک خاموش، بے عذر استاد کی ہمت کو بہت کچھ بڑھا سکتا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس قدر قاعدوں میں جکڑے ہوئے اور "ذات پات" کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں کہ اکثر زبانی اعتراف میں بھی کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ عام طور پر انسپکٹر یا ڈائرکٹر کی شان سے یہ بات بعید سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے اچھے اور قابل "ماتحتوں" کو فیاضی اور مساوات کے انداز میں داد دے سکے۔ بس "ہم تمھارے کام سے خوش ہوئے" ان کی حد ہے۔ برخلاف اس کے میں نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے۔ جہاں کہیں کام کروں، وہاں اچھے کام کرنے والوں کی تلاش

کرنا، ان کی ہر طرح ہمت افزائی کرنا، ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا میرا فرض ہے ایسے لوگ تو خدا کی نعمت ہیں۔ ان کا استقبال نہ کرنا خدا کی لعنت ہے۔ میں نے بعد میں یہ بھی دیکھا کہ اچھے اور برے ہیڈ ماسٹروں کی ایک .... پہچان یہ ہے کہ اچھا ہیڈ ماسٹر خود کو پس منظر میں رکھتا ہے اور جب کوئی تعلیمی افسر آئے تو اپنے استادوں کا باضابطہ تعارف کراتا ہے اور ان کے اچھے کام کی دل کھول کر داد دیتا ہے۔ (مثلاً بمبئی کے مشہور ہیڈ ماسٹر اور میرے دوست ایم۔ ٹی۔ ویاس میں یہ خصوصیت تھی) اور برا ہیڈ ماسٹر خود ہمیشہ اسٹیج کے مرکز میں رہتا ہے۔ اور اپنے استادوں کے تعارف میں اکثر کوئی اسم معرفہ بھی استعمال نہیں کرتا۔ بس "یہ میرے اسکول کے استاد ہیں" جیسے کوئی کہے یہ میرے کارخانے کے مزدور ہیں۔ اور کارخانہ محض میرے دم قدم کی برکت سے چلتا ہے۔[1]

اگرچہ ریاست کے انتظامی معاملات میں میرا تجربہ خاصا دلشکن اور دلچسپ رہا۔ (یہ دونوں چیزیں ایک وقت میں ممکن ہیں لیکن اس میدان میں مقابلتہً زیادہ کامیابی ہوئی۔ کیوں کہ اس میں بعض باتیں ایسی تھیں جو میں ایک حد تک خود کر سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں کے تعاون کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے چارج لینے کے بعد پہلی بات یہ محسوس کی کہ افسروں اور ماتحتوں کے درمیان ایک مستحکم حد فاصل کھنچی ہوئی تھی۔ اور وہ بالعموم اس طرح الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹے

---

[1] یہاں آدھا صفحہ خالی ہے۔

ہوئے تھے۔ جیسے ذات پات کے بندھن ان کے بیچ میں حائل ہوں۔ اسکول کے معمولی استاد، پھر ہیڈ ماسٹر، پھر انسپکٹروں اور ڈائرکٹروں کے دفتروں کے کلرک وغیرہ! پھر انسپکٹر پھر ڈائرکٹر۔ کالجوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال تھا سوائے اس کے کہ تنخواہیں وہاں مقابلتاً زیادہ تھیں۔ (اور اس جملہ میں زور "مقابلتہً" پر ہے "زیادہ" پر نہیں) اس لئے ان کی سماجی حیثیت اسکول کے استاد سے بہتر سمجھی جاتی تھی۔ میں اس نازیبا اور خلاف انسانیت روایت کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ اس بارے میں شروع ہی میں مجھے ایک ایسا تجربہ ہوا جس نے محکمہ کی مروّجہ روایات کی طرف سے میری آنکھیں کھول دیں۔ دفتر میں ایک پرائمری اسکول کا مدرس مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے کہا بیٹھئے اس نے انکار کر دیا...... خیال کیا کہ کچھ تکلف کرتا ہے۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ اور کئی دفعہ کہا لیکن وہ بیٹھنے پر راضی نہ ہوا۔ میں نے اس کو واپس کر دیا۔ اور اس سے کوئی بات نہیں کی۔ یہی تجربہ اس کے بعد دو تین استادوں کے ساتھ پیش آیا۔ اور میں نے ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ چند روز بعد ایک استاد جو ٹرننگ کالج میں میرے شاگرد تھے، ملنے آئے اور جب میں نے ان سے بیٹھنے کو کہا تو تھوڑے سے تکلف کے بعد وہ بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا آخر کیا بات ہے جو ہمارے ساتھی آتے ہیں وہ کرسی پر بیٹھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں! اس نے جواب دیا کہ انہیں دراصل یقین نہیں آتا کہ آپ انہیں واقعتاً بٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ انہیں آزمانا چاہتے ہیں۔ جب میں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو اس نے کہا......

... ہمیں تو ڈائرکٹر کے دفتر کے کلرک بھی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت نہیں دیتے۔ پھر اگر وہ یہ سمجھیں کہ ڈائرکٹر کے سامنے بیٹھنا خلاف آداب ہے تو کیا تعجب ہے۔

خیر! رفتہ رفتہ یہ بات پھیل گئی کہ ایک سرپھرا ڈائرکٹر آیا ہے جو معمولی استادوں کے ساتھ بھی انسانوں کا سا سلوک کرتا ہے اور میرے ملاقاتیوں کی ہچکچاہٹ دور ہو گئی۔

ایک دوسرا مسئلہ جو پیش آیا وہ یہ تھا کہ ہر تقرر کے ساتھ بے شمار سفارشیں آتی تھیں متعلق اور غیر متعلق لوگوں کی، کیوں کہ امیدواران کے پاس پہنچ کر ان سے خط حاصل کرتے تھے۔ یا ٹیلی فون کراتے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی تقرر جو میرے اختیار میں ہوگا سفارش کی بنا پر نہیں کروں گا۔ لیکن یہ بھی ابھی مقامی لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ بہترین امیدوار بھی اپنی قابلیت پر بھروسا نہ کرتے بلکہ سفارشوں کا بوجھ ڈلاتے۔ چنانچہ شروع میں ایک امیدوار جس نے انٹرنس سے لے کر ایم۔ ایس۔ سی۔ تک سب امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کئے تھے میرے پاس عرضی لے کر آیا ایک اسامی کے لئے۔ (جس کی تنخواہ ستر یا پچھتر روپے تھی)۔ میں نے کہا تمھاری اسناد اور امتحانوں کے نتائج بہت اچھے ہیں۔ پہلی جگہ جو کسی سائنس ماسٹر کی خالی ہوگی وہ تمھاری ہوگی۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا اور کوئی دو ہفتے کے بعد دوبارہ میرے پاس آیا اور چھ سات خط میرے سامنے ڈال دیے جو اس نے میرے بعض عزیزوں اور دوستوں سے پانی پت اور علی گڑھ جا کر حاصل کئے تھے۔ ایسے دوست اور عزیز جو اس سے بالکل ناواقف تھے۔ اور جن کے نام غالباً اس نے میرے کسی مقامی دوست سے دریافت کئے

تھے۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا کہ اس شخص کو نہ اپنی قابلیت پر بھروسا ہے نہ میرے لفظ پر اعتبار۔ میں نے اس سے کہا تمھاری قابلیت کی بنا پر میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تمھیں محکمہ میں ملازمت نہیں ملے گی۔ لیکن تمھاری اس حرکت کی سزا یہ ہے کہ پہلی ملازمت میں کسی اور کو دوں گا اور دوسری تمھیں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ جواب ملا کہ یہاں تو وعدہ سب ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن میرا تجربہ یہ تھا کہ نوکری اس کو ملتی ہے جس کی سب سے زیادہ سفارشیں ہوں۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ایک لڑکی کے ساتھ ہوا۔ جس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس کو غالباً اس سلسلہ میں ناگوار تجربے ہوئے تھے اور دوسرے کشمیریوں کی طرح اس کی "جی حضوری" ذہنیت نہ تھی۔ لہذا اس نے اپنی اسناد دکھانے کے بعد، قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں میرے پیشروؤں پر اور مجھ پر تبرّا کرنا شروع کر دیا کہ یہاں تو قابلیت کی کوئی قدر نہیں۔ جنبہ داری کا دور دورہ ہے۔ اپنے عزیزوں یا ہم مذہبوں یا ذات برادری کے امیدواروں کو جگہ ملتی ہے۔ اور اب کہ میں نے یہ سب کہہ دیا مجھے کوئی امید نہیں کہ میں کامیاب ہوں۔ میں نے کہا، اپنے پیشروؤں کا تو میں ذمہ دار نہیں، ممکن ہے ان میں سے بعض پر تم نے جائز تبرّا کیا ہو۔ لیکن میں تمھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پہلی اسامی تمھارے مضمون میں تمھیں ہی ملے گی۔ وہ غالباً بغیر اس بات پر یقین کیے چلی گئی۔ جب اس کی تقرری کے احکام صادر ہو گئے تو وہ معذرت کرنے اور شکریہ ادا کرنے آئی۔ ضمناً یہ کہ بعد میں اس نے محکمہ تعلیم میں بہت اچھا کام کر کے دکھایا اور بڑی ترقی کی...... جیسا میں نے کہا میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا...... کہ

اچھے امیدواروں اور اچھے استادوں کی قدر کروں، ان کو تلاش کروں۔ اور اس اصول کی وجہ سے بحیثیت مجموعی مجھے ان سے کام لینے میں اور معمول سے زیادہ کام لینے میں خاصی کامیابی ہوئی۔ میں نے یہ بھی کوشش کی کہ میرے محکمہ کے افسر استادوں کی طرف سے اپنے رویہ کو بدل دیں اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کریں جیسے وہ دراصل ایک مشترک مقصد کے حصول میں برابر کے شریک کار ہیں۔ اس میں پوری کامیابی تو نہ ہوئی نہ امید تھی البتہ بعض افسروں پر مثال کا اچھا اثر پڑا اور استادوں میں ایک حد تک عزت نفس کا احساس پیدا ہو گیا، گو یہ توقع رکھنا تو بے کار تھا کہ صدیوں کی ذہنیت دو چار سال میں بدل جائے گی۔ تیسرا مسئلہ کشمیر میں ہندو مسلمانوں کا تھا۔ جب میں کشمیر گیا تو اس وقت حکومت کی ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اور ان کا مطالبہ تھا کہ اس کو بڑھایا جائے۔ یہ مطالبہ جائز تھا لیکن اس کو جلدی میں پورا کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ اور دقتوں کے ایک دقت یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں میں اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کی تعداد کم تھی۔ اور ان کے مقابلے میں ہندو خصوصاً کشمیری پنڈت امیدواروں کی کثرت تھی۔ میں نہ مسلمانوں کے مطالبات کو مسترد کرنا چاہتا تھا نہ میری یہ خواہش تھی کہ تعلیمی مفاد کو ملازمتوں کی محض فرقہ وارانہ تقسیم کے اصولوں پر قربان کردوں۔ میرا کہنا تھا کہ ایک نا قابل استاد طلبہ کی نسلوں کی نسلوں کو خراب کر سکتا ہے۔ اور یہ بہتر ہے کہ ایک مسلمان طالب علم اچھے ہندو استاد سے یا ہندو طالب علم اچھے مسلمان استاد سے پڑھے بجائے اس کے کہ دونوں نالائق استادوں سے تعلیم پائیں۔ لیکن جن لوگوں کو محض

فرقہ وارانہ نیابت درکار تھی وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ وہ محض ترازو میں تول کر اپنا حصہ مانگتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا جب بعض مسلمان محکمہ تعلیم کی پالیسی سے اس وجہ سے خفا ہو گئے کہ ڈائریکٹر مسلمانوں کو کافی آسامیاں نہیں دیتا۔ اور بعض ہندو اس وجہ سے کہ اب تک ان کی محکمہ تعلیم میں جو اجارہ داری تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ چنانچہ دونوں جماعتوں کے انتہا پسند اخباروں میں میرے خلاف مضامین نکلنے لگے اور جیسا کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا رویہ ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ الزام تھا کہ ڈائرکٹر ہندو حکومت کو خوش کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ——— کہ چونکہ ڈائرکٹر مسلمان ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ بے جا رعایت کرتا ہے یعنی :۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
(کیونکہ) میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

وزیر اعظم نے ایک دفعہ بلا کر مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے تمھارے خلاف بعض اخباروں میں خصوصاً کشمیری پنڈتوں کے اخبار "مارتنڈ" میں بہت مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ میں نے صورت حال انہیں بتائی اور کہا کہ جب دونوں فریقوں کی طرف سے جنبہ داری کا الزام ہو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ غالباً بے چارہ ڈائرکٹر انصاف کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ وہ یہ سن کر مسکرائے (بہت کم مسکراتے تھے وہ۔ توے کی طرح) اور انھوں نے "مارتنڈ" کے ایڈیٹر کو تنبیہ کرائی کہ اگر وہ اس قسم کے غلط اور بے جا اعتراضوں سے باز نہ آئے گا تو اس کو سرکاری اشتہار نہ دیے جائیں گے۔ وہ بے چارہ ایک طرف تو سرکاری سرپرستی کو ہاتھ سے نہ

دینا چاہتا تھا، دوسری طرف اپنی جماعت کے سامنے اپنی ساکھ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوئی دو ماہ تک مسلسل یہ رویہ اختیار کیا کہ.... ایڈیٹوریل کالم کا عنوان ہوتا تھا "خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری" اور کالم بالکل خالی۔ لیکن بالآخر اپنی اس مقاومت مجہول سے تنگ آ کر اور غالباً خود کشمیری پنڈتوں کے دباؤ سے اس نے یہ "سلسلہ خموشی" ختم کر دیا۔ مگر مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ چند انتہا پسند ہندوؤں اور مسلمانوں کے سوا، جو اپنی "پالیسی" سے مجبور تھے کہ مجھے ریاست کے بیشتر (شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ تقریباً تمام) باشندوں کا اعتماد اور تعاون رفتہ رفتہ حاصل ہو گیا۔ اور باوجود وسائل کی کمی اور لوگوں کی عام ناخواندگی اور بے حسی کے، کام کرنے میں جس قدر زیادہ روکاوٹوں کا اندیشہ تھا وہ پیش نہیں آئیں۔ بلکہ جو مشکلات پیش آتی تھیں (اور وہ مختلف قسم کی تھیں) ان کا مقابلہ کرنے میں ان کا حل سوچنے اور اس پر عمل کرنے میں، ایک خاص خوشی اور تکمیل ذات کا احساس ہوتا تھا۔ اپنے لئے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لیکن اصول کی بات قرآن شریف کی ایک آیت میں بیان کی گئی ہے "جو کوئی آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس میں ایمان کی قوت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی کوشش کو خدا کامیاب کرتا ہے۔" یہاں میرا خیال ہے کہ "آخرت کے ارادے" میں وہ تمام مقاصد بھی شامل ہیں جن کا تعلق نوعِ انسانی کی خدمت اور بہی خواہی سے ہے۔

جب اسکول کی تعلیم کی حالت ذرا بہتر ہوئی اور بنیادی مدرسے

چل نکلے تو میں نے تعلیم بالغان کی طرف توجہ کی۔ یہ ایک لحاظ سے اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے غالباً کسی نے سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں غور نہیں کیا تھا۔ بلکہ عام خیال یہ تھا، ہندوستان میں بالعموم اور کشمیر میں خاص کر کے کہ یہ تجویز بالکل ہی ناقابلِ عمل ہے لیکن میرا عقیدہ یہ رہا ہے کہ ممکن اور ناممکن کا فیصلہ کر دینا، بغیر پرخلوص کوشش کے، بے معنی سی بات ہے اور جب تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے اس کے ہو سکنے کا امکان ہی نہیں۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں اور بعض مقامی لیڈروں کے مشورے سے میں نے ایک اسکیم تیار کی جس میں استادوں اور اسکول کے بچوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور ان کو حفظانِ صحت، صفائی، معلومات عامہ کی مفید باتیں بتائیں۔ ان کی مدد کے لئے چند چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کی گئیں، بعض کو مختصر سی ٹریننگ بھی دی گئی۔ لیکن سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ ان کو اس کام کی اہمیت کا شدید احساس دلایا جائے اور ان میں خدمت کا شوق اور ولولہ پیدا کیا جائے۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لئے خاص خاص حلقے مخصوص کئے گئے۔ اور تعلیمی مرکزوں کو عام طور پر اسکول کی عمارت ہی میں قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جو تعلیم یافتہ نوجوان اسکولوں میں کام نہ کرتے تھے لیکن بالغوں کو پڑھانے کے لئے تیار تھے ان کے لئے کچھ خفیف سا مشاہرہ بھی مقرر کیا گیا۔

لیکن کام کو شروع کرنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ پبلک اس کے لئے تیار نہ تھی، حکومت کے اراکین اور افسر (سوائے وزیرِ اعظم کے) اس میں

کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے، اخبار (خصوصاً جو حکومت کے خلاف تھے) کہتے تھے کہ حکومت نے یہ تحریک محض پراپگنڈہ کی خاطر شروع کی ہے، نیشنل کانفرنس کا بھی جو شیخ عبداللہ کی قیادت میں، سب سے بااثر جماعت تھی، یہی خیال تھا اور اس کے ممتاز قائدوں کے تعاون کے بغیر اس تحریک کا کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں کام شروع کرنے کے چند ہی روز بعد پرائم منسٹر سے ملا اور ان سے کہا کہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اس کے افسر نیشنل کانفرنس کے ساتھ کوئی تعلقات نہ قائم کریں۔ لیکن میں تعلیم بالغان کا کام نہیں کر سکتا جب تک مجھے اس بات کی پوری آزادی نہ ہو کہ میں ان سے مل سکوں، تبادلہ خیالات کر سکوں۔ اور اگر ان کی عملی امداد نہیں تو کم سے کم ان کی خیرسگالی نہ حاصل کر سکوں۔ اور ان سے یہ وعدہ لوں کہ وہ کسی طرح اس کی مخالفت نہ کریں گے۔ انھوں نے کچھ دیر تک سوچا اور پھر کہا کہ مجھے امید نہیں کہ ان کا تعاون حاصل کرنے میں تمھیں کامیابی ہوگی۔ لیکن میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ تم جس سے چاہو ملو اور جو طریقہ مناسب سمجھتے ہو اختیار کرو۔ میں نیشنل کانفرنس کے بعض ممتاز لیڈروں سے پہلے سے واقف تھا اور ان میں سے بہت سے لوگ مجھ سے واقف تھے۔ بعض نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی اور شاید وہ میری نیک نیتی کے قائل تھے۔ چنانچہ میں شیخ عبداللہ سے ملا۔ انھوں نے ابتدا میں یہی کہا کہ آپ کی نیت کے بارے میں تو مجھے پورا بھروسہ ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ حکومت چاہتی ہے کہ لوگوں میں سیاسی تحریک کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جائے۔ میں نے جواب دیا کہ اوّل تو یہ تحریک حکومت نے نہیں اٹھائی۔ میں نے خاص کوشش کر کے اسے حکومت کے "ہاتھ بیچا

ہے،، (ایک دفعہ کسی پارٹی میں مہاراجہ صاحب نے، جن سے میری گفتگو شاذ ہی ہوتی تھی، بہت تعجب کے لہجہ میں کہا تھا۔"میں نے سنا ہے کہ تم ریاست میں تعلیم بالغاں کا کام کرنا چاہتے ہو۔" جب میں نے اعترافِ جرم کیا تو انھوں نے پوچھا کہ کیا تمھارے خیال میں اس کا امکان ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میرا کام کوشش کرنا ہے، نتیجہ میرے ہاتھ میں نہیں)

دوسرے اگر بالفرض حکومت کی نیت بخیر نہیں تو یہ بتائیے کہ آپ کی سیاسی تحریک کے لئے لوگوں کا خواندہ ہونا مفید ہے یا مضر۔ آپ تحریک کو ان کی جہالت کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں، یا ان کی سمجھ بوجھ سے کام لینا-؟ بہرحال وہ کسی قدر تامل کے ساتھ راضی ہوئے اور کہا کہ جہاں تک ممکن ہوگا۔ اور سیاسی مقاصد اس کی راہ میں حائل نہ ہوں گے۔ کانفرنس اس خاص کام میں آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اور کم سے کم مخالفت نہ کرے گی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ جب تک میں ریاست میں رہا انھوں نے اپنا قول نبھایا۔

اس کام میں یہ بھی ضروری تھا کہ حکومت کے دوسرے محکموں اور ان کے افسروں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ خصوصاً اس لئے کہ بعض حلقوں میں باہمی اشتراکِ عمل سے کام کرنے کی تجویز تھی۔ مثلاً پولس، جیل، محکمہ ریشم سازی، محکمہ جنگلات اور کارخانے وغیرہ جہاں بہت سے ملازمین ایک جگہ جمع ہو کر کام کرتے تھے۔

میری کوشش یہ تھی کہ کام کرنے کے دوران ہی میں ان کو ایک گھنٹہ کے قریب ایسا مل جائے جس میں وہ بالغوں کی کلاس میں شامل

ہوسکیں جس کے استاد محکمہ تعلیم فراہم کرے گا۔ اور دوسری سہولتیں خود ان کا محکمہ۔ چنانچہ اسکیم کو حکومت سے بحیثیت مجموعی منظور کرانے کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جن افسران کے تعاون کی ضرورت تھی انکے دفتر یا گھروں پر خود پہنچ جاتا اور ان سے مدد کی درخواست اس طرح کرتا گویا میں اپنی ذات کے لئے کوئی FAVOUR مانگ رہا ہوں۔ اس بات سے بعض افسر کافی متاثر ہوئے۔ کیوں کہ ریاست کی روایتوں میں یہ بات داخل نہ تھی کہ کوئی "بڑا" افسر کسی "چھوٹے" افسر کے پاس از خود پہنچ جائے۔

تعلیم بالغان کے کئی ہزار مرکز ریاست میں قائم ہوئے۔ بعض نے اچھا کام کیا، بعض نے معمولی، بعض نے محض خانہ پُری کی کام نہیں کیا لیکن اسکا کوئی علاج نہ تھا۔ بہت کچھ ہر مرکز میں کام کرنے والے پر منحصر تھا۔ سوائے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کے اور کہیں باقاعدہ نگرانی نہ ہوسکتی تھی۔ علاوہ اسکولوں کے، ان مرکزوں کی نگرانی بھی، افسران معاینہ کے سپرد کردی گئی تھی اور وہ سال میں ایک یا دو دفعہ سے زیادہ ان کی دیکھ بھال نہ کرسکتے تھے۔ بعد میں جموں اور کشمیر کے صوبوں میں ایک ایک نگراں تعلیم بالغاں کے لئے مقرر کردیا گیا تھا، لیکن وہ بھی موثر طور پر ان کی دیکھ بھال نہ کرسکتا تھا۔ پھر بھی بعض جگہ بہت اچھا کام ہوا۔ اور تجربے نے یہ ثابت کیا کہ اگر استاد کسی طرح بالغ شاگرد کی...... طبیعت میں تحریک پیدا کرسکے۔ یا بالغ میں خود کوئی خاص محرک موجود ہو تو منزل سے بہت سے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ میں سری نگر کے ایک مرکز کا معاینہ کرنے گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ ایک بوڑھا آدمی جس کی

عمر شاید ستر سال کے قریب تھی، بہت شوق سے باقاعدہ آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہم تو بالعموم چالیس پینتالیس سال کی عمر تک کے لوگوں کو مرکز میں لیتے ہیں تم کیوں اس شوق سے یہاں آتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ساری عمر میری بڑی خواہش یہ رہی ہے کہ قرآن شریف کو ناظرہ پڑھ سکوں۔ اور میں یہاں اس غرض سے آتا ہوں۔ استاد نے بتایا کہ جب وہ یہاں داخل ہونے آیا تو اس کے ساتھ میں نے یہ شرط کرلی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کم سے کم دس اور طلباء کو لائے گا۔ اور وہ نہایت باقاعدگی سے ایسا کرتا رہا ہے۔ محلہ میں اس کا کافی اثر اور عزت ہے۔ وہ اپنے گھر سے آدھ گھنٹہ پہلے چلتا ہے، راستے میں جو مکان پڑتے ہیں وہاں دستک دیتا ہے اور لوگوں کو ترغیب یا حکم دے کر اپنے ساتھ لاتا ہے۔

اسکول کے بعض استادوں اور ان سے بھی زیادہ طلبہ نے اس تعلیمی جہاد میں بڑا حصّہ لیا۔ اور اس تجربہ سے مجھے ایک تو یہ اندازہ ہوا کہ اگر ان میں جوش اور شوق پیدا ہو جائے تو وہ نئی قسم کے کام بھی کر سکتے ہیں جن کا انھیں پہلے سے کوئی تجربہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم اکثر ان کی صلاحیتوں کے بارے میں غلط رائے قائم کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسکول اور کالج کے طلبہ تو بجلی کے خزانے کی طرح ہیں جن سے قوم کے تاریک گھروں کو روشن کیا جا سکتا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے، ان کو چیلنج کرنے والے، سماجی کام سے اور خدمت سے محفوظ رکھ کر ہم نہ صرف قوم کا نقصان کرتے ہیں بلکہ ان کے نشوونما کے ایک بہترین طریقہ کو بھول جاتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے طلبہ میں جو بے چینی ہے بلکہ مروجہ نظام تعلیم کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھڑکا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں اور میں ان سے ناواقف نہیں کسی پیچیدہ

مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک سیدھا سادہ نسخہ تلاش کرنا عقل کا ثبوت نہیں لیکن ساتھ ہی میں جانتا ہوں کہ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی زندگی کا رشتہ کسی بڑے مقصد کے ساتھ قائم نہیں ہو سکا۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسی ایک بے بادبان کی کشتی کسی طوفانی سمندر میں چھوڑ دی جائے۔ میرے ایک ملاقاتی پروفیسر "روزین کرانز" نے جو ڈنمارک کے مشہور ماہر تعلیم تھے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے نوجوانوں کی زندگی میں جو ہیجان ہے اور توازن کی جو کمی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ "ہم نے اس کا تو بہت اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو آرام سے بسر کریں۔ لیکن ان کی زندگی میں معنویت پیدا کرنے یا اس کو بامقصد بنانے کی کوشش نہیں کی۔" اور یہ ٹریجڈی محض نوجوانوں کی نہیں بلکہ ساری موجودہ نسل اور ساری دنیا کی ہے۔

امریکہ کے موقر رسالہ "سیٹرڈے ریویو" کے مدیر شہیر نارمن کزنس نے جولائی ۱۹۷۱ء کے ایک اڈیٹوریل میں عورتوں کے مطالبۂ آزادی پر اظہار خیال کیا تھا، اور اس ضمن میں طلبہ کی آزادی کی تحریک پر بھی مختصر سا تبصرہ لکھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ:-

"طلبہ کی آزادی کی تحریک کا آغاز بعض اہم خیالوں سے ہوا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ اپنی تعلیم کا نصاب بنانے اور اس کا کاروبار چلانے میں پوری طرح شریک ہوں۔ لیکن ذمہ داری کے ساتھ ان امور کا فیصلہ کرنے کی مانگ کو اس بات سے کوئی تقویت نہیں ملی کہ اس تحریک کے بعض لیڈر، یونیورسٹی کے صدر اور ڈین کے دفتروں میں قفل اور کواڑ توڑ کر گھس گئے، ان کی میزوں کو بول و براز سے گندہ

کیا۔ الماریوں کو الٹ پلٹ کر کے کتابوں کو بکھیر دیا۔ اور ان پر پیشاب کیا۔ تعلیم میں یا کسی اور میدان میں بے عقلی اور غارت گری کا اظہار کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ طلبہ کو حکومتِ خود اختیاری حاصل ہونی چاہیئے ...... آزادی کی تحریک اس قدر اہم ہے کہ اس کو ان آزاد کرنے والوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو بالکل نہیں جانتے کہ آزادی کا کیا مطلب ہے، جن میں بہت کم تاریخی حس ہے اور یہ احساس تو مطلق نہیں کہ انسانی مستقبل کے سامنے کیا امکانات ہیں۔"

گذشتہ چند سالوں میں طلبہ کے ذہن میں جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور جس کے ڈانڈے صریحاً بالغوں کے ذہنی انقلاب سے بھی ملتے ہیں، انھوں نے مجھے بہت شدت کے ساتھ متاثر کیا ہے۔ جانتا ہوں کہ دنیا میں تبدیلیوں کا اور بعض دفعہ اچانک تبدیلیوں کا ہونا ضروری ہے، جانتا ہوں کہ نظام کہنہ بدلتا ہے اور نظام نو اس کی جگہ لینے کی کوشش کرتا ہے ورنہ ممکن ہے "ایک ہی اچھا دستور یا روایت بہت دیر قائم رہ کر نظام کو بالکل خراب کر دے"۔ لیکن جس تیزی کے ساتھ بعض پرانی قدروں کو مسترد کیا جا رہا ہے اور نئی قدروں کی تشکیل کی بجائے یا تو زندگی میں ایک خلا پیدا ہوتا جا رہا ہے اور یا محض ایک منفی رجحان فکر، جس کی بدولت نوجوان محض ان قدروں کو رد کرنے سے مطمئن ہو جاتے ہیں، وہ شاید ہمارے زمانے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تنقید کی شدت تو دوسرے زمانوں میں بھی پائی جاتی تھی، اور سقراط نے جن شدید الفاظ میں اپنے ہمعصر نوجوانوں پر تنقید کی تھی۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آج کے کسی سخت نقاد کے خیالات ہیں! جب میں کشمیر میں تھا اور اس کے بعد بھی بہت

سال تک میرا رجحان امید پروری کی طرف تھا۔ اور اب بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جوں جوں کشتی دوسرے کنارے کے قریب پہنچتی جاتی ہے، موجودہ صورت حال کو دیکھ کر امید کی دامن گیری مشکل اور یاس پروری کا ساتھ دینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے! اس زمانے میں اور اس کے بعد جب میں رامپور اور بمبئی میں اور پھر حکومت ہند کی تعلیمی منسٹری میں رہا، صورت حال اس قدر خراب نہ ہوئی تھی، طلبہ بدنظمی کا مظاہرہ کرتے تھے، ہڑتالیں ہوتی تھیں، پولیس میں اور ان میں جھڑپ بھی ہو جاتی تھی جو اکثر ان کے سیاسی جوش اور آزادی کی تڑپ کا اظہار ہوتا تھا۔ اس میں ان کے نیتاؤں کی ترغیب اور مثال کو بھی دخل تھا اور عین پسندی کا جذبہ بھی تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال قابو میں تھی۔ استادوں اور والدین کے ہاتھ سے نکلی نہیں تھی۔ اس وقت بھی بہت سے استاد اور حکومت اور اس کے آفیسر اور دوسرے بااثر حضرات جو بالعموم حکومت کا ساتھ دیتے تھے، گاندھی جی کی سیاسی تحریک پر یہ الزام لگاتے تھے کہ اس کی وجہ سے نوجوان بالکل بے مہار ہو گئے ہیں اور جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا (جس کے لئے ان میں سے بہت سے لوگ ذہنی طور پر تیار بھی نہ تھے) تو آزاد حکومت کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک حد تک صداقت تھی، لیکن محض ایک حد تک۔ اس کی وجہ سے یقیناً طالب علموں کی کئی نسلوں نے گویا قانون شکنی کا تجربہ حاصل کیا۔ لیکن جیسا میں نے کہا، اس کی پشت پر ملک کی آزادی کا جذبہ تھا اور وہ جس وقت تشدد کا اظہار کرتے تھے تو وہ اس جذبے کے بے قابو ہو جانے کا نتیجہ ہوتا تھا۔

لیکن شاید یہ صحیح نہ ہوگا کہ اس زمانے کے بدنظمی کے واقعات کا رشتہ براہِ راست موجودہ صورت حالات سے ملا یا جائے۔ اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ذمہ داری نوجوانوں، بالغوں، سیاسی پارٹیوں، حکومت سبھی پر آتی ہے۔ اور سب سے خطرناک عنصر اس میں یہ ہے کہ ان تمام رفیقان جرم میں احتسابِ نفس کی بہت کمی ہے۔ سب ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اور غیر جانب داری کے ساتھ اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہیں دیکھتے۔ طلبہ کی بہت سی مشکلات اور شکائتیں بالکل جائز ہیں اور جب ان کے بڑے اور ان کے استاد اور صاحبان قوت و اختیار، ان کی طرف توجہ نہ کریں تو ان میں غم و غصہ کا پیدا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ وہ نہ صرف ان کی مدد کرنے کی پوری کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کی طرف سنجیدگی سے توجہ بھی نہیں کرتے۔ ان میں اور طلبہ میں مکالمہ کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے۔ جس کو موقع ملتا ہے وہ عقل کے بجائے قوت اور جبر کا استعمال کرتا ہے۔ اور انصاف کے بجائے خودغرضی سے کام لیتا ہے۔ استاد طلبہ کو یہ نہیں سمجھاتے کہ انکے مطالبات میں سے فلاں چیزیں ہمیں منظور ہیں اور ہم ان کو پورا کریں گے فلاں چیزیں ہمارے قابو سے باہر ہیں کیوں کہ ہمارے پاس فی الحال اس کے وسائل اور ذرائع نہیں ہیں۔ اور فلاں چیزیں ہمارے خیال میں نامناسب اور غیر ضروری ہیں اور اس وجہ سے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ صورت ہو گئی ہے۔ کہ بہت سے استاد ایک حد تک روپوشی اختیار کرتے ہیں۔ وہ نرمی اور ملائمت کے وقت سختی اور بے حسی دکھاتے ہیں اور مضبوطی دکھانے کے وقت طلبہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سارا الزام استادوں اور والدین پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس میں طلبہ کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔ جب سمجھ دار آدمی کوئی طریقہ عمل اختیار کرتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اس طریقے سے اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور اس کو اختیار کرنے میں دوسروں کی حق تلفی یا ان پر یا خود پر ظلم تو نہیں کر رہا ہے۔ لیکن جب آج کل کے طلبہ معمولی سی بات پر قانون توڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں یا امتحان کے خلاف ہڑتالیں کرتے ہیں، یا جبراً رعایتی نمبروں کا مطالبہ کرتے ہیں، اپنے پرنسپل یا وائس چانسلر یا سٹاف کا گھیراؤ کرتے ہیں، بسوں اور سنیما گھروں اور پبلک ملکیت کی چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اور جلاتے ہیں، اپنے استادوں کو قتل تک کرتے ہیں، اور اس قسم کی دوسری نازیبا اور کمینی حرکتیں کرتے ہیں۔ تو ان کے ذریعہ انہیں اپنے اصلی اور معقول مقاصد حاصل کرنے میں کہاں تک مدد ملتی ہے؟ اگر وہ تندہی اور دیانت داری کے ساتھ نہ پڑھیں یا امتحان میں کھلم کھلا نقل کریں، یا رعایتی نمبروں کے ذریعے پاس ہو جائیں۔ یا پاس ہونے کے لئے نمبروں کو زبردستی بڑھوالیں، تو شاید انہیں جھوٹے اور بیکار سرٹیفیکیٹ اور ڈگریاں تو مل جائیں۔ لیکن زندگی آگے چل کر انہیں کبھی نہ کبھی بلکہ جلد ہی پکڑے گی۔ وہ نہ کامیاب استاد بن سکتے ہیں، نہ کلرک، نہ ڈاکٹر، نہ انجینئر، نہ تاجر۔ کیوں کہ زندگی کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔ اور اس کی پکڑ بہت سخت۔ وہ تعلیم کس کام کی جو طلبہ کے ذہن میں احتساب نفس کا مادہ پیدا نہ کرے، جو انہیں مناسب اور نامناسب، جائز اور ناجائز، سچ اور جھوٹ، شرافت اور کمینگی میں تمیز کرنا نہ سکھائے۔

وہ کب تک اس عذر کی پناہ لے سکتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی گھٹیا مثال ہمیں غلط راستہ دکھاتی ہے؟۔ وہ تو اپنی زندگی بسر کر چکے۔ یا چند سال میں اس کی مدت ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب ان طلبہ کے ہاتھ میں سماج اور حکومت کی باگ ڈوڑ آئے گی تو وہ زندگی کا کیا بنائیں گے؟ دماغ یہ سوال پوچھتا ہے مگر اس کا جواب نہیں ملتا۔

میں پھر آگے نکل گیا۔ ذکر کشمیر کا تھا۔ مجھے کام کرنے میں زیادہ دقتیں اس لئے پیش نہیں آئیں کہ میرا تعلق کسی خاص سیاسی جماعت یا گروہ سے نہ تھا اور نہ اس ملازمت سے میری کوئی خاص غرض وابستہ تھی۔ ریاست نے مجھے بلایا تھا اور میں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔ وہاں باصرار ٹھہرنے کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں آیا۔ کمزوری تو اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب انسان کرسی کے ساتھ چمٹ جائے پھر ہر قسم کی ذلتیں خاطر نشان کرنی ہوتی ہیں۔

میرا براہ راست سرکاری سابقہ تو پرائم منسٹر سے تھا (اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ ایک مضبوط سیرت منتظم اور دیانت دار آدمی تھے) یا تعلیم کے منسٹروں سے جو مقابلتہً کمزور تھے، اور راستہ میں کوئی خاص روکاوٹیں پیدا نہیں کرتے تھے، علاوہ ان رکاوٹوں کے جو ہر "نوکر شاہی" نظام میں لازمی ہیں۔ ان کو دور کرنے یا کم کرنے کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جن افسران یا پبلک لیڈروں سے مجھے بالواسطہ یا راہ راست سابقہ پڑتا تھا میں نے ان سب سے خوش گوار ذاتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اور ان کو کسی طرح یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص جو کام ہم سے لینا چاہتا ہے وہ اپنی ذات کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ محکمہ تعلیم کے مفاد کی خاطر۔ اس لئے مجھے مشکل صرف اس وقت پیش آتی تھی جب کسی افسر یا لیڈر کا ذاتی فائدہ راستہ میں حارج

ہوتا۔ ورنہ وہ بالعموم مجھے میرے کاموں میں امداد دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس بات کی بھی فکر نہ تھی کہ کون میرا موافق ہے کون مخالف (میں نے افسری کے گن کبھی سیکھے ہی نہ تھے) بعض دفعہ ہفتوں بعد مجھے معلوم ہوتا کہ فلاں اخبار نے میرے خلاف لکھا تھا یا فلاں لوگوں نے اپنے مفروضہ مفاد کی خاطر میرے خلاف کوئی سازش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب تک یہ معلوم ہی نہ ہوتا تو ظاہر ہے میں ان لوگوں سے خلوص و اخلاق سے ملتا اور جب معلوم ہوتا تو اسے اتنی دیر ہو جاتی کہ مجھے ناراضگی اور بد اخلاقی کے لئے کوئی جواز نظر نہ آتا۔ اکثر مجھ سے دوستوں نے کہا ہے تم بہت بے خبر اور بے ضرر آدمی ہو اور ایسے لوگ سرکاری محکمے کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے میرا کہنا یہ تھا کہ لوگوں کی طرف سے عدم اعتماد کی ذہنیت رکھنا، اس کی وجہ سے خود کو پریشان کرنا، اور بعض دفعہ لوگوں پر غلط بد گمانی کرنا کوئی دانش مندی کی بات نہیں۔ اگر کوئی شخص جس بات کو صحیح سمجھے کئے جائے تو ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے بعد مخالفوں کو مخالفت میں بھی زیادہ لطف نہ آئے، بشرطیکہ وہ سب کے ساتھ، خواہ مخالف ہوں یا موافق ایک سا انصاف کا سلوک کرے۔ یہ اصول صحیح ہو یا غلط، میں نے حتی الامکان اس پر چلنے کی کوشش کی اور میرا خیال ہے کہ اس سے فائدہ ہی پہنچا میں گھاٹے میں نہیں رہا۔

میں کشمیر کے سات سالہ قیام پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بعض لحاظ سے یہ میری زندگی کا بہت خوش گوار زمانہ تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ یونیورسٹی کی فضا سے نکل کر جہاں میرا کام صرف پڑھنا پڑھانا تھا، یا اپنی تسکین خاطر کے لئے کچھ لکھنا، تعلیم کے عملی میدان میں کام کرنا پڑا۔ ٹریننگ کالج میں زیادہ تر

استادوں کو نظری طور پر یہ سکھانا اور پڑھانا تھا کہ کس طرح تعلیم دینی چاہئے اور کبھی کبھی اسکول میں جاکر اس کا امتحان کرنا۔ اب جیسا کہ ذاکر صاحب نے کشمیر جاتے وقت مجھ سے کہا تھا، میں نے ایک نیا چیلنج قبول کیا تھا۔ ان نظری اصولوں کو کس طرح عمل کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اس تجربے سے جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو میں محکمہ تعلیم کو دے سکا۔ ایک بات تو اس کی بدولت یہ واضح ہوگئی کہ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اور حال اور مستقبل کے درمیان پل بنانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اکثر اوقات انسان یقین کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اس کو دھند لکے میں راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اور جن مادی وسائل اور ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے بلکہ مشکل سے بھی، فراہم نہیں ہو سکتے۔ اس سے بھی زیادہ بڑی مشکل یہ ہے کہ اچھے کام کرنے والوں کا ملنا بہت دشوار ہے۔ بعض میں تو اس کی صلاحیت سرے سے نہیں ہوتی۔ بعض کی ہمت کو ان کے خاندانی، سماجی اور مالی حالات بالکل توڑ دیتے ہیں اور بعض کے ساتھ ان کے افسروں کا سلوک ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتے جو ان میں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کام کے کرنے کے مادی اور نفسیاتی حالات سازگار ہوں تو معمولی بلکہ اوسط سے کم قابلیت کے استادوں سے بھی اچھا خاصا کام لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے ان کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرنے کی، ان کی ہمت بڑھانے کی، ان کو یہ خاموش یقین دلانے کی کہ جو لوگ ان کے کام کی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہیں انہیں ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ اور سب ایک ہی کام میں لگے ہیں۔ باہمی رفیق کا ان کا تعلق استادوں

سے ایسا نہیں جیسا پولس کا مجرموں اور امکانی مجرموں سے ہوتا ہے۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ان کے ساتھ انسانیت اور مساوات کا سلوک کروں اور مجھے اس سے بہت فائدہ ہوا۔ بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے اسکولوں میں ذرا ذرا سی تبدیلیاں جو بچوں اور استادوں کے تعاون سے کی جائیں، ایک نئی جان ڈال دیتی ہیں اور بچوں کے چہرے پر ان کی وجہ سے جو شگفتگی آجاتی ہے وہ معلم کے لئے بہترین انعام ہے۔ مثلاً گرمی کا موسم ہے، بچے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی کتاب یا قاعدہ پر اونگھ رہے ہیں۔ استاد اپنی کرسی پر مجہولوں کی طرح بیٹھا کچھ بھی نہیں کر رہا ہے۔ اسکول کے باہر شفاف پانی کی ندی بہہ رہی ہے اور چاروں طرف گھاس اُگی ہے اور پھول کھلے ہیں۔ اتنے میں کوئی بچوں کی نفسیات کا شناسا تعلیمی افسر اسکول میں آتا ہے اور استاد سے مشورہ کرنے کے بعد بچوں سے کہتا ہے کہ جاؤ باہر ندی میں نہاؤ، کپڑے دھوؤ، اور جب فارغ ہو جاؤ تو اپنا سبق گھاس پر بیٹھ کر پڑھو۔ اور جی چاہے تو درختوں پر چڑھ جاؤ!۔ اس معمولی سی تبدیلی سے تعلیم کی طرف سے بچوں کا رویہ ہی بدل جاتا ہے۔ اور وہ اس کو بجائے ایک سزا کے ایک انعام یا ایک کھیل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی خیالی تصور نہیں بلکہ آنکھوں دیکھا ایک مشاہدہ ہے!

یونیورسٹی میں استاد کا سابقہ زیادہ تر اپنے ہی جیسے استادوں اور مقابلتہً بالغ نوجوانوں سے پڑتا ہے اس لئے اس میں نئے تجربوں اور مشاہدوں کی گنجائش کم ہوتی ہے سوائے ان کے جو علم کی دنیا میں کئے جائیں۔ اس طرح یونیورسٹی کی دنیا ایک طرح ایک IVORY TOWER

ہے۔ جس میں دنیا کے مکروہات اور تلخ حقیقتوں کا گذر کم ہوتا ہے (کم سے کم جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں یہی صورت حال تھی، اب تو دنیا نے یونیورسٹیوں کے دروازے پر بڑے زور سے دستک دی ہے اور جہاں کہیں دروازے نہیں کھلے انہیں توڑ ڈالا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ تجربہ ہماری تعلیم گاہوں کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ لیکن اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جو افسوسناک ہیں اور جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اب کشمیر پہنچ کر مجھے مختلف قسم اور عمر کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ عملی مشکلات اور مسائل میری توجہ کے گنبد میں داخل ہوئے، کتابی دنیا کے بجائے عملی دنیا میں سوچ سوچ کر قدم رکھنا پڑا اور محض نظریات پر زندگی کی بنیاد رکھنے کی غلط عادت کسی قدر کم ہوئی۔ فکر کی دنیا کا اپنا نشہ ہے اور جو شخص واقعتاً اس دنیا میں اظہار خودی کر سکتا ہے وہ اس میں بڑا اطمینان اور سرور حاصل کرتا ہے۔ لیکن وہ زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتا اس کو ہمیشہ یہ خطرہ دامن گیر رہتا ہے کہ وہ دنیائے آب و گل میں جہاں رونق اور دلفریبی بھی ہے اور دکھ اور درد اور مردم آزادی بھی، ایک اجنبی کی طرح سے زندگی بسر کرے گا اس کی گہرائیوں اور بلندیوں، اس کی کامرانیوں اور محرومیوں سے پوری طرح آشنا نہ ہو پائے گا۔ سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ انسان فکر کی دنیا کے ساتھ ساتھ انسانوں کی دنیا سے بھی ایک خاص تعلق قائم رکھے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعے مالامال کر سکے۔ ہم لوگوں کے لئے جو اپنے خیال میں ملک معنی میں کام کرتے ہیں یہ بہت ضروری ہے کہ عملی دنیا کے ساتھ اپنا رشتہ نہ توڑیں۔ ورنہ ہمارے فکر میں نہ وضاحت پیدا ہوگی۔ نہ ان کا ردعمل زندگی کی زندہ حقیقتوں پر

محسوس ہوگا۔ گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کی اسکیم میں ایک اہم اور بنیادی صداقت یہ پوشیدہ ہے کہ استاد اور طلبہ کو تعلیم اور زندگی کے معنی آفریں رشتے کو کبھی نہ بھولنا چاہئے، کیوں کہ تعلیم میں اس کی وجہ سے جان پڑتی ہے ......

اس وجہ سے یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد اس قسم کا تجربہ میرے لئے مفید ثابت ہوا۔ اگر محکمہ تعلیم میں بطور ایک عام اصول کے یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ اس کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کو گاہے گاہے عملی اور نظری کاموں کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیا جائے تو ان کے لئے مفید ہوگا۔ اب بھی اسکول کی تعلیم کے میدان میں یہ بات مانی جاتی ہے لیکن یونیورسٹیوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح نہیں پہچانا۔ وہ اپنے علمی گنبد میں مگن ہیں۔

کشمیر کے قیام کے دوران مجھے حُسنِ اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے کا موقع ملا۔ میں ان سے سرسری طور پہ ایک دو مرتبہ پہلے مل چکا تھا اور ان کی شخصیت اور کاموں کا میرے دل پر گہرا نقش تھا۔ وہ غالباً ۱۹۴۳ء میں سرینگر آئے تھے۔ حالانکہ حکومت کشمیر نے حکومت ہند کے ایما پر، انھیں روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن چلتی ہوئی ہوا اور بہتے ہوئے سمندر کو کس نے روکا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا تو میں نے جرأت کر کے انھیں اپنے ہاں ایک استقبالیہ دیا اور اپنے چند دوستوں کو جن میں سے بعض حکومت کے افسر تھے، اس میں مدعو کیا، پنڈت جی نے دعوت قبول کرلی۔ لیکن میرے دوست اور جاننے والے اس کی وجہ سے پریشان تھے اور مجھ سے بار بار پوچھتے تھے کہ کیا تم نے مہاراجہ صاحب سے اجازت لے لی ہے، کیا وزیر اعظم سے بات کرلی ہے۔ میں نے کہا کہ میرا

ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے ملک کے ایک محبوب لیڈر کو اپنے ہاں بلایا ہے۔ اس سے نہ مہاراجہ کا کوئی تعلق ہے۔ نہ پرائم منسٹر کا۔ چنانچہ پنڈت جی تشریف لائے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے بعض احباب ان کے ساتھ تھے۔ لیکن میرے بلائے مہمانوں میں سے کئی حضرات ازرہِ احتیاط نہیں آئے اس زمانے میں میری بیوی پردہ میں تھیں۔ لہٰذا ان کی نیابت میری دو نو عمر لڑکیاں زہرا اور بلقیس کر رہی تھیں۔ وہ سب مہمانوں کے پاس جاتیں اور ان سے باصرار درخواست کرتیں کہ وہ کھانے کی چیزیں لیں۔ پنڈت جی کا ذکر انھوں نے بار بار گھر پر سنا تھا۔ اس لئے وہ ان سے بہت مرعوب اور متاثر تھیں۔ چائے ختم ہونے آئی تو انھوں نے دونوں کو بلا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور ان سے دیر تک بہت محبت سے باتیں کرتے رہے۔ میری سب سے چھوٹی لڑکی ذکیہ جس کی عمر چار سال سے کچھ زیادہ تھی برآمدے میں کھڑی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جب پنڈت جی موٹر میں سوار ہوئے تو وہ سیڑھیوں سے اتری اور اٹک اٹک کر اس نے کہا (نہ معلوم کس شکل سے اس نے یہ جملہ بنایا ہوگا) "پنڈت جی! جب میری بہنیں بڑی ہو جائیں گی تو وہ کہیں گی کہ ہمیں پنڈت جی نے اپنی گود میں بٹھایا تھا اور پیار کیا تھا۔ میں کیا کہوں گی!" ان کو بچوں سے جو محبت اور دلچسپی تھی وہ تو سب کو معلوم ہے۔ یہ جملہ سن کر وہ موٹر سے باہر کود پڑے۔ ذکیہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور کوئی پانچ منٹ تک اس سے معذرت اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ سرینگر سے پہلگام گئے تو انھوں نے تینوں کے لئے ایک ایک ہار بھیجا۔ اس دن سے لے کر جب تک ان کا انتقال ہوا، ان لڑکیوں پر، جن میں بعد میں میری سب سے چھوٹی لڑکی سیدہ بھی شامل

ہو گئی تھی) برابر ان کی شفقت رہی۔ جب کبھی ملتے اس خلوص اور یگانگت سے کہ بچیاں یہ بھول جاتیں کہ وہ ہندوستان کے وزیراعظم کے حضور میں ہیں، بس انھیں اپنا ایک شفیق بزرگ نظر آتا... کیسا شریف اور غیر معمولی انسان تھا! مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۶۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو ہمارے گھر میں ایسا ماتم تھا جیسے اپنا ایک قریب ترین عزیز خدا کو پیارا ہو گیا ہو! اب کہ ان کی وفات کو دس[ل] برس کے قریب ہو چکے ہیں۔ اور مجھے دہلی آنے کے بعد دس سال سے زیادہ انھیں خاصا قریب سے دیکھنے کا اور ایک حد تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، میری رائے ان کے بارے میں بالکل نہیں بدلی۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ان میں بعض کمزوریاں تھیں، کس انسان میں نہیں ہوتیں؟ لیکن دوسرے لوگوں کے مقابلے میں پھر بھی کم تھیں اور ان میں سے بیشتر ان کی خوبیوں کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں میں نے ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً مضمون لکھے ہیں۔ ان کی یادگار کے طور پر انسٹی ٹیوٹ اوف سوشل سائنسز میں لکچر دیے ہیں، جس میں سے ایک کا عنوان تھا "نہرو بحیثیت انسان کے" اور دوسرے کا تھا "نہرو کس قسم کا دماغ بنانا چاہتے تھے" ان کے اعزاز میں رفیق ذکریا نے جس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ اس کے لئے ایک باب "نہرو بحیثیت ایک معلم کے" کے عنوان سے لکھا تھا۔ ان چیزوں کو میں یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کے انتقال کے بعد بہت سے لوگوں نے جو ان سے علمی اور اخلاقی اور سیاسی قدوقامت میں کہیں چھوٹے تھے۔ ان پر کیچڑ اچھالنے اور ان کے بے شمار کارناموں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی۔ غلطیاں کون نہیں کرتا؟ لیکن ان کی وجہ سے ان بے شمار احسانوں

[ل] یہاں شاید حساب میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔

کو بھول جانا جو انھوں نے جدید ہندوستان کو بنانے اور اس کی عظمت کو بڑھانے کے سلسلے میں کیے ہیں، احسان ناشناسی کی بہت بڑی مثال ہے۔

کشمیر کے قیام کے دوران ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا۔ میں علم نجوم اور فراست الید وغیرہ پر کوئی خاص عقیدہ نہیں رکھتا۔ بلکہ جو لوگ اس بارے میں زود عقیدہ ہوتے ہیں ان کا ایک حد تک مذاق اڑاتا ہوں۔ ایک دفعہ اسی زمانے میں کسی کام سے میں دلی آیا اور اپنے بھائی اظہر عباس کے پاس ٹھہرا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گئے جو سپلائی ڈسپوزل کے محکمہ کا جزو تھا اور اپنے ایک ساتھی ارنسٹ جوزف سے ملایا جو جنوبی ہند کے رہنے والے تھے اور کہا کہ ان میں دو خاص باتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ تصویریں اور مختلف ڈیزائن بہت خوب صورت بناتے ہیں۔ اس بارے میں تو بعد کے سالوں میں ان کے بہت سے کارنامے دیکھنے میں آئے۔ انھیں واقعتاً اس میں کمال حاصل تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی کا ہاتھ پڑھ کر اس کے بارے میں بہت سی باتیں بتا سکتے ہیں۔ میں نے حسب معمول اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد اظہر سے میں نے بہ سبیل تذکرہ یہ کہا کہ سرتیج بہادر سپرو کا میرے پاس خط آیا ہے کہ ہندوستان کی طرف سے ایک غیر سرکاری وفد امریکہ جا رہا ہے۔ اگر حکومت کشمیر اجازت دے تو وہ چاہتے ہیں کہ مجھے اس میں شریک کریں۔ میں نے اس بارے میں حکومت کو خط لکھا ہے۔ اس پر جوزف نے کہا کہ کیا میں آپ کا ہاتھ دیکھ سکتا ہوں؟ اور پھر خاصی دیر تک انھوں نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھیں اور مجھ سے کہا کہ میں تو کسی قریبی سفر کا نشان آپ کے

ہاتھ میں نہیں دیکھتا۔ میں مسکرا کر چپ ہو رہا۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ میرا اس وفد میں شامل ہونا طے ہو چکا ہے اور حکومت کشمیر نے بے ضابطہ طور پر مجھے بتا دیا تھا کہ اجازت مل جائے گی۔ لیکن اتفاقاً اس اجازت کے ملنے میں اس قدر دیر لگی کہ جب میں نے سر تیج بہادر سپرو کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے معذرت کا خط لکھا کہ چونکہ تمھاری حکومت یا تمھارا جواب نہیں آیا۔ اس لئے ہم نے آخری وقت میں سید حسین صاحب کو (جو امریکہ میں مقیم تھے) وفد کا ممبر نامزد کر دیا ہے۔ لہٰذا میرا جانا تو ختم ہوا لیکن جوزف کی پیشین گوئی پوری ہوئی! .... لیکن یہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کے چند ماہ کے بعد پھر میرا دہلی آنا ہوا اور جوزف سے اظہر کے ہاں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے دوبارہ میرا ہاتھ دیکھا اور کہا کہ تم عنقریب ہندوستان سے باہر جانے والے ہو۔ میں نے کہا کہ مجھے تو فی الحال اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن جوزف کا اصرار تھا کہ تمھارے ہاتھ میں سفر کی لکیریں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ واپس گیا تو اطلاع ملی کہ مجھے لنڈن کی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے ایک وفد میں شریک کیا گیا ہے اور دو تین ہفتے کے اندر مجھے آسٹریلیا جانا ہے اور ابھی اس وفد کا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ حکومت ہند کی طرف سے آسٹریلیا ہی میں اطلاع ملی کہ حکومت ہند نے یونسکو کی ابتدائی کانفرنس میں شرکت کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔ اور پھر بیرونی ملکوں کے سفر کا ایسا تانتا بندھا کہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۰ء تک شاید ہی کوئی ایسا سال گذرا ہو کہ ایک یا دو یا تین بار مجھے ہندوستان سے باہر جانا نہ پڑا ہو۔

جب ان مثالوں کا (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے)، اور کفایت اللہ صاحب

کی پیشین گوئی کا خیال کرتا ہوں تو رسل کا مشورہ یاد آتا ہے کہ جب کسی بات کا پورے وثوق کے ساتھ علم نہ ہو تو اس کو نہ غلط سمجھو نہ صحیح۔ بلکہ ان کی طرف سے اپنے فیصلہ کو معطل اور رائے کو محفوظ رکھو۔ کسی امر کے بارے میں جلد بازی سے حکم لگا دینا کہ یہ بالکل غلط یا ٹھیک ہے۔ دماغ کی پختگی کی دلیل نہیں۔ ممکن ہے ٹھیک ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ اور کیا شیکسپیئر نے ہیملٹ میں نہیں لکھا "اے ہوریشیو زمین اور آسمان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا تمھارے فلسفہ میں کوئی ذکر نہیں ہے"۔ اور بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں ابھی تک ہمیں کوئی قطعی علم نہیں ہے۔

میرا قیام کشمیر میں سات سال رہا۔ ابتدا میں سر گوپالا سوامی آئینگر نے دو سال کے لئے میری خدمات علی گڑھ سے مستعار لی تھیں۔ اس کے بعد حکومت نے ایک دفعہ دو سال اور اس کے بعد تین سال کی توسیع دی۔ اسی دوران میں آئینگر صاحب کا زمانۂ وزارت ختم ہو گیا تھا۔ انھوں نے بہت کامیابی اور خوش انتظامی کے ساتھ اپنا عہد حکومت ختم کیا، وہ مضبوط آدمی تھے۔ کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے، مہاراجہ صاحب کو بھی زیادہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن ریاست میں جو سیاسی تحریک شیخ عبداللہ کی سرکردگی میں پیدا ہوئی تھی اس کو بھی انھوں نے اپنی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی۔ لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے اس میں انھوں نے گھٹیا چالوں سے کام نہیں لیا۔ جو کچھ کیا کھلے بندوں کیا۔ مگر سیاسی پارٹیاں ان سے خوش نہ تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انھیں لوگوں کو خوش کرنے سے زیادہ یہ فکر رہتی تھی کہ

جس بات کو خود ٹھیک سمجھیں اس پر سختی کے ساتھ عمل کریں۔ مجھ سے ان کے مراسم ہمیشہ خوش گوار رہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ میں اپنے کام کو شوق اور ایمانداری سے کرتا ہوں۔ دوسرے جب بھی میں ان سے ملنے جاتا تو بجائے سارے وقت اپنے محکمہ کی مشکلات کا رونا رونے یا اپنے "کارناموں" کا ڈھنڈورا پیٹنے کے زیادہ وقت سیاسی ادبی، سماجی مسئلوں پر گفتگو کرنے میں صرف ہوتا۔ شاید ان کو ریاست میں ایسے لوگ بہت کم ملتے تھے جن کی اس قسم کی دل چسپیاں ہوں۔ اس لئے ان کو عام مسئلوں پر تبادلہ خیالات کرنے کا یہ موقع غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ان کی وزارت کا زمانہ ختم ہونے سے کچھ پہلے جب مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۳ء میں مرن برت رکھا تھا اور ملک بھر بلکہ دنیا بھر کے لوگ اس کی وجہ سے پریشان تھے لیکن انگریزی حکومت ان کو رہا کرنے پر آمادہ نہ تھی، انھوں نے بہت جرأت سے کام لے کر وائسرائے کے نام ایک تار بھیجا جس میں لکھا تھا کہ "کشمیر کے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی حیثیت سے آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ مہاتما گاندھی کو فوراً قید سے رہا کر دیجئے۔ اگر وہ قید کی حالت میں وفات پا گئے تو حکومت برطانیہ کا چہرہ تاریخ کی نظر میں ہمیشہ کے لئے سیاہ ہو جائے گا۔" یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت کا کوئی افسر یا سابق افسر، یا ریاستوں کا افسر وائسرائے کی شان میں ایسی گستاخی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس جرأت مندانہ اقدام سے میری نظر میں ان کی وقعت اور زیادہ ہو گئی۔

آئینگر صاحب کے بعد ریاست کے وزیر اعظم سر کیلاش ناتھ ہکسر ہوئے۔ اور پھر سر مہاراج سنگھ! وہ ایک شریف اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ لیکن ریاست کے نظم و نسق کو اس حد تک اپنے قابو میں نہ رکھ سکے جس طرح آئینگر صاحب نے رکھا تھا۔ ان کی دو سال کی مدت بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ مہاراجہ نے ان کے بارے میں ایک فرمان جاری کیا کہ انھوں نے درخواست کی ہے کہ ان کی صحت کے پیش نظر ان کو ریٹائر کر دیا جائے اور مہاراجہ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی ہے۔ اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو سبکدوش کرتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا اور ان کی صحت کے بارے میں سوال کیا۔ تو انھوں نے جواب دیا "میری صحت، وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہیں" دل میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا تھا؟ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی، ان کے بعد سر بی۔ این۔ راؤ۔ وزیر اعظم ہوئے جن کی قانونی قابلیت اور دیانت داری کی دھوم تھی۔ وہ ایک بہت متوازن، خلیق، انصاف پسند شخص تھے۔ انھوں نے بعد میں ہندوستان کا آئین بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان سے بھی میرے مراسم بہت خوش گوار رہے۔ ان کی انتظامی صلاحیت تو آئینگر صاحب جیسی نہ تھی۔ اور نہ وہ طبیعت کے لحاظ سے ریاست کی سازشوں اور پارٹی بازیوں کا مقابلہ کرنے کا دماغ رکھتے تھے۔ لیکن ان میں بہت سی ذاتی خوبیاں تھیں۔ جنھوں نے ان کو عام طور پر خاصا ہردل عزیز بنا دیا تھا۔ جب ۱۹۴۵ء میں میرے تقرر کی مدت ختم ہونے کو آئی، تو انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں تمھیں تین سال کی توسیع اور

دینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تک علم ہو چکا تھا کہ وہ خود ریاست کے عام حالات سے بددل ہیں اور زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ آئندہ تین سال تک یہاں ٹھہریں گے؟ انھوں نے صاف گوئی سے جواب دیا کہ نہیں۔ مجھے خود اس بات کا یقین نہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ ایسی حالت میں میرا قیام بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ علاوہ اور باتوں کے مجھے معلوم تھا کہ ان کی جگہ پنڈت رام چندر کاک وزیر اعظم مقرر ہوں گے۔ اور مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ان کے وقت میں بغیر پارٹی بازی میں گرفتار ہوئے کوئی مفید تعلیمی کام کر سکوں گا۔ اس پر بھی اس مرد شریف نے کہا کہ بہر حال میں تمھارے پاس تین سال کی توسیع کا حکم بھیجتا ہوں، اگر تم چاہو تو اس سے انکار کر سکتے ہو۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ حکومت نے تمھارے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور میں نے اپنا۔

ریاست سے واپسی کے وقت دوستوں اور ساتھیوں، اور حکام نے بہت تپاک اور مہربانی سے رخصت کیا، اور استحقاق سے زیادہ کام کی تعریف کی۔ اس سلسلے میں آخری تقریب جموں میں ہوئی جہاں ریاست کے بیشتر عمائدین اور میرے اپنے محکمے کے بہت سے کارکن موجود تھے۔ مجھے یاد

ہے کہ رخصتی تقریروں کے بعد جب مجھے جوابی تقریر کرنی پڑی تو میں نے اس کے دوران میں کہا کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ریاست میں کس شخص نے مجھے اپنی فرض شناسی اور دیانت داری سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ (اور یہ کہہ کر میں ذرا دیر کے لئے ٹھہرا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں نے حاضرین میں سے بعض اعلےٰ افسروں کے چہرے پر اس توقع کے اعتراف کے آثار دیکھے .....) تو وہ جمعدار سنت رام ہے، جو آپ سب کے پیچھے آخری قطار میں کھڑا ہے۔ اس پر ایک سناٹا سا ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے سات سال تک میری منصبی اور ذاتی حیثیت میں ایسی خدمت کی تھی کہ میں اس کا پورا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ میری بیوی اس کی ایسی قدر کرتی تھیں کہ کشمیر سے واپسی کے بعد بھی کئی سال تک اپنے ہاتھ سے اونی پُل اوور بن کر اس کو بھیجتی رہیں۔

کشمیر کو میں نے اپنی مرضی سے چھوڑا۔ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ جہاں اچھا کام کرنے کا امکان نظر نہ آئے وہاں کسی کو اپنی زندگی ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ (بشرطیکہ اس کے لئے ایسا کرنا ممکن ہو، کیوں کہ بیشتر افراد تو اپنے کاروبار یا ملازمت میں اس طرح پھنسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے اس کو ترک کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کو میں قابل معافی سمجھتا ہوں) لیکن بعض دفعہ ایسے حالات بھی پیدا ہوتے ہیں کہ محض روزی کمانے کی خاطر انسان کو اپنی دیانت، اپنی اصول پسندی کے

ساتھ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھ کر "مکھی نگلنی پڑتی ہے۔" جب ایسی صورت ہو تو ایک ایماندار آدمی کے لئے عزت نفس قائم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مجھے تو خود ایسی صورت حال سے بہت کم سابقہ پڑا ہے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسروں سے یہ مطالبہ بالکل بجا ہے یا نہیں۔ لیکن بہر حال میری رائے یہی ہے۔

بھائی بہن

میں نے اپنے کچھ عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں کا ذکر کہیں کہیں اس کتاب میں کیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مختصر سا حال اپنے بعض اور قریب ترین عزیزوں کا بھی لکھ دوں۔ ان میں پڑھنے والوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن شاید کسی شخص کو سمجھنے میں، ان اثرات کا اندازہ کرنے میں جن سے اس کی سہولیت کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ خواہ وہ برا ہو یا اچھا، ان لوگوں کو جاننا مفید ہو سکتا ہے۔ اور بہر حال میرے لئے ان کی بہت اہمیت ہے کیوں کہ وہ میری زندگی کا جزو ہیں یا رہے ہیں۔ اور اس قسم کی کتاب میں کبھی کبھی لکھنے والا گویا خود کلامی بھی کرنا چاہتا ہے اور سینے کے داغوں اور چراغوں سے اپنی زندگی میں اجالا کرنا بھی۔

میرے والدین کی اولاد میں میرے سوا چار بچے اور ہوئے جو سنِ شعور کو پہنچے۔ ایک میرا چھوٹا بھائی اظہر عباس، میری بڑی بہن بیگم ممتحن زیدی اور دو چھوٹی بہنیں سیدہ خاتون اور صالحہ عابد حسین۔ ان میں سے سیدہ خاتون تو کوئی اکیس سال ایک شعلۂ مستعجل کی طرح اپنے ماحول کو روشن کرنے کے بعد خدا کو پیاری ہو گئی۔ صورت، سیرت، ذہانت کے اعتبار سے وہ شاید ہم سب میں افضل تھی۔ اس کی ذات سے بہت

امیدیں وابستہ تھیں، محض بربنائے محبت ہی نہیں بلکہ اس مختصر سی زندگی ہی میں اس نے امیدوں کا عقلی جواز پیدا کر دیا تھا۔ کہتے ہیں، شاید سچ ہی کہتے ہیں کہ جس کو خدا چاہتا ہے اکثر اپنے پاس جلد ہی بلا لیتا ہے خاندان کی بعض اور شاخوں میں بھی میں نے قدرت کا یہ ستم دیکھا ہے کہ موت ہاتھ بڑھا کر ان کے سب سے شگفتہ شاداب اور خوش مہک پھول کو توڑ لیتی ہے میں نے اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" میں اس کے بارے میں لکھا ہے:-

"اس چھوٹی سی ہی عمر میں، ایک ایسے موقع پر جب ہم سب (اپنی والدہ کے انتقال کی وجہ سے) ایک شدید حادثہ کی آندھی میں گھرے ہوئے تھے، اس نے دراصل ایک چراغ کا کام دیا اور بڑے دلنواز طریقے سے ہمارے زخم کو مندمل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی واحد ادبی یادگار ایک فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو خادمات خلق کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض ان نامور خواتین کے حالات درج ہیں۔ جنھوں نے اپنے اپنے خاص میدان میں بنی نوع انسان کی قابل ذکر خدمات انجام دی تھیں۔ موضوع کے انتخاب ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت کا رجحان کس جانب تھا۔ بعض دفعہ تعجب ہوتا ہے کہ انسان اپنے محدود (یا غیر محدود) حلقہ میں رہ کر تھوڑی سی عمر میں کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ تشبیہ دینا مقصود نہیں۔ لیکن مثال کے طور پر دیکھئے کہ حضرت عیسیٰ کی عمر صرف تیس سال کی تھی اور سوامی ویویکا نند کی غالباً چھتیس سال کی، لیکن انھوں نے تاریخ عالم کے اسٹیج پر کیا کچھ نہیں کر دکھایا۔ یہی حال ایک بہت چھوٹے پیمانے پر اس جان ہار کا تھا۔

ڈاکٹر عابد حسین نے اس کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا۔

جس میں ایک شعر تھا ؎

چناں کم زیست اماں خوب تر زیست
عیاں شد از حیا نقش شانِ زہرا

اظہر عباس میرا چھوٹا بھائی تھا۔ بڑا صاف باطن، خوش باش، خوش گفتار، خوش مزاج، خوش پوشاک، محبت شعار، فیاض، ہر دلعزیز وضعدار، ہنس مکھ! جوانوں میں ان کا ہم عمر اور ہم مشرب، بچوں میں ان کا ساتھی، بزرگوں کے سامنے سعادت مندی کا نمونہ، ہر کسی کا کام کرنے کو تیار، زندگی کا بڑا حصّہ اپنی خاص شان اور ادا کے ساتھ بسر کیا۔ آخری زمانے میں بعض ذاتی پریشانیوں اور خارجی رنجشوں کی وجہ سے اس کی زندگی میں بعض محرومیاں پیدا ہو گئیں جن کا اثر اس کی طبیعت پر پڑا۔ مگر واہ رے ہمت اور غیرت کہ اس کو حتیٰ الامکان ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جس کسی نے تکلیف پہنچائی اس کا برا نہیں چاہا۔ جو اپنا حق تھا اس کا نہ صرف مطالبہ نہیں کیا بلکہ اپنے قرضداروں تک سے ہمیشہ آنکھ چرائی گویا وہ اس کے قرض خواہ تھے! جو کسی کو دینا تھا اس میں کبھی تامل نہیں کیا۔ پانی پت میں ایک خاندانی مکان تھا۔ جب تقسیم ہند کے بعد پانی پت میں مغربی پنجاب کے آئے ہوئے شرنارتھیوں نے بستی بسائی اور مسلمان پانی پت سے نکل گئے تو اس مکان میں ایک سکھ خاندان آکر ٹھہر گیا۔ ہمارا سارا خاندان ہندوستان میں تھا۔ اور ہم میں سے کوئی شخص ملک چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ لیکن اس زمانے کی افراتفری اور دھاندلی میں جو تھوڑی سی جائداد تھی اس پر کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا اور غالباً دس سال کے بعد وہ بہت مشکل سے واگذار ہو گئی۔ حالانکہ وزیر اعظم پنڈت نہرو

اور مولانا آزاد سے لے کر حکام محکمہ تک سب کو معلوم تھا کہ وہ ہماری ملکیت ہے اور اسی لئے اس کے واگذار ہونے میں دلچسپی لے رہے تھے .... بہرحال جب ہمیں اس کا قانونی قبضہ مل گیا، تو میں نے اظہر سے کہا کہ اب تم پانی پت جا کر اس جائداد کو فروخت کرنے کا انتظام کرو۔ چنانچہ وہ گیا اور اس سکھ خاندان کے افراد سے بات کی۔ سربراہ خاندان نے اس سے کہا کہ دیکھئے ہم تو آپ ہی کے بال بچے ہیں (وہ مرد شریف عمر میں اظہر سے کہیں بڑا تھا) اور ہمارے پاس تو بس پانچ ہزار[1] روپے ہیں۔ ہم یہی دے سکتے ہیں معلوم نہیں یہ بات سچ تھی یا غلط۔ لیکن ایک تو میرا بھائی انکار کرنا نہ جانتا تھا، دوسرے اس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ پچیس تیس ہزار کا مکان پانچ ہزار میں فروخت کر کے اطمینان کے ساتھ لوٹ آیا۔ جب میں نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا تو اس نے جواب دیا۔ "بھائی جان میں کیا کرتا۔ مجھ سے انکار نہیں ہو سکا۔ ایک سفید داڑھی والا آدمی اس قسم کی درخواست منت کے ساتھ کرے تو کوئی کیسے اس کو ٹال سکتا ہے؟" یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ۔ لمبی عمر کی ایک سخت سزا یہ ہے کہ ہم اپنے بہت سے دوستوں اور عزیزوں کو، جن میں سے بعض ہم سے کم عمر ہوتے ہیں ایک ایک کر کے ختم ہوتے دیکھتے ہیں گیا جیسے خزاں کے موسم میں پت جھڑ ہو رہی ہو۔ لیکن اس انسانی پت جھڑ کے لئے خزاں کی بھی شرط نہیں۔ ہر موسم، موسم خزاں ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن یہ دراصل جبر کی تلقین ہے کیوں کہ:-

---

[1] حقیقت میں اس نے صرف چار ہزار روپے دیے تھے۔

میانِ عشق و صبوری ہزار فرسنگ است

اکثر خیال آتا ہے کہ کیا سودا ان دا موں چوکھا ہے۔ پھر شاید مذہبی تعلیم اور پرانی روایتوں کی بنا پر اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی مرضی میں کسی کا کیا بس ہے؟ سوچتا ہوں کہ جن حساس لوگوں کے پاس یہ تسلی بھی نہیں ان کے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ شاید ایک ہی حقیقت ہے جو یقیناً ہر جاندار کو پیش آتی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ پیش آئے گی لیکن کس قدر مشکل ہے اس کے ساتھ نباہ کرنا.... اور پھر انگریزی شاعر ٹینی سن نے یہ بھی تو کہا ہے کہ "محبت کرکے کھو دینا اس سے بہتر ہے کہ انسان نے محبت ہی نہ کی ہو" کیوں کہ محبت دل کو گداز کرتی ہے۔ انسان کی انسانیت کو جگاتی ہے اور اپنی عزیز یادیں چھوڑ جاتی ہے جو ہماری زندگی کو مالامال کرتی ہیں۔

اب اس پنجتنی گروہ میں سے صرف میری ایک چھوٹی بہن زندہ ہے۔ مجھ سے بڑی بہن بیگم مستحسن زیدی تھیں۔ ان میں بچپن ہی سے بہت طباعی اور ذہانت تھی۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ لیکن بہت شوق سے پائی۔ ان کے زمانے تک لڑکیوں کی تعلیم عام نہ تھی اور ان کے لئے مدرسے خال خال تھے۔ اور چھوٹے قصبوں میں تو تعلیم کا انتظام ہی نہ تھا۔ لیکن ان کا پڑھنے کا شغل ہمیشہ جاری رہا۔ البتہ شادی کے بعد گھر کے کام کاج اور ذمہ داریوں میں اور اولاد کی تربیت میں گھر جانے کی وجہ سے وہ اپنے شوق کی تربیت نہ کرسکیں۔ اور وہ ایک حد تک افسردہ ہو کر رہ گئے۔ تاہم انھوں نے اپنی شعر کی صلاحیت کو زندہ رکھا اور گو ان کا حلقہ قصیدہ، سلام اور مراثی تک محدود رہا۔ لیکن اس میں اچھا کہہ لیتی تھیں۔ ان کے کلام

کا ایک مجموعہ چمنستان عقیدت کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی شادی میرٹھ کے ایک مشہور بیرسٹر سید محمد مستحسن زیدی سے ہوئی جو محمد حسین شوق کے صاحبزادے تھے۔ بہت ہی فرشتہ صفت انسان تھے۔ پیشے میں کامیاب اور نیک نام شریف وضعدار، خوش مذاق، شعر و شاعری سے دل چسپی، کنبہ پرور اور فیاض۔ باغ بانی اور شکار کے شوقین۔ لیکن پھر وہی ہوا کہ جس کو خدا چاہتا ہے جلد اٹھا لیتا ہے۔ چنانچہ میری بہن مقابلتاً کم عمری میں بیوہ ہو گئیں۔ ان کے خیالات بچپن سے بہت مذہبی تھے۔ لیکن ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ جب ان کی لڑکیوں پر اپنی تعلیم کے زمانے میں اور نوجوانی کے حساس تقاضوں سے کمیونزم کا اثر پڑا تو وہ بھی خلاف توقع اس سے خاصی متاثر ہوئیں۔ غالباً ۱۹۵۰-۵۱ء کا واقعہ ہے کہ ان کی تین لڑکیوں نے یو۔ پی۔ کانگرس حکومت کے خلاف کسی سیاسی جلوس میں حصہ لیا اور پولیس نے اس پر حملہ کر دیا جس میں ایک لڑکی کا دانت شہید ہو گیا اور سر میں بھی چوٹ آئی اور ان تینوں کو اور بعض دوسرے نوجوانوں کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر قید خانے میں بند کر دیا گیا (جہاں انھوں نے سختی کے خلاف بھوک ہڑتال بھی کر دی) میں اس زمانے میں حکومت ہند میں وزارت تعلیم کا جوائنٹ سکریٹری ہو کر دہلی آ چکا تھا۔ میری یہ بہن جنھوں نے ساری عمر سخت پردہ کیا تھا اپنی فطری محبت سے بیتاب ہو کر دہلی آئیں۔ مجھے اس کی خبر نہیں کی۔ کیوں کہ مجھ سے اس وقت نہ معلوم کیوں ذرا ناخوش تھیں (گویا میرا بھی حکومت یو پی سے کوئی تعلق تھا!) اور سیدھی پارلیمنٹ ہاؤس میں پنڈت نہرو کے دفتر میں جا پہنچیں۔ خیال کیجیے کہ ایک مسلمان خاتون جس نے کبھی برقعہ نہ اتارا ہو، کبھی تنہا سفر نہ کیا ہو، کسی غیر مرد سے انٹرویو نہ کیا ہو اس طرح ملک کے وزیراعظم کے

پاس جائے! ماں کی محبت کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ پنڈت جی کو اطلاع کرائی۔ کہ سیدین کی بہن ملنے آئی ہے۔ ان کا تو عجیب اخلاق تھا۔ فوراً بلا لیا اور حال دریافت کیا۔ وہ تو بھری بیٹھی تھیں۔ برقع میں چہرہ ڈھانپے جو کچھ دل میں تھا سب کچھ کہہ ڈالا۔ یو۔پی۔ کی حکومت کو بُرا بھلا کہا، خود وزیر اعظم پر تنقید کی، کہ "آپ کی حکومت" میں یہ ظلم ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں میری بیٹیاں زندہ بھی ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہوں تو کیجئے ورنہ پھر خدا کے دربار میں آپ کی حکومت کے خلاف شکایت کروں گی (ہمارے ہاں خدا کمیونزم کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے) وہ شاید دربارِ الٰہی میں اپیل کرنے کی دھمکی سے اتنا متاثر نہ ہوئے ہوں لیکن اس واقعہ کے انسانی پہلو کی چوٹ ان کے انسانی دل پر پڑی۔ انھوں نے سب کچھ بہت دھیرج سے سنا اور کہا گھبرائیں نہیں جو کچھ ممکن ہو سکے گا میں کروں گا۔ مجھے اس واقعہ کی اس وقت کوئی خبر نہیں ہوئی۔ لیکن میرا کسی کام سے پارلیمنٹ کی عمارت میں جانا ہوا وہاں پنڈت جی سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہو گئی۔ میرا بازو پکڑ کر مجھے ایک طرف لے گئے۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہا جس میں ہمدردی کے ساتھ کچھ محظوظ ہونے کی شان بھی ملی ہوئی تھی "تمھاری بہن کل میرے پاس آئی تھیں اور اپنی لڑکیوں کا ذکر کیا تھا...... انہیں اطمینان دلا دینا کہ میں نے اس بارے میں ضروری کارروائی کر دی ہے۔" اس واقعہ کا ذکر ذرا تفصیل سے میں نے اس لئے کیا کہ اس سے پنڈت جی کی سیرت پر بڑی دلفریب روشنی پڑتی ہے۔ ایک شخص ہے جس پر تمام ملک کی ذمہ داری اور چالیس کروڑ انسانوں کے مسائل کا بوجھ ہے۔ اور بحیثیت وزیر خارجہ کے دنیا کی ذمہ داری بھی حصہ رسد بلکہ اس سے زیادہ اس کے شانوں پر ہے۔ مگر جب کوئی انسانی

معاملہ سامنے آتا ہے تو وہ اس کی اپیل کو محسوس کرتا ہے، اس کے لئے وقت نکالتا ہے اور اس کو اپنی فوری توجہ دیتا ہے۔ اہل قوت و اختیار میں کتنے لوگ ایسے ملیں گے جن کی انسانیت کو قوت کا زہر سلب نہیں کر لیتا؟

ان کی لڑکیوں نے بھی اپنی ننھیال اور ددھیال کی طرف سے ذوق شعر ورثہ میں پایا ہے۔ زاہدہ اور ساجدہ دونوں ہونہار شاعر ہیں۔ لیکن باقی سب بہنوں میں بھی ادب کا اچھا ذوق ہے۔ ان کی تعلیم ہندوستان میں بھی ہوئی ہے اور ہندوستان سے باہر بھی۔ لیکن اس خاندان کو بھی اس المیہ سے دوچار ہونا پڑا یعنی اس کی گل سر سبز صابرہ زیدی کو، جو قابلیت، شرافت، انسانیت اور توازن طبیعت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھی موت نے چھن لیا اور ان تمام توقعات کو جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں مکمل نہیں ہونے دیا۔ لیکن توقعات تو زیادہ تر ان خارجی کاموں اور کارناموں کا نام ہے۔ جو ایک شخص اپنی زندگی میں انجام دیتا ہے اور ان کی بڑی قیمت ہے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ بیش بہا ہے آدمی کی ذات، اس کی اقدار، اس کے اصول، اس کی انسان دوستی، اس کی محبت اور ہمدردی کی دولت جو آخری سانس تک موت اس سے نہیں چھین سکی، کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ غم دراصل مرنے والوں کا نہیں ہوتا پیچھے رہنے والوں کا ہوتا ہے۔

میری چھوٹی بہن صالحہ عابد حسین اردو کی ایک جانی بوجھی اور قابل مصنفہ ہے جس کی کہانیاں اور ناول اور تنقیدی تحریریں بہت سے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اور ادب کے دربار میں بار پا چکی ہیں اسکے "مصنف" بننے کی داستان بھی خاصی دل چسپ ہے۔ بچپن سے لکھنے کا شوق تھا جو شاید اس نے اپنے ماحول سے حاصل کیا تھا۔ "تصنیف" کا کاروبار اس

وقت سے شروع ہو گیا تھا جب بعض لفظوں کے ہجے کرنے بھی نہ آتے تھے۔ (بعض کو تو کبھی بھی نہیں آتے!) لکھتی اور اپنی کاغذی دولت کو حفاظت اور چشم بد سے دور رکھنے کے خیال سے ایک تھیلی میں بند کر دیتی تھی۔ اس تھیلی کا نام "خفیہ تھیلی" تھا (ے کے نقطے غائب تھے) اور تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ خفیہ تھیلی ہے اس لئے یہ نام اس کے اوپر نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا کافی بڑی عمر تک اس کی سہیلیاں اور بھائی بہن اس نام کے بارے میں اس کو چڑاتے رہے ..... اس کی زندگی کافی سختیوں اور بیماریوں میں گذری ہے اور ایک دفعہ تو وہ شادی کے سال بھر بعد اس قدر شدید بیمار ہو گئی تھی کہ جب اس کے معالج (دہلی کے نامور سرجن ڈاکٹر جوشی) نے اس کا کیس کسی میڈیکل جرنل میں رپورٹ کیا تو انھیں اس پر ایک خاص اعتراف ملا ..... بہرحال یہ چکّی کی مشقت اور مشق سخن ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہی اور کارگہِ فکرد ذوق میں افسانوں، ناولوں اور ادبی مضامین کے انجم ڈھلتے رہے۔ ابتدا میں نیم مزاحیہ انداز میں ان پر تنقید کرنے کے دوران میں میں نے بظاہر یہ کوشش کی کہ اس کو لکھنے سے روکوں۔ دراصل میں اس کے "شوقِ فضول وجراتِ رندانہ" کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ جب اس نے ادبی ذوق کی سنجیدگی، شوق کی پختگی اور تحریر کی صلاحیت کو ثابت کر دکھایا اور لکھنے کے شغل میں نہ سردی حائل ہوئی نہ گرمی، نہ بیماری نے اس کو مضمحل کیا نہ زندگی کی فکروں اور غموں نے اس کو افسردہ کیا بلکہ ایک طرح سے اس نے اپنی تمام دوسری محرومیوں کا بدل بنا لیا تو میں نے اور دوسرے عزیزوں خصوصاً اس کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین نے اس کی ہر طرح ہمت افزائی کی (حالانکہ اس کی ہمت ڈھیلی کب ہوئی تھی کہ اس کو بڑھانے کی ضرورت ہو!) اور اس نے

اردو ادب میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کر لیا۔ اس اثنا میں ہندوستان میں ریڈیو کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ریڈیو کے لئے بہت سی تقریریں کی ہیں فیچر اور ڈرامے لکھے ہیں اور اب اس کا شمار ریڈیو کے چوٹی کے اردو مقررین میں ہوتا ہے ...... ساتھ ہی اس نے اپنی والدہ سے ہمدردی، نوع خواہی اور محتاجوں اور ضرورت مندوں کی دست گیری ورثہ میں پائی ہے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر لوگوں کی مدد اور خدمت کرتی ہے اور ہر طرح ان کا بوجھ اٹھانے میں شریک ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بتقاضائے بشریت اس کو قدرت سے یہ گلہ ہوتا ہے کہ اس کے شوہر کو کبھی وہ پورا اعتراف نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ لیکن خود انھوں نے ساری عمر خوشی خوشی اعلیٰ ادبی اور علمی مشاغل میں زندگی گزار دی اور کبھی عسرت کو محرومی نہیں سمجھا، دوسروں کی ترقی اور شہرت سے خوش ہوئے اپنے لئے نہ ایک کی کوشش کی نہ دوسری کی بلکہ جو دنیاوی لحاظ سے اچھے مواقع ان کے راستے میں آئے انہیں یہ کہہ کر ہٹا دیا کہ تم میرے مقاصد میں مخل ہو گئے۔ میرے سامنے مت آؤ۔!

صالحہ کا یہ گلہ اپنی جگہ پر قائم رہا لیکن کبھی اس کے ادبی کاروبار میں مخل نہیں ہوا..... کتابیں لکھ لکھ کر ہمارے روشن خیال ادب نواز دیس میں کون روپیہ کما سکتا ہے؟ کتاب چھپ جائے اور لوگ اس کو پڑھ لیں تو صالحہ جیسے ادیبوں کے لئے یہ بھی غنیمت ہے۔ تقسیم ہند کے وقت اس کی بعض کتابوں کا اسٹاک "جامعہ بک ڈپو" اور "کتابی دنیا" میں محفوظ تھا جب وہ دونوں لوٹے گئے تو اور کتابوں کے ساتھ اس کی کتابوں کے ورق بھی یا تو پرچونیوں کے کام آئے یا لوگوں نے ان کو بہت سستے داموں لوٹنے والوں سے خریدا اور پڑھا۔ یہ تو میں نے معلوم کرنے کی ہمت نہیں کی کہ پرچونیوں کے

بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ سادہ دل اس خیال سے خوش تھی کہ مغربی پنجاب کے اردو داں شرنارتھیوں نے اس کی کتابوں کو پڑھ تو لیا!

خواجہ احمد عباس جن کا نام بحیثیت ایک مصنف اور صحافی اور فلم ڈائریکٹر کے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہے، میرا چچا زاد بھائی ہے۔ لیکن میرے ہاں کبھی "حقیقی" اور "چچا زاد" بھائیوں میں تمیز نہیں ہوئی اور احمد عباس کے لئے تو یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔ اس نے علی گڑھ کی تعلیم کے زمانے ہی میں طے کر لیا تھا کہ وہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرے گا، یہ جانتے ہوئے کہ اس میں بڑی عسرت اور آزمائشوں سے سابقہ پڑنا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر مثلاً وہ آئی سی۔ ایس۔ کے امتحان میں شریک ہو جائے تو اس کا کامیاب ہونا تقریباً یقینی ہے۔ اس نے سو روپے ماہوار پر برسوں، عبداللہ بریلوی صاحب کے ساتھ "بمبئی کرانکل" میں کام کیا۔ ایک چال نما کمرے میں کئی سال گذارے۔ لیکن دوسرے (بالعموم حکومتی) اخباروں کی پیش کش کو جہاں تنخواہ کئی گنا زیادہ تھی، قبول نہیں کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ چڑھائی کا راستہ اختیار کرنے کے بعد وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اردو اور انگریزی دونوں میں مضمون لکھے۔ کتابیں، ناول، افسانے، تنقیدیں، سیاسی تبصرے۔ غرض بہت سے میدانوں میں اس کا قلم اپنا کمال دکھاتا رہا۔ لیکن کسی میدان میں اس نے جھوٹ یا گھٹیا پن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا! کبھی اپنی قدروں کو کسی قیمت پر بھی بیچنے کو تیار نہیں ہوا۔ عمر بھر میں لاکھوں روپے کمائے ہوں گے لیکن ان کو "مقصدی" فلم بنانے میں لگا دیا جو کبھی بھی سستے بازار میں مقبول

نہیں ہوتے۔ لیکن جب کسی کو ایک مقصد کی دھن لگ جاتی ہے (اور اس کو تو کئی مقصدوں کی دھن ہے، ادب کی خدمت، جرنلزم کی خدمت، فلم سازی کے فن کی اصلاح اور خدمت، سیاست کی خدمت) اور اس میں ایمانداری اور جرأت دونوں پائی جاتی ہوں، تو پھر وہ چیزوں کی قیمت نہیں لگاتا، راستے کے نشیب و فراز نہیں دیکھتا، وہ مصلحت اندیشی تک کو گناہ سمجھتا ہے اس کو صرف یہ خواہش کھینچتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکے، کامیابی جس کو وہ دوسروں کے سکّوں میں نہیں ناپتا، بلکہ اپنی ترازو میں تولتا ہے۔ عباس میں دیانت اور جرارت دونوں موجود ہیں۔ زندگی کو اس شان سے بسر کرنے میں اس کی اپنی رفیقۂ حیات مجتبائی بیگم سے بڑی مدد ملی کیوں کہ اس میں ایثار، محبت اور سمجھ داری کی ایسی غیر معمولی صفات جمع ہو گئی تھیں کہ جوان کے سائے میں آتا مالا مال ہو کر اٹھتا۔ پھر اپنے شوہر کے لئے اس نے کیا کیا نہ کیا۔ لیکن قدرت نے اس ملاپ کو زیادہ عرصے قائم نہیں رکھا اور "مجی" مقابلتہً کم عمری خدا کو پیاری ہو گئی۔ اس کے بارے میں بھی میں نے ایک مختصر رسالہ لکھا تھا جو مجی کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

عزیز سیدین

عزیزمن تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی میں سے لطف اور معنی، محبت اور روشنی، سکون اور اعتماد جاتے رہے ہوں، جیسے دل کی دنیا خلا سے بھر گئی ہو۔ خیر میرے ساتھ ایسا ہوا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ تمھارے بہت سے عزیزوں اور دوستوں کے دل کی بھی یہی کیفیت ہے؟ تم تو کبھی مزاحاً کبھی سنجیدگی سے کہا کرتی تھیں کہ "تمھارے سوا میری کون پروا کرتا ہے۔ اور مجھ میں آخر ایسی بات ہی کیا ہے؟"

سچ پوچھو تو یہ ہے بھی اچنبھے کی بات کہ تم اس طرح اپنے سب عزیزوں اور جاننے والوں کی زندگی پر چھا گئیں جیسے رحمت کا بادل آسمان پر چھا جاتا ہے۔ آخر تم میں کون سی غیر معمولی صفات تھیں؟ تم نے کسی کالج میں اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ بس گھر پر استادوں اور استانیوں سے اردو، فارسی انگریزی، دینیات اور تھوڑی سی ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ پڑھا تھا کون نہیں پڑھتا؟ تم نے فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری وغیرہ میں کوئی مہارت نہیں حاصل کی تھی جس کی بدولت عورتیں شمع انجمن بننے کی کوشش کرتی ہیں اور دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ تم ابتدا سے ملنے جلنے میں بہت پیش پیش، یا

جدید آداب مجلس میں زیادہ ماہر نہ تھیں، بلکہ تمھاری طبیعت میں ایک خاص جھجک تھی نئے لوگوں سے ملنے میں۔ تمھاری کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہو سکے تو ان سے نہ ملو۔ اس زمانے میں تم میں دیر آمیزی تھی اور کم آمیزی بھی۔ بچپن اور جوانی میں تمھیں گھر سے نکلنے اور دوسرے لوگوں سے ملنے کے بہت ہی کم موقعے ملے تھے اور تمھارے مزاج پر اس ماحول کا قدرتاً بہت اثر تھا۔ پھر بعض لوگوں میں گفتگو کا ایسا آرٹ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ دوسروں پر چھا جاتے ہیں تمھارے گفتگو کے خلوص اور دل کشی کو جانتا ہوں (مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟) لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تم نے محض گفتگو کے سحر سے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا تھا، تمھیں گھر کی آرائش اور زیبائش سے بھی کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ پھر اس قسم کے آدمی کا اس درجہ ہر دلعزیز ہو جانا تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟

ان چیزوں کے علاوہ، شادی کے بعد تمھیں اپنی زندگی میں اور بھی بعض مشکلیں پیش آئیں (معاف کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تمھاری کمزوریوں کو گنا رہا ہوں۔ لیکن یہ بات نہیں، میں تو گویا اپنے دل سے باتیں کر رہا ہوں۔ اور اس معمے کو حل کرنا چاہتا ہوں) تم ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوئی تھیں اور تم نے ایک جاگیرداری نظام کی گود میں اپنا بچپن عیش و عشرت کے ساتھ بسر کیا تھا۔ اس نظام میں عظمت کا معیار اکثر دولت ہوتا ہے۔ اور حسب و نسب کے دعوے۔ لوگ سختی کے ساتھ مختلف طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اور ان کے باہمی تعلقات اور میل جول کے آداب خاص قاعدوں اور قوانین کے پابند ہیں۔ تمھارے خاندان میں سماجی معاملات میں سخت قدامت پرستی کا رواج تھا۔ باہر کے لوگوں سے ملنے کا تمھیں مطلق کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ ایسے

ماحول میں ذہنی فراخی یا تجربے میں وسعت یا طبیعت میں ایک لچک پیدا ہونا ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل ہے۔ خاندان کے لوگوں کی عمر کا بیشتر حصّہ مادی آسودگی اور عیش میں بسر ہوا تھا۔ اور ان میں اکثر کے دل میں دولت کی قدر اور محبت تھی۔ تمھارے قریبی بزرگوں کی سیرت میں بعض بڑی خوبیاں تھیں لیکن روشن خیالی یا سماجی آزادی یا نئے خیالات کا اثر ان میں شامل نہ تھا۔۔۔

اور تمھاری شادی ہوئی ایک متوسط خاندان میں، جہاں صرف یہی نہیں کہ دولت نہیں تھی بلکہ دولت جمع کرنے کا نہ سلیقہ تھا، نہ خواہش، نہ اس کی قدر۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ وہ لوگ اس کو ایک حد تک حقیر سمجھتے تھے تمھیں یاد ہوگا کہ ایک شخص نے تمھاری شادی کا ذکر سن کر کہا تھا "ارے وہاں شادی ہوئی ہے۔ وہ لوگ تو لڑکی کے پاندان کا خرچ بھی نہیں اٹھا سکتے!" (اور جب بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ تم پان بالکل ہی نہیں کھاتیں تو میں نے تمھیں یہ کہہ کر چھیڑا تھا کہ یہ خرچ تو میں ضرور اٹھا سکتا ہوں!) تمھاری سسرال کے پاس کچھ علم دوستی تھی، کچھ شرافت کی قدریں، کچھ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی وضعداری اور بس۔ وہ لوگ ایک بہت چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے تھے جہاں نہ بجلی تھی؛ نہ پانی کے نل، نہ قصبے سے باہر پُرفضا کوٹھیاں۔ نہ عیش اور آرام کے وہ سامان جو انیس سال تک تمھاری زندگی کا جزو رہے تھے۔ پھر اس بظاہر انمل، بے جوڑ شادی کے بارے میں اگر بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس کی کامیابی مشکوک ہے تو کیا غلط سمجھتے تھے؟ خود میرے دل میں ابتداء میں یہ اندیشہ تھا کہ تم اس قسم کے مادی ماحول میں کس طرح خوش رہ سکوگی؟ اپنے نئے عزیزوں کے

ساتھ جن کی اور تمھاری روزمرہ کی زندگی میں ایک بڑا فاصلہ تھا کس طرح نباہ کروگی؟ دولت کے پس منظر اور ایک سادہ زندگی کے پیش منظر کے بیچ میں مفاہمت کا پل کیسے بناؤگی؟........ پھر تم نے یہ کیا اعجاز دکھایا کہ چند ہی مہینے میں یہ دیواریں ٹوٹ گئیں۔ یہ اندیشے بے بنیاد ثابت ہونے لگے اور تم باوجود علم اور تجربے کی کمی کے، باوجود (بقول تمھارے ایک دوست کے) بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے کے، اس نئی زندگی کی اجنبی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح سج گئیں اور غیروں کے لئے اپنوں سے زیادہ اپنی بن گئیں؟

تمھاری پہلی بات جس نے مجھے متاثر کیا جانتی ہو کیا تھی؟ محبت کرنے کی اتھاہ صلاحیت! شاید اس کے اعجاز نے رفتہ رفتہ ان تمام گتھیوں کو سلجھادیا جو دنیا میں بیشتر لوگوں کی زندگی کو دوزخ بنادیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ خزانہ تمھارے سینے میں محفوظ تھا لیکن اس کو لٹانے کا موقع اس سے پیشتر تمھیں نہیں ملا تھا۔ تمھارے نئے گھر میں بہت سے لوگ تھے جن کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق تھا اور آپس میں محبت کا اظہار معیوب نہیں۔ اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ان کو تم پہلے ہی دن سے ایک محبوب رشتے کی وجہ سے عزیز تھیں۔ اس لئے تمھاری محبت کے جوہر کھولنے کے لئے یہ فضا سازگار ثابت ہوئی۔ شادی سے اگلے ہی دن تمھیں اپنے میکے جانا تھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ تم میری ایک بہن سے گلے مل کر بادیدۂ پرنم رخصت ہو رہی ہو۔ میں نے اپنی بری عادت سے مجبور ہو کر اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ تم اپنے گھر جا رہی ہو اور شام کو واپس آجاؤگی، پھر یہ گریہ و زاری کیوں؟ تم نے کچھ جواب نہ دیا اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی بے وقوف کو دیکھتا ہے۔ اور آنکھیں جھکالیں! چند روز

کے بعد مجھے ایک کمیٹی میں شریک ہونے دو روز کے لئے الٰہ آباد جانا تھا اور تم میرے جانے سے اس درجہ متاثر تھیں گویا میں کئی مہینوں کے لئے کسی خطرناک سفر پر جا رہا ہوں۔ یہ عادت تمھاری ساری عمر رہی۔ گو بعد میں اس کے اظہار میں زیادہ ضبط پیدا ہو گیا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے اس محبت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ عزیز اور دوست، نوجوان اور بچے اور بوڑھے، ملازم اور متوسلین سب حسبِ توفیق اس دولت میں شریک ہوتے گئے ....

تمھاری اس محبت میں لین دین کا معاملہ نہ تھا۔ اہل اور نااہل کی تمیز تک نہ تھی۔ تم نے ان سے بھی محبت کی جو تم سے محبت کرتے تھے اور ان سے بھی جو اپنی افتادِ طبیعت کی بنا پر تم سے اپنا سلوک بدلتے رہتے تھے یا نا روا اعتراض کرتے تھے۔ مجھے یہ بات ناگوار ہوتی اور میں تم سے بحث کرتا اور (اپنی کم مایہ عقل کے بھروسے پر) یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اچھے بُرے میں تمیز کرنا چاہئے نکوئی با بداں کردن، کوئی عقل مندی کی بات نہیں، ایسے لوگ تمھاری محبت و شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے (اور تم مانو یا نہ مانو اٹھاتے بھی تھے) تم نے کبھی کبھی اس بات کو شاید میری تالیفِ قلب کی خاطر مانا بھی، لیکن پرنالہ وہیں گرتا رہا! تمھارا یہ کہنا میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میرا فعل میرے ساتھ ہے، ان کا فعل ان کے ساتھ، میں اپنے فعل کی مالک ہوں وہ اپنے فعل کے مالک ہیں، اوّل اوّل جب تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتیں تو میں سمجھتا یہ تمھاری کمزوری ہے۔ تم کسی کو اس کے سامنے بُرا کہنے کی جرأت نہیں کرتی ہو اور ہر کسی کے ساتھ اس طرح نباہ کرنا چاہتی ہو کہ کوئی بدمزگی نہ پیدا ہو۔ شاید اس میں ایک حد تک صداقت بھی تھی لیکن تمھاری زندگی کا مرکزی جذبہ اور تمھارے اعمال کا محرک یہ عقیدہ تھا کہ

انسان کے دل کو رکھنا سب سے بڑا پُن ہے ۔ اور اس کو دُکھانا سب سے بڑا پاپ ہے ۔

ایک بات جو میں نے بارہا تم سے کہی ہے دوہرانا چاہتا ہوں ۔ دنیا میں بالعموم دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں ۔ اکثریت تو ان کی ہے جو "لینے" کے قائل ہیں ۔ اپنی ذات کے لئے ہر قسم کی اچھی چیزیں بٹورنا چاہتے ہیں ۔ روپیہ عیش و آرام، قوت و رسوخ، جاہ و منصب، گویا دنیا سٹّے کا بازار ہے جہاں ایک لوٹ مار مچی ہوئی ہے اور ہر عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ جتنا کچھ مل سکے چھین جھپٹ کر حاصل کرے ۔ اپنے نفس کو موٹا کرے اور دوسروں پر اقتدار جمائے ایک تھوڑی تعداد ایسے آدمیوں کی ہے جو لینا نہیں "دینا" چاہتے ہیں، روپیہ، پیسہ، خدمت، ایثار، دوستی، محبت، دل نوازی، خاطرداری، غرض جو کچھ بھی ان کے پاس ہے، مادّی دولت ہو یا دل کی دولت اس میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتے ہیں ۔ تم ہمیشہ اپنی تعریف سے گھبراتی اور شرماتی رہی ہو ۔ لیکن مجھے اس وقت اتنا کہہ لینے دو کہ میں نے اپنی عمر میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کو دینے سے اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہو جن کو دینے کا اس قدر شوق بلکہ خبط ہو جتنا تمھیں! ہر چیز کا دینا، جیسے اس کو اپنے پاس رکھنا تمھارے لئے ایک بوجھ ہو، جیسے ہر نعمت جو ملی ہے ایک امانت ہے کہ اسے مستحقوں (بلکہ نامستحقوں تک!) پہنچانا تمھارا پہلا فرض ہے، جیسے روپیہ پیسہ جس کو عام لوگ اور خود تمھارے گھر والے ایک قدر مستقل سمجھتے تھے، نہ صرف ہاتھ کا میل ہے بلکہ ایک زہر ہے کہ ہاتھ میں دیر تک ٹھیرا تو کھال کی حدوں کو توڑ کر خون میں مل جائے گا اور زندگی کی شرافتوں کو زہر آب کر دے گا ۔ قدرت کی فیاضی نے اس گھر کو، جس میں تم اپنی روشن قسمت

لے کر آئی تھیں، توقع سے زیادہ روپیہ دیا۔ لیکن تمھاری طبیعت کی فیاضی نے ہمیشہ قدرت کی فیاضی کو شکست دی۔ تم نے کبھی اس کو جمع نہیں کیا، جمع نہیں ہونے دیا، جمع کرنے کی آرزو نہیں کی۔ جب روپے کی تنگی تھی اس وقت بھی اسے دوسروں کی ضرورت اور امداد کے لیے بے دھڑک صرف کیا، اپنی ضرورتوں کو ملتوی کیا، یا پس پشت ڈالا اور دوسروں کی دست گیری کی۔ اور جب کافی روپیہ ہاتھ میں آیا اس وقت بھی دینے کی ادا میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس کی خواہش اور ہوکا بڑھتا گیا۔

میں جب کبھی تمھارے لئے کوئی تحفہ لاتا (اور مجھے کونسی آئے دن توفیق ہوتی تھی) تو اکثر چند ہی روز کے اندر اندر وہ کسی عزیز یا دوست کے پاس پہنچ جاتا، میں اس کے خلاف احتجاج کرتا، ناراضگی کا اظہار کرتا، کبھی سنجیدگی سے کبھی بناوٹ سے۔ لیکن تم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ "آپ نے یہ تحفہ مجھے دیا تھا نا؟ اس لئے وہ میری ملکیت ہو گیا۔ اب میں جسے چاہے اسے دوں اگر مجھے دینے ہی سے خوشی ہوتی ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔" بھلا تم ہی بتاؤ کہ اس کا میں کیا جواب دیتا...... جب کہیں تمھیں سفر پہ جانا ہوتا (خاص کر ہندوستان سے باہر) تو ہر کسی سے کرید کرید کر پوچھتیں، عزیزوں، دوستوں، ملازموں سے، کہ تمھارے لئے کیا لاؤں؟ جو لوگ دوسرے شہروں میں ہوتے ان سے خط لکھ کر دریافت کرتیں، اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو کسقدر خلاق تھا تمھارا داغ اور فیاض تمھارا دل لوگوں کے لئے تحفے سوچنے میں۔ پھر میری تنگ دل دنیا دار عقل تمھیں مخاطب کرتی اور کہتی کہ "یہ جو تم اتنے لوگوں کو تحفے لانے کی بشارت دے رہی ہو، یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟ تمھیں معلوم نہیں کہ دوسرے ملکوں سے چیزیں لانے پر پابندیاں ہیں۔ بعض چیزوں پر

محصول بہت دینا پڑتا ہے۔ اور خیر یہ تو تم سے کہنا بے کار ہے کہ روپے پر ریاضی کے قوانین چلتے ہیں اور روپیہ درختوں پر نہیں اگتا۔" تم مسکرا کر جواب دیتیں کہ میں تو یوں ہی پوچھتی ہوں، کچھ ضروری تو نہیں کہ سب کے لئے چیزیں لاسکوں اور میں یہ ظاہر کرتا کہ میں نے تمھاری بات مان لی ہے۔ لیکن ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ تو ایک لفظی کھیل ہے۔ جہاں تک امکان کی حد میں ہے یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ تم کسی کی فرمائش اور اس سے بھی زیادہ اپنے دل کی خواہش کو پورا نہ کرو...... اور پھر جب تم واپس آتیں اور اپنے عزیزوں، دوستوں ملازموں سے ملتیں تو تمھاری خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ تمھارے حسین چہرے پر بشاشت کے رنگ کھیلتے اور تم سب چیزوں کو تقسیم کرتیں۔ یہاں تک کہ خاص اپنے لئے جو چیزیں لی تھیں وہ بھی ختم ہو جاتیں۔ اور یہی گویا تمھاری منزلِ مقصود تھی.... اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی نے تمھارے لباس یا جوتے یا کسی اور چیز کی تعریف کی اور وہ اگلے دن اس کی نذر ہوگئی۔ پیرس کا واقعہ یاد ہے۔ جب ہم ایک یونسکو کمیٹی کے جلسے میں شریک ہونے وہاں گئے تھے؟۔ یونسکو کے ایک بڑے عہدہ دار نے ہماری دعوت کی۔ ان کی انگریز سکریٹری بھی اس دعوت میں شریک تھی۔ اس نے تمھارے خوبصورت کامدار ہندوستانی جوتوں کو دیکھ کر ان کی بہت تعریف کی۔ اگلے دن تم نے ان جوتوں کا پیکٹ بنا کر اس کے پاس بھیج دیا۔ وہ بے چاری اس قسم کی وضعداری سے ناآشنا تھی، بہت انکار کیا۔ لیکن تم نے کہا کہ یہ تو ہمارے ہاں کا دستور ہے، تمھیں قبول کرنے ہوں گے۔ اس غریب کو غالب کا یہ مصرعہ کہاں معلوم تھا کہ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

یونسکو کے حلقوں میں یہ کہانی پھیلی اور لوگوں نے اس کا بہت چرچا کیا۔ تو تم نے بہت سادگی سے مجھ سے پوچھا کہ اس میں قابل ذکر بات کیا ہے۔ تمھارے نزدیک تو تمھاری کوئی بات بھی، خواہ وہ دوسروں کے لئے کتنی ہی غیر معمولی ہو قابل ذکر نہ ہوتی تھی۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ شاید قدرت تمھاری فطرت میں خود پسندی، خود غرضی، ذاتی مفاد کا احساس رکھنا ہی بھول گئی تھی۔ بے نفسی اچھی چیز ہے لیکن اس کی بھی تو حد ہوتی ہے۔!....

اس طرح تحفے دینے کے علاوہ، تمھیں خیرات کرنے کا، مستحقوں کی امداد کرنے کا کس قدر سلیقہ تھا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی ضرورت مند نے تمھارا دروازہ کھٹکھٹایا ہو اور وہ فوراً ہی نہ کھلا ہو۔ لکڑی کا دروازہ ہی نہیں بلکہ دل کا دروازہ بھی۔ شادی سے پہلے میں بھی حسب توفیق وقتاً فوقتاً ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا۔ لیکن جب سے تم نے گھر کا حساب اور کاروبار..... ہاتھ میں لیا، جو تمھارے لئے بالکل ایک نیا تجربہ تھا، تم نے اس ہنگامی خیرات کو بالکل منظم کر دیا۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو جب گھر کے خرچ کا روپیہ تمھارے ہاتھ میں آتا تو پہلا کام یہ ہوتا کہ جن لوگوں کی امداد تم نے اپنے ذمہ لی ہے انھیں دستی یا منی آرڈر کے ذریعے مقررہ رقمیں بھیج دو، ایک دفتر کی سی باضابطگی اور پابندگی کے ساتھ۔ اگر کبھی غیر معمولی خرچوں یا روپے کی کمی کی وجہ سے کفایت کرنی ہوتی تو اس مد میں تم کبھی کفایت نہ کرتی تھیں۔ "آخر وہ لوگ کیا کریں گے۔ ہمارے لئے ذاتی خرچ کم کرنا بہت زیادہ آسان ہے۔" اس وجہ سے ضرورت مند تمھاری طرف اس طرح کھنچتے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف۔ یعنی دستک دو اور دروازہ کھل جائے گا۔ پکارو اور جواب آئے گا، بار بار آئیگا اور کیا مجال ہے کہ قریب ترین عزیزوں سے بھی تم اپنی خیرات کا ذکر کرتی ہو۔

مگر تمھارے دین کی کہانی محض روپے پیسے کے دین کی کہانی نہیں۔ وہ تو اس کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے اور شاید بہت اہم حصّہ بھی نہیں۔ کیونکہ جس چیز سے آدمی محبت نہ کرے، اس کی قدر نہ کرے، اس کا دینا زیادہ مشکل نہیں۔ سوچتا ہوں کہ کون سی چیز ہے جس کے دینے میں تم نے کبھی بخل کیا ہو۔ جس کے دینے میں تمھیں گہری اور پر خلوص خوشی نہ ہوتی ہو! محبت، خدمت، وقت، خوشی میں شرکت، غم میں رفاقت، بیماری میں تیمار داری، پریشانی میں دل جوئی... اور اس جذباتی اور روحانی دولت کو بکھیرنے کی لگن بڑھتی ہی گئی، سال گذرتے رہے اور لگن گہری ہوتی گئی۔ جو جذبہ شروع میں اپنوں تک محدود تھا (اور اس وقت بھی "تمھارا"، "اپنے" کا مفہوم کافی وسیع تھا) وہ پھیلتا گیا۔ اور اس میں خلق خدا کے لئے روز افزوں گنجائش نکلتی رہی۔ تمھارے سب ہم عمر اور ہم مرتبہ عزیزوں نے تمھاری نوجوانی میں تمھیں "بھابی جان" کے نام سے پکارا اور تم نے ان کے ساتھ وہی مہر و محبت، خدمت اور رفاقت کا سلوک کیا جو اس شیریں نام کا تقاضہ ہے۔ اور جب تمھاری عمر بڑھی تمھاری بچیاں پیدا ہوئیں تو تم اپنے سب چھوٹوں اور اپنی بچیوں کے بے شمار دوستوں کے لئے، "امی جان" بن گئیں۔ تم دراصل ان سب سے ماں کی شفقت اور یگانگت کا سلوک کرتیں اور یہ رسمی خطاب ایک حقیقت بن جاتا۔ اور محبت کا جذبہ جو قدرت نے تمھاری فطرت میں بڑی فیاضی کے ساتھ رکھا تھا، دھیرے دھیرے نہیں بلکہ تیزی کے ساتھ اپنی پختگی اور کمال کو پہنچ گیا۔ ہر بچہ، عزیز ہو یا غیر، امیر ہو یا غریب، خوب صورت یا بدصورت۔ خوش مزاج ہو یا بدمزاج، تمھارے دل کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ اور تم چاہتی تھیں کہ فوراً دروازہ کھول کر اس کو اندر بٹھا لو سیر کو جاتیں اور سڑک پر کوئی چھوٹا بچہ ماں کی گود میں

یا گاڑی میں لیٹا نظر پڑتا تو تمھارا دل ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ "ذرا دیکھئے تو کیسا پیارا بچہ ہے۔" "پیارا؟" میں چڑانے کو اور کبھی سنجیدگی سے کہتا "مجھے تو اس میں کوئی بات پیاری نہیں معلوم ہوتی؟" اور تم خفگی کے ساتھ جواب دیتیں۔ "یہ آپ کی نگاہ کا قصور ہے۔" اور مجھے رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ واقعاً تمھاری نگاہِ مہر پرور میں کوئی بچہ بدصورت نہ تھا۔ شاید تمھیں اس میں نور الٰہی کی ایک جھلک دکھائی دیتی تھی یا دل بغیر دلیل کے اس کی طرف کھنچتا تھا یا اس کی بے بسی تمھیں اپیل کرتی تھی..... تمھیں خدا نے پیاری پیاری بچیاں دی تھیں لیکن ان کی محبت اور خدمت کر کے تمھارا دل نہیں بھرا۔ تمھیں ہمیشہ یہ آرزو رہتی کہ کسی بہت چھوٹے سے بچے کو پال لو اور اس کی دیکھ بھال اور پرورش کی ذمہ داری، جس سے آج کل کی اکثر مائیں بھاگتی ہیں، اپنے اوپر لے لو۔ کتنی بار میں نے سمجھایا کہ یہ بہت کٹھن ذمہ داری ہے، کیوں اسے خواہ مخواہ اٹھاتی ہو۔ لیکن اس بحث میں نظری اور عقلی جیت میری ہوتی اور عملی جیت تمھاری۔ کتنے ہی عزیزوں اور غیروں کے بچوں کو لے کر تم نے پالا، کبھی مہینوں، کبھی سالوں اور اس محبت اور توجہ اور انہماک کے ساتھ جس طرح بیشتر مائیں اپنے اکلوتے بچوں کو بھی نہیں پالتیں اور پھر جب ماؤں نے ان کو واپس مانگا تو بھرے دل اور مسکراتے چہرے کے ساتھ انھیں ان کے سپرد کر دیا۔ مطلب تو خدمت تھا، محبت کی پیاس بجھانا تھا، حق جمانا نہ تھا۔ اس محبت کا اعجاز تھا کہ برسوں بعد تک، جب وہ بچے کافی بڑے ہو گئے۔ انھوں نے ہمیشہ تمھیں امّی ہی کہا اور امّی ہی سمجھا اور اپنی ماؤں سے زیادہ تمھاری قدر اور محبت کی۔ اس منصوبۂ محبت میں تم نے اپنی جان لگا دی۔ اپنی فرصت اور آرام کا خیال نہیں کیا، صبح کو صبح نہیں سمجھا، شام کو شام نہیں سمجھا اور باوجود اس کے شاید تمھارے دل میں یہ خیال بھی نہیں

گزرا کہ ؎

شادم از زندگئ خویش کہ کارے کردم!

تم نے اپنی ساری زندگی کو سماج سیوا کی ایک حسین، بولتی ہوئی تصویر، ایک شیریں نغمہ بنا کر دکھا دیا۔ کوئی اَن دیکھی مجرد سماج نہیں بلکہ جانے بوجھے، جیتے جاگتے، ہنستے روتے انسانوں کی سماج۔ میں نے تم سے وقت کی بھیک مانگی تھی تم نے اپنی فرصت کے لمحے نہیں بلکہ ساری زندگی کو اس کام کے لئے تج دیا، اپنے ہاتھ پاؤں، دل و دماغ کی بہترین قوتوں کو اس کی نذر کر دیا، اس شان کے ساتھ کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور محبت اور خدمت کی اس بھٹی میں تپ کر تمہاری فطرت کا سونا کندن بن گیا اور اس میں جو کچھ خس و خاشاک تھے (اور کس قدر کم تھے یہ!) وہ جل کر خاک ہو گئے ......

اور کس کس انداز میں تم نے اپنی سیوا کے جوہر دکھائے، ابتدا میں کسی کو اندازہ نہ تھا، تمھیں بھی نہ ہوگا، کہ تم میں تیمارداری کی کیسی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ مجھ پر تو سب سے پہلے یہ بھید اس وقت کھلا جب تمھاری شادی کے چند ہی سال بعد میری ایک بہن اس قدر سخت بیمار ہوئی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے اور مہینوں تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ ڈاکٹر اور نرسیں امید و بیم کے چکر میں گرفتار موت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے لیکن ان پیشہ ور اور ہمدرد معالجوں نے بھی اَن تھک خدمت اور استقلال کا وہ مظاہرہ نہیں کیا، دن رات کو اس طرح ایک کر کے نہیں دکھایا جس طرح تم نے مشکل سے مشکل حقیر سے حقیر کام کو ---- آمادگی اور خندہ پیشانی سے انجام دیا۔ اندر سے دل دھڑکتا

رہا، آنکھیں روتی رہیں۔ لیکن تمھاری ہمت نے ہتھیار نہیں ڈالے، تمھارے نازک دل نے ہار نہیں مانی۔ اپنی ایمان کی قوت سے عزیزوں اور تیمارداروں کی ہمت بڑھائی۔ اور بالآخر گویا ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ محبت کب ناممکن کا اقتدار تسلیم کرتی ہے، جب تک کہ مشیت الٰہی کے سامنے اسے ہار نہ ماننی پڑے؟ اس آزمائش کی آگ میں تم اس کرامت کے ساتھ گذریں کہ تمھارا سکّہ اپنے نئے خاندان کے تمام افراد پر بیٹھ گیا۔

اور میں کیسے بھول سکتا ہوں سنہ ۱۹۵۵ء کا وہ زمانہ جب مجھ پر دل کی بیماری کا شدید حملہ ہوا، جب میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ دل کی بیماری کیا ہوتی ہے۔ اس نازک وقت میں تم نے بڑے اعتماد کے ساتھ تیمارداری کا پورا بوجھ اٹھایا اور اس محبت، خلوص، استقلال اور بے نفسی کے ساتھ میری خدمت کی کہ دوستوں اور عزیزوں ہی نہیں ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ مہینوں تک دن رات جاگنا، دوا، غذا کی دیکھ بھال، ڈاکٹروں سے مشورہ نرسوں کی خاطرداری اور ان کے ساتھ ایسا حسن سلوک جو انھوں نے شاید ہی دیکھا ہو۔ نماز، روزے، دعا اور عبادت کا وہ اہتمام جو لوگ پورے اطمینان اور فراغت کی حالت میں بھی نہیں کر پاتے۔ میرے سامنے تمھارے ہونٹ مسکراتے، میرے پیچھے تمھاری آنکھیں روتیں۔ لیکن تم نے نہ ایمان کا دامن چھوڑا، نہ کوشش کا۔ یہاں تک کہ مریض کو موت کے منھ سے واپس لے آئیں اور اس کے بعد بارہ سال تک اس کی دیکھ بھال، دوا علاج کو اپنا دھرم بنا لیا اور آج وہ زندہ ہے تو ڈاکٹروں کے علاج سے کہیں زیادہ تمھاری محبت کے جادو، تیمارداری کی شفقت کی وجہ سے! لیکن اب تو تم سے ہر وقت یہ گلہ ہے کہ تم نے کیوں ایسا کیا؟ اب کیا مصلحت ہے

اس بے معنی سی زندگی کے رہنے میں ؟)

خیر یہ سب تو تھا. لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ہر قسم کے سماجی بھید بھاؤ پر کس طرح قابو پالیا تھا ؟ انسانی مساوات کا اصول کیسے تمھاری زندگی اور ذہن کے ہر گوشے میں رس بس گیا تھا؟ تمھارے نزدیک نہ صرف امیر و غریب، چھوٹے بڑے، دوست ملازم سب برابر تھے بلکہ طبیعت کا عام تقاضا یہ تھا کہ میل جول میں غریبوں کو امیروں پر، چھوٹے آدمیوں کو بڑے آدمیوں، پر ترجیح دو۔ میرے پاس منصبی حیثیت سے تمھارے لئے صدر جمہوریہ، وزیروں، والیانِ ریاست اور بڑے بڑے افسروں اور مشاہیر کے دعوت نامے آتے اور تم اکثر انھیں ٹال جاتیں، معذرت کر دیتیں۔" آخر میں وہاں جاکر کیا کروں گی وہاں اتنے لوگ ہوں گے۔ ان میں ایک شخص کے نہ جانے سے کیا کمی محسوس ہوگی؟" (اکثر اس بارے میں مجھ میں اور تم میں بحث ہوتی اور کبھی کبھار مجھے اس میں جیت بھی ہو جاتی تھی!) مگر یہ نہ ہو سکتا تھا کہ تمھارے پاس کسی غریب یا کم حیثیت شخص کے ہاں سے دعوت آئے اور اسے تم قبول نہ کرو۔ ممکن ہوتا تو تم دوسرے شہر میں جاکر ان کے ہاں تقریبوں میں شریک ہوتیں اور ان کے عزیزوں کے ساتھ محبت اور برابری کا سلوک کرتیں۔ مگر ایسے نہیں جیسے بعض لوگ نمازی سی نیت کر کے اپنے سے چھوٹے لوگوں سے مربیانہ انداز میں جھک کر ملتے ہیں تاکہ ان کا دل میلا نہ ہو۔ تمھارے دل میں تو کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں کہ تم میں اور ان میں سماجی اعتبار سے کوئی فرق ہے جس پر سے پل بنانا ضروری ہے۔ جہاں دوسروں کی خود پسندی اور مصلحت اور انانیت تماشائے لبِ بام میں مصروف ہوتی، اور جھجک دکھاتی، وہاں تمھاری محبت اور انسان دوستی بے خطر داخل ہو جاتی ...... تمھارے ذہن میں کبھی یہ

خیال بھی نہیں آیا کہ لوگوں سے ملنا جلنا کسی مقصد یا غرض سے ہو سکتا ہے یا اپنے مفاد کا تحفظ کا ایک ذریعہ ہے۔ برخلاف اس کے تمھیں اگر ذرا بھی یہ احساس ہو جاتا کہ کوئی شخص توقع کرتا ہے کہ تم (یا تمھارا شوہر) اس سے کسی ذاتی غرض کی وجہ سے ملو تو تمھاری نرم اور منکسر طبیعت میں ایک ضد سی پیدا ہو جاتی کہ تم ہرگز ایسا نہ کروگی کیوں کہ یہ تمھاری خودداری کے منافی ہے۔ خاکساروں سے خاکساری بدرجہ کمال تھی۔ لیکن سربلندوں سے انکسار نہ تھا۔ ہاں اگر کسی شخص سے دل مل جائے، اس کے خلوص کا یقین ہو جائے تو جاہ و منصب بھی تمھاری محبت کے راستے میں حائل نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ تم کسی سے ملو اور اس کے ساتھ اخلاق اور شرافت کا برتاؤ نہ کرو، خواہ تم اسے پسند نہ بھی کرتی ہو۔ اس بارے میں کبھی کبھی مجھ میں اور تم میں بحث بھی ہوتی۔ میں کہتا کہ یہ کمزوری ہے، اگر تمھیں کسی شخص سے کوئی شکایت ہے، یا اس کی دل آزار باتوں اور حرکتوں کا علم ہے تو تم کیوں نہیں اس چیز کو اس پر ظاہر کر دیتیں۔ تم اس سے اتفاق نہ کرتیں اور کہتیں کہ "بھئی، مجھ سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ میں کیا کروں؟" میں شروع شروع میں اس کو جرأت کی کمی، یا ریاکاری سمجھتا لیکن اب کہ عمر کی کشتی دوسرے ساحل کے قریب پہنچ گئی ہے اور دنیا کا کچھ تجربہ حاصل ہوا ہے، عقل نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے جو محبت نے تمھیں ابتدا ہی میں سکھا دیا تھا کہ سلوک اور دل نوازی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی صفت نہیں، ظاہری اصول پرستی اور صاف گوئی بھی نہیں!

عجیب بات ہے کہ تم زندگی کے بعض چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم معاملات میں تو خوف کی ذہنیت کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن جب کوئی اہم اور نازک

موقع پیش آتا جو تمھاری پوری سیرت کو چیلنج دیتا، یا تمھاری محبت کو امتحان میں ڈالتا، اس وقت جسمانی اور ذہنی خوف بالکل غائب ہو جاتا اور تم عمر بھر کی ساری بندشوں اور گتھیوں کو محبت کے عصائے موسوی سے توڑ کر ہر کسی کو حیرت میں ڈال دیتیں۔ یاد ہے، میں سری نگر میں تھا اور تم دہلی میں۔ اور تمھیں معلوم ہوا کہ میں بیمار ہوں۔ اگلے دن بغیر کسی کو ساتھ لئے، بغیر اطلاع دیئے دوپہر تک تم میرے پاس پہنچ گئیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ کون سی قابل ذکر بات ہے لاکھوں آدمی اس طرح سفر کرتے رہتے ہیں لیکن تمھارے لئے یہ کئی پشتوں کی جذباتی رکاوٹوں سے جنگ کرنے اور عمر بھر کی عادت کو توڑنے کا معاملہ تھا جب محبت کا مطالبہ دروازے سے داخل ہوا تو گویا خوف کا جذبہ کھڑکی سے نکل کر بھاگ گیا اس بات کا سب سے زبردست مظاہرہ اس وقت ہوا جب چند سال گذرے تم اکیلی حج کو گئیں۔ حج اور آستانۂ رسول پر حاضری دینے کی شدید آرزو تمھیں برسوں سے تھی میرے ساتھ ایک دفعہ عمرہ کر چکی تھیں۔ لیکن یہ تمھارے لئے کافی نہ تھا۔ میں اس وقت جا نہ سکتا تھا اور میں نے تمھیں سمجھایا کہ جون کا سفر بہت کٹھن ہوگا، گرمی بے امان ہوگی۔ اس سال نہ جاؤ، پھر کسی سال اکٹھے چلیں گے۔ لیکن تم نے نہ مانا (اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں نہ مانا) اور اس دور دراز صبر آزما سفر پر اکیلی روانہ ہو گئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سال مکہ معظمہ کا ٹمپریچر ۱۳۰ ڈگری تک پہنچا اور بہت سے حاجی گرمی کی شدت سے ارکان حج ادا کرتے کرتے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ چلتے چلتے گر پڑتے تھے اور ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن تم تو بچپن میں ناز و نعم میں پلی تھیں اور بعد میں زمانے کے شدید گرم و سرد سے محفوظ رہی تھیں، ان تمام آزمائشوں کو شہد کے گھونٹ کی طرح پیا۔ اور ایمان اور محبتِ رسول کے سہارے ان سخت مقامات سے خیریت کے ساتھ گذر گئیں۔ واپس آئیں تو رنگ

سنولا گیا تھا۔ جسم کمزور اور دبلا ہو گیا تھا۔ لیکن چہرے پر خوشی اور اطمینان کی ایک انوکھی چمک تھی۔ جب میں نے پوچھا کہ اس سفر میں تمھارا تنہائی کا خوف کہاں گیا۔ تو تم نے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ جواب میرا دل بھی جانتا تھا اور تمھارا دل بھی۔ یعنی تم اس سفر میں تنہا کب تھیں؟

۱۹۴۷ء کی قیامت میں تم نے پردہ چھوڑا۔ لیکن اس شان کے ساتھ کہ ہندوستانی وضعداری اور اسلامی شرم اور حیا کا تصور تمھارے لباس، تمھارے میل جول، تمھاری بات چیت ہر چیز میں جاری و ساری رہا۔ بہت سی خواتین نے تمھاری طرح پردہ ترک کیا لیکن وہ ایک دم دوسری حد پر پہنچ گئیں اور انھوں نے جدید مغربی طرزِ زندگی اور بے پردگی کے فیشنوں کو سو فیصدی قبول کر لیا۔ گویا چولا بدلنے سے ان کی فطرت بھی بدل گئی ہے! لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تمھاری زندگی میں مذہب اور شعارِ مذہب کی جو جگہ تھی اسے کوئی چیز تہ و بالا نہ کر سکی، نہ اس کی معنویت کو نہ اس کی عبادات اور ظاہری آداب کو۔ تم نے کبھی نماز قضا نہیں کی، روزے قضا نہیں کیے، محرم کی مجلسوں اور اس کے آداب کی پابندی کو نہیں چھوڑا، قرآن کی تلاوت کو ناغہ نہیں کیا۔ اور اس راستے میں جو نفس کشی کرنی ہوتی ہے، دشواریاں پیش آتی ہیں، انہیں نہ صرف سعادت بلکہ مسرت سمجھ کر جھیلا۔ سفر میں جہاں دوسرے لوگ نماز قصر کرتے، تم پوری نماز پڑھتیں، جہاں دوسرے لوگ روزے قضا کرتے، تم ان کو پابندی کے ساتھ رکھتیں۔ یاد ہے ایک دفعہ تم میرے ساتھ رمضان کے مہینے میں اوڑی سے پونچھ تک گئی تھیں۔ چند میل گھوڑے پر، اور اس کے بعد آٹھ دس میل پیدل، گرمی کا زمانہ تھا قدم قدم پر پیاس لگتی تھی۔ لیکن تم نے (باوجود میرے اصرار کے) روزہ

نہیں توڑا۔ جب تم یہ ارادہ کرلیتیں کہ رمضان کے تیس دنوں میں ہر روز آٹھ پارے پڑھوگی تو کوئی مصروفیت، ہو یا بیماری تمھارے اس پروگرام میں تبدیلی نہ کرسکتی تھی۔ محرم کی مجلسیں تم کس شوق، عقیدت اور پابندی کے ساتھ کرتیں، انیس کے مرثیے کس خوش آوازی اور خلوص سے پڑھتیں، شام غریباں کی مجلس میں، جب ساری روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں، تم پورا مرثیہ اپنی یاد سے پڑھتیں، اور صرف میں ہی نہیں بلکہ سبھی تمھارے حافظہ پر رشک کرتے۔ تمھارا کوئی عزیز یا دوست بیمار ہوتا تو تم تیمار داری اور دوا علاج کے ساتھ ساتھ اس کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں دعائیں پڑھتیں، دعائیں مانگتیں، اپنی تکان اور ضرورتوں سے بے خبر اور اس کے لئے بے چین اور خدا کے حضور میں دست بہ دعا، یا سر بسجود! اگر تمھارے کوئی عزیز یا جاننے والے ان باتوں کو خلاف فیشن یا قدامت پرستی سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ اعتراض کرتے ہیں تو کیا کریں۔ اس مقام سے کوئی چیز تم کو نہ ہلا سکتی تھی۔ یہی حال تمھاری خیرات کا تھا۔ کسی کی ضرورت کا حال معلوم ہوا اور تمھارا دل بے قرار ہوا۔ اس بارے میں اپنے فوری وسائل یا استطاعت پر غور کرنا تمھارے لئے بالکل غیر ضروری تھا۔ جو کام کرنا ہے وہ تو کرنا ہے، اس میں استخارہ کیا؟ انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خدمت صرف تمھاری انسانیت ہی کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ اس میں تمھاری گہری، سچی، پرخلوص مذہبیت کا جلوہ بھی تھا۔

کون کون سی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کروں؛ تمھارا جیسا کھانا بہت کم باورچی پکا سکتے تھے۔ میں کہتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر پکے پکائے کھانے میں تم اپنی انگلیاں ڈال دیتی ہو تو وہ مزے دار بن جاتا ہے۔ تمھاری جیسی چائے کوئی نہ بناتا تھا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میرے لئے خراب چائے پینا ناممکن

ہو گیا۔ تمھاری سلائی، بنائی، کشیدہ کاری، ہر چیز میں تمھاری نفاست اور سلیقہ جھلکتا تھا۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی تم ہمیشہ دوسروں ہی کے لئے بناتیں اپنے لئے نہیں۔ کبھی تفریحاً شکایت بھی کرتیں کہ میرے پاس سوائے ایک پرانے پل اوور کے کچھ بھی نہیں۔ جب کہ تمھارے بہت سے دوستوں اور عزیزوں کے پاس تمھارے بنائے ہوئے کئی کئی پل اوور ہوتے! تمھیں اپنا جموں کا جمعدار سنت رام یاد ہے؟ جس کو ہر سال تم خود ایک پل اوور بنا کر دیا کرتی تھیں۔ اور جب ہم کشمیر سے واپس آ گئے تو کئی سال تک تم اس وضع داری پر قائم رہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس قدر خوشی اور آمادگی کے ساتھ تم نے مولانا آزاد کے لئے پل اوور بنایا تھا، اتنی ہی خوشی سے تم اس جمعدار کے لئے بنتی تھیں...... کس قدر وضع داری تھی تمھارے اخلاق اور آداب زندگی میں —— بزرگوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت، برابر والوں سے سلوک اور ہر کسی سے محبت، بے مانگی محبت۔ شاید نئی نسل ہی کو نہیں بلکہ خود تمھاری نسل کو یہ دور از کار افسانے معلوم ہوں۔ جن کی اس ایٹمی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن تمھاری دنیا ایٹمی دنیا نہیں تھی اور اگر تمھیں یقین بھی ہوتا کہ یہ ایٹمی دنیا ایک لمحے میں بھک سے اڑ جائے گی اس وقت بھی تم اپنی وضعداری پر قائم رہتیں۔

تجربے کی بھٹی میں تپ کر، محبت کے سانچے میں ڈھل کر تمھاری سیرت کی خوبیاں ابھرتی رہیں، خودی کی جگہ ایثار نے لی، میل جول کی جھجک دور ہوئی دل کے دروازے کھلتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک ایسی منزل آئی کہ ہر کسی کے لئے اس میں جگہ نکل آئی اور آنے والوں کی نشست کے لئے اونچی نیچی جگہ کی تخصیص نہ رہی، ذات پات کی تمیز نہ رہی۔ تمھاری مذہبی پختگی اور سماجی

رواداری نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا اور تمھارے دوستوں اور بنائی ہوئی بہنوں اور بھائیوں، بیٹیوں اور بچوں میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شامل ہو گئے۔ تمھاری محبت اور خلوص کی دولت میں برابر کے شریک۔ شاید تمھیں یہ سن کر تعجب نہ ہو کہ جب امریکہ میں چند ہفتوں کے قیام کے بعد بنانے والے نے تمھیں اپنے پاس بلا لیا تو یونیورسٹی کے کئی سو ہندوستانی طلبہ کی ایسوسی ایشن نے ایک تعزیتی ریزولیوشن پاس کیا اور اس میں لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ پردیس میں ہمیں ایک ماں مل گئی تھی جو جاتی رہی! اور تمھارے چند ماہ کے امریکی دوست تمھارے غم میں اسی خلوص کے ساتھ شریک تھے جس طرح تمھارے عمر بھر کے دوست اور عزیز۔ زندگی اور موت کے بارے میں سعدی کا جو مشورہ ہے اس پر تم نے کس شان سے عمل کر کے دکھایا۔ اور کون سی آنکھ ہے جس کو میں نے تمھاری یاد اور محبت میں اشکبار نہیں دیکھا۔؟

لمبی تکلیف دہ بیماری میں اکثر لوگ چڑچڑے، ضدی اور خود غرض ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذات ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ وہ اپنی تکلیف کی رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں، نرسوں، تیمارداروں کو بھی اس ذہنی کیفیت کو جھیلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم تو ساری عمر ہی ایک مثالی مریض رہی تھیں۔ اپنی بیماریوں اور تکلیفوں کو جھیلنے کے لئے تم میں غیر معمولی قوت برداشت اور صبر تھا۔ تم کہ دوسروں کی ذراسی بیماری یا تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتیں اور تمھارا منہ اتر جاتا۔ اپنے بڑے بڑے آپریشن نہایت اطمینان سے کرا لیتیں (اور اکثر اس زمانے میں جب میں کہیں باہر ہوتا تاکہ میں پریشان نہ ہوں) یہی حال، لیکن معمول سے بھی کہیں زیادہ، تمھارا اس آخری بیماری کے دوران میں رہا۔ کہاں سے ملی تھی تمھیں یہ غیر معمولی قوت برداشت جس نے اس طویل علالت

کے دوران میں، ایک دفعہ کے سوا کبھی اپنی تکلیف کی شکایت نہیں کی ڈاکٹروں نے آٹھ دس بار تمہاری ریڑھ کی ہڈی کا پنکچر کیا جس سے بعد دوسری عورتوں کو میں نے دن بھر روتے اور کراہتے دیکھا ہے) لیکن تمہارے چہرے پر شکن کبھی نہیں پڑی۔ تم نے دماغ کا آپریشن کرایا۔ لیکن اس کو بھی اس طرح برداشت کیا۔ کہ ڈاکٹروں کو حیرانی تھی۔ مگر ان سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سارے عرصے میں دوسروں کا لحاظ، ان کی خاطرداری ان کے آرام کا خیال ہر وقت تمہارے دل و دماغ پر غالب رہا۔ تمھیں ہر وقت یہ فکر رہتی کہ نرس آرام سے ہے یا نہیں۔ اس نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ اس کے پڑھنے کے لئے میں کتابیں لایا ہوں یا نہیں۔ تمہارے دوست عیادت کے لئے آتے تو ہمیشہ مجھ سے یہ تقاضا ہوتا کہ ان کے لئے چائے کا انتظام کرو۔ تمہارے کمرے میں جو دوسری مریضہ ہوتی اس کی خیریت ہر وقت دریافت کرتی رہتیں، جو آس پاس کے کمروں میں تھیں ان کی خیریت جاکر پوچھتیں یا کسی کو بھیج کر دریافت کراتیں۔ تم نے اس زمانے میں اس قدر اخلاق، انسانیت اور بے نفسی کا مظاہرہ کیا کہ تمہارے ڈاکٹر اور نرسیں اور آس پاس کے مریض پرانے دوستوں کی طرح تمہارے گرویدہ ہو گئے۔ اور کیا کیا کوشش نہیں کی تمہارے ڈاکٹروں نے کہ اس روشن شعلے کو بجھنے سے بچالیں!...... جب کبھی حافظہ اپنے محور سے ہٹ جاتا اور تمھیں خیال ہوتا کہ تم اپنے وطن میں ہو توکس محبت سے ایک ایک دوست اور عزیز کو آواز دے کر بلاتیں اور پوچھتیں (اور اس محبت بھری طلب میں تمہارے ملازم بھی اسی طرح شامل ہوتے جیسے تمہارے دوست) اور ہر ایک کا ذکر کیسی محبت اور تعریف کے ساتھ کرتیں۔

اور پھر وہ منحوس دن آیا جب تم پر ایک شدید غفلت طاری ہوگئی، جب تم میرے سامنے تھیں لیکن میرے پاس نہ تھیں، جب دنیا کو چھوڑنے سے پہلے ہی تم اپنے خالق کے حضور میں پہنچ گئی تھیں۔ جب تمہارے ڈاکٹروں اور نرسوں کی کوشش اور تمہارے دوستوں، عزیزوں اور ملاقاتیوں کی دعائیں بے سود ثابت ہوئیں۔ جب رات کی تنہائی اور سناٹے میں اسپتال کے گھنٹے کی ٹک ٹک میری اس دنیا کو جس کا نام خلا تھا، وقت کے دکھ بھرے لمحوں سے بھرتی رہی۔ جب تمہارے وارڈ کا سب سے بڑا ڈاکٹر رات بھر اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا تمہاری آخری دیکھ بھال کرتا رہا۔ اور پھر تمہارا شریف دل ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، تمہارے دماغ کی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی، تمہاری محبت کی روشنی، جس نے سینکڑوں زندگیوں کو روشن کیا تھا۔ تمہارے چاہنے والوں سے چھین لی گئی۔ لیکن تمہارے چہرے پر اس انتہائی کرب کے قدموں کی چھاپ نہ تھی جو تم نے مہینوں برداشت کیا تھا بلکہ وہی سکون، وہی معصومیت، وہی شفقت کھیل رہی تھی جو خدا نے اس پر نعمت کی تھی۔ اور تم اس جوارِ رحمت میں پہنچ گئیں جہاں خدائے رحیم نے یقیناً تمہارا خیر مقدم کیا ہوگا کہ اے میری بندی آ کہ تیری زندگی سپھل ہوئی ...... خدا ہی دیتا ہے، خدا ہی لے لیتا ہے، خدا کا نام بلند رہے!

تمہاری بیماری کے زمانے میں صرف ایک دعا تھی جو دن رات، صبح و شام سوتے جاگتے ہر وقت میرے ہونٹوں پر یا میرے دل میں گھومتی رہتی تھی، تمہاری صحت کی دعا۔ اور جب معلوم ہوگیا کہ اثر کو دعا کے ساتھ دشمنی ہے۔ تو ایک سوال تھا جو میرے دماغ پر نہایت شدت کے ساتھ مسلط تھا: بارِ الہا، میں اب کیا دعا مانگوں؟ اب دنیا میں کون سی

چیز ہے جس کی تجھ سے خواہش کروں، ہر چیز بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ رہ رہ کر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس بات میں تیری کیا مصلحت ہے۔ کہ تو نیکی اور شرافت کے شاہکار بناتا ہے اور عمر طبیعی تک پہنچنے سے پہلے، بغیر کسی ایسی وجہ کے جس کو سائینس یا طب سمجھ سکے، وہ ایسی شدید بیماریوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں جن کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اور پھر ان تکلیفوں اور آزمائشوں میں ڈالنے کے بعد تو انھیں اپنے پاس بُلا لیتا ہے؟ اپنے لفظوں میں تم سے کہتے بن نہیں پڑتا۔ اپٹن سنیکلئر کی خود نوشت سوانح عمری میں سے چند جملے تمہیں سناتا ہوں جو اس نے اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی میں لکھے ہیں:

"میں جانتا ہوں کہ پچاس سال تک مجھے ایک ایسی عورت کی محبت اور رفاقت نصیب ہوئی جو دنیا کی شفیق ترین، فہیم ترین، محبوب ترین ہستیوں میں سے تھی۔ کیوں اس کی زندگی کا انجام ایسے المناک حالات میں ہوا، ایک ایسا سوال ہے جو میں اپنے خدا سے کرتا رہوں گا۔ جب تک زندہ ہوں، لیکن مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس المیہ کی مصلحت کیا ہے؟ بس ایک ہی اخلاقی سبق ہے جو اس سے سیکھ سکتا ہوں: قدرت ہم پر اس قدر بے دردی کی بارش کرتی ہے اور کر سکتی ہے کہ انسانوں کو چاہیئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی بے رحمی، بے دردی یا بے مہری کا سلوک نہ کریں۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرے اور جو کچھ نیکی کسی کے ساتھ کرنی ہے وہ ابھی کر لے۔ کیوں کہ دیر یا سویر وہ ناگزیر وقت آئے گا جب گھنٹہ بج جائے گا دوست اور محبوب جدا ہو جائیں گے اور ہمیں ان کے ساتھ نیکی کرنے کا موقع بھی نہ ملے گا۔ کس قدر حسرتیں اب دل میں ابھرتی ہیں کہ تمھارے لئے یہ کیا ہوتا،

رہ کیا ہوتا۔ لیکن اب کیا ہوتا ہے؟

عزیز من یہی تمھاری زندگی کا پیغام ہے۔ ایک دوسرے سے محبت کرو، انھیں اپنے دل کی نرمی اور گرمی میں جگہ دو، ان کے ساتھ بھلائی کرو۔ محبت کے سینے میں زندگی کا لطف بھی ہے اور اس کے معنی بھی۔

عزیز من، محبت نے تمھاری زندگی کو اس کے ہر موڑ پر، ہر آزمائش میں، بشری کمزوریوں کے ساتھ کشمکش میں، شرافت کا سیدھا اور سچا راستہ دکھایا اور تمھاری فطرت کے سونے کو کندن بنایا۔ وہی محبت دنیا کے تمام دکھوں اور گمراہیوں کا علاج ہے۔ محبت جس کی تعریف عیسائیوں کے بھجن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"محبت بہت صابر ہوتی ہے اور بہت شفیق۔ محبت میں حسد نہیں ہوتا محبت اعلان نہیں کرتی، شان نہیں دکھاتی۔ بدتمیزی نہیں کرتی، خود غرضی نہیں کرتی، زچ نہیں ہوتی، غصہ نہیں کرتی۔ جب دوسرے خطا کریں تو اسے خوشی نہیں ہوتی۔ اسے تو خوشی ہوتی ہے لوگوں کی نیکی سے۔ وہ دوسروں کی برائیوں کو افشا کرنے میں تامل کرتی ہے، دیر لگاتی ہے۔ وہ آرزو کرتی ہے کہ ان کے بارے میں خوش فہمی سے کام لے، صبر سے کام لے، امید سے کام لے۔

محبت کبھی زائل نہ ہوگی۔ پیشین گوئیاں ختم ہو جائیں گی، زبانیں بند ہو جائیں گی۔ علم نئی دریافتوں کی وجہ سے پیچھے رہ جائے گا ہم تھوڑا کم کے علم حاصل کرتے ہیں، کم کم پیشین گوئیاں کر پاتے ہیں اور جب نیا علم حاصل ہوتا ہے تو پرانا علم منسوخ ہو جاتا ہے۔

پس ایمان اور امید اور محبت ہی باقی رہتے ہیں یہی تینوں، لیکن ان تینوں میں

محبت سب سے افضل ہے"

انسان نامکمل ہے اور محبّت کے اس کمال اور جمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو خدا کے مقدس اور مخصوص بندوں ہی کے حصّے میں آسکتا ہے۔ لیکن کیسی پرخلوص اور کامیاب کوشش کی تم نے اس مثالی تصویر تک پہنچنے کی۔ ! وہ جو صلہ دیتا ہے نہ صرف کوشش اور اس کی کامیابی کا، بلکہ نیت اور اس کے خلوص کا بھی، تمھارے حُسنِ سعی کو مشکور کرے۔

دوسرا حصّہ

ذکرِ جمیل

صالحہ عابد حسین

فہرست

اشکے کہ زِدل خیزد در سینہ شکستم من

یوں تو خالق کائنات نے جسے احسن الخالقین کہتے ہیں جو چیز بھی بنائی ہے وہ اپنی جگہ خوش وضع اور خوب صورت ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ ایسی حسین و جمیل شخصیتیں خلق کرتا ہے کہ فطرت ان کے جمال پر جھوم اُٹھتی ہے لیکن صرف حُسنِ صورت کسی انسان کو جمیل نہیں بنا سکتا۔ جس حسن پر فطرت ناز کرے، انسان رشک کریں، جسے دنیا خراج عقیدت پیش کرے، اس میں حُسن صورت کے ساتھ حُسن کردار بھی شامل ہوتا ہے۔

خواجہ غلام السیدین ان اَن گنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کو پروردگار عالم بڑی فیاضی کے ساتھ نوازتا ہے۔ صورت اور سیرت، مزاج اور اخلاق، ذہانت اور قابلیت، خود شناسی اور خدا شناسی کی صفات، ان کی شخصیت میں اس طرح رچی بسی تھیں جیسے سورج کی سفید کرن میں قوسِ قزح کے رنگ گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ انکے علمی اور تعلیمی کارنامے اتنے عظیم اور ہمہ گیر، ان کے تعلقات اتنے وسیع اور ان کی شخصیت اتنی پہلودار ہے کہ میں ان سب کو جیسا چاہئے دکھانے کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ شاید کبھی ان کا کوئی لائق شاگرد اس کام کو انجام دے سکے۔
میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی خودنوشت

جو آپ نے ملاحظہ فرمائی صرف ان کی ابتدائی چالیس سال کی کہانی ہے۔ پھر سیدین صاحب انکسار اور خود پوشی میں مولانا حالی کے سچے جانشین ہیں۔ انکی ناتمام تصنیف سوانح عمری نہیں، بلکہ ان کے مشاہدات و تجربات کی روداد ہے۔ اپنا ذکر بدرجہ مجبوری کرنا بھی پڑا ہے تو وہ آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں اس لئے ان کے بعض دوستوں اور چاہنے والوں کی یہ خواہش بلکہ فرمائش تھی۔ کہ میں اس ادھوری کہانی کو پورا کرنے کی کوشش کروں ایک اور جذبہ بھی مجھے اس کام پر اکسا رہا ہے۔ ہم بہن بھائی میں بزرگی اور خوردی کے سارے آداب کے باوجود دوستی اور بے تکلفی کا ایک نرالا رابطہ بھی تھا اور کبھی کبھی آپس میں عجیب طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ موت کا ذکر ہم لوگ اکثر کیا کرتے تھے۔ یعنی اپنی موت کا۔ وہ بڑے کھلنڈرے انداز میں کہتے کہ بس اب میرا چل چلاؤ ہے کبھی یہ فرماتے کہ میں تم لوگوں کو آنے والی گھڑی کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ کہا کرتے تھے "تو میرے بعد مجھ پر لکھے گی"۔ میں کہتی "انشاء اللہ آپ مجھ پر لکھیں گے میں تو تیس برس سے زیادہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ پہلے جاؤں گی"۔ ایک پراسرار سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھرتی۔ "یہ خوش فہمیاں!" اس وہم کو دور کرنے کے لئے میں نے انکے COMMEMORATIA VOLUME میں ان پر مضمون لکھا تھا "سیدین اپنے گھر میں"۔ پھر بھی ان کی چھیڑ بدستور جاری رہی۔ "تو مجھ پر لکھے گی ۔ بہت لکھے گی!" پھر ہنس کر کہتے "لکھنے کا مرض جو ٹھہرا۔

ستم زدہ ہے ذوق خامہ فرسائی!"

جو الفاظ اس وقت تیر کی طرح لگتے تھے آج وہ ان کی وصیت معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے یہ احساس تھا کہ میرا ان کا رشتہ ایسا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو

یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں نے ان کے ذکر میں مبالغہ اور جانب داری سے کام لیا ہوگا۔ ڈرتی ہوں کہ حالی کی طرح "مدلل مداحی" کا الزام مجھ پہ نہ لگ جائے۔ مگر سوچتی ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے، سیدین صاحب کو جیسا میں نے پچاس برس دیکھا اور پایا ہے اسے بیان کر دینا چاہئے۔ مجھے یہ امید بھی ہے کہ میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے بچ سکتی ہوں کہ میں نے اپنے والد، بھائی اور شوہر سے تھوڑا سا یہ سیکھا ہے کہ مخالفت میں شدت اور تعریف میں غلو ناپسندیدہ چیز ہے۔ توازن اور اعتدال شخصیت کی بھی جان ہے اور بیان کی بھی۔

غرض سال بھر سے اس کام کو کرنے کی ہمت باندھتی رہی اور وہ ٹوٹتی رہی۔ لیکن میں کوشش کروں گی کہ اس سمندر کو کوزے میں سمیٹ لوں۔ نہیں جانتی کہاں تک کامیاب ہوں گی

سیدین کا خاندان

سیدین صاحب کے جدِ اعلیٰ حضرت ابو ایوب انصاری تھے۔ ایک مستند روایت یہ ہے کہ ابو ایوب انصاری کی کسی پرپوتی کی شادی امام علی رضاؑ کے ایک صاجزادے سے ہوئی تھی اور چونکہ ابو ایوب انصاری کے پوتے کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنے نواسے یعنی امام علی رضاؑ کے پوتے کو متبنٰی بنا لیا اور ان کی نسل ان ہی امام زادے سے چلی۔ لیکن ہمارے بزرگوں نے یہ سب جانتے ہوئے کبھی سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ غلامِ اہل بیت ہونے ہی کو بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ البتہ خواجہ کا لقب ان کے ناموں کے ساتھ پشت در پشت سے چلا آرہا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد بعد میں ہرات میں جا کر بس گئی تھی ان میں سب سے نامور خواجہ عبد اللہ تھے، جو اس علاقے کے فرماں روا تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کے منصب پر بھی فائز تھے اور پیرِ ہرات کہلاتے تھے۔ بلبن کے زمانے میں ان کی اولاد میں سے دو نوجوان ہندوستان چلے آئے۔ ان دونوں بھائیوں کی بادشاہ وقت نے بڑی قدر و عزت کی اور دہلی کے قریب، پانی پت کے قدیم قصبے میں ان کو بہت سی زمین بطور معافی عطا کی ان میں سے ایک بھائی کا نام خواجہ ملک علی تھا۔ ان کی شادی پانی پت کے

مشہور ولی اللہ (جو حضرت مخدوم صاحب کے لقب سے مشہور تھے) کے خاندان میں ہوئی۔ جن کا مزار آج تک پانی پت میں مرجع خواص و عوام ہے۔ یہ خاندان سات سو سال تک پانی پت میں خوب پھلا پھولا اور اس میں بڑے بڑے صاحبانِ کمال اور اہل علم پیدا ہوئے۔

سیدین صاحب کے پردادا خواجہ اکبر علی انھیں ملک علی کی اولاد میں سے تھے۔ خواجہ اکبر علی کے بیٹے خواجہ اظہر علی اپنے اوصاف حمیدہ کی بدولت اپنے قصبے اور برادری میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ سات پشت سے اس گھرانے میں صرف ایک بیٹا ہوتا چلا آ رہا تھا۔ مگر اظہر علی کے اکلوتے بیٹے خواجہ غلام عباس کو خدا نے سات بیٹے (اور چار بیٹیاں) عطا کیں بیٹوں میں صرف تین زندہ رہے ان میں سے ہر ایک نے شرفِ خاندانی کے علاوہ شرفِ ذاتی میں نام پایا۔ اور ملک و ملت کی اپنے اپنے انداز میں خدمت کی، اور عزت و ناموری پائی۔ سیدین صاحب کے والد خواجہ غلام الثقلین منجھلے بیٹے تھے۔ جنھوں نے بیالیس سال کی عمر میں وفات پائی اور اس مختصر مدتِ حیات میں اتنا کچھ قومی خدمت کا کام کر گئے، اتنا علمی سرمایہ چھوڑ گئے جس پر حیرت ہوتی ہے۔

اب سیدین صاحب کی ننھیال کا حال سنیئے۔ خواجہ ملک علی کی اولاد میں ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے۔ خواجہ امداد حسین اور خواجہ الطاف حسین۔ یعنی حالی جس نے شعر و ادب کے وہ چراغ روشن کئے جن کی جوت آج بھی دنیائے اردو کو جگمگا رہی ہے۔ سیدین صاحب کی والدہ مشتاق فاطمہ حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین کی بڑی بیٹی تھیں۔

اس مختصر تمہید سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خاندانی وجاہت و شرافت، ذہانت، علم کی لگن، خدمت کا جذبہ، حق پرستی اور دینداری کی دولت سیدین

کو ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ بڑی خوش نصیبی اور سعادت بھی تھی اور کٹھن ذمہ داری بھی۔ بزرگوں کی شہرت اور ناموری پر شخصیت کی جو عمارت تعمیر ہو اس کی بنیاد تو ضرور مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن اگر مسالہ اچھا نہ لگے تو دیواریں جلد بیٹھ جاتی ہیں۔ ایسے نوجوان جو بزرگوں کے نام کو زندہ رکھیں اور ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔ ہماری قوم میں پہلے بھی کمیاب تھے اور اب تو نایاب ہوتے جاتے ہیں۔

سیدین صاحب نے اپنی اس کہانی کی ابتدا ہی میں اپنے والد، والدہ اور دوسرے بزرگوں کا تعارف کرایا ہے۔ اس کو پڑھ کر لوگوں کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ سیدین نے ماں باپ سے کیسی کیسی بیش بہا دولت ورثے میں پائی تھی۔ ان کو باپ سے وجاہت۔ ذہانت، محنت کی عادت، کام کی لگن عمل کی بے پناہ قوت اور جفاکشی ملی تھی اور ماں کے مزاج کی نرمی، محبت کی گرمی خیالات کی پاکیزگی اور درد دل کی دولت۔ اور ایمان وعقیدے کی روحانی نعمت تو دونوں ہی کی میراث تھی۔ ان موروثی صفات کو سیدین کی ذاتی خوبیوں نے ایسی جلا بخشی کہ وہ فخر خاندان بن گئے۔ آج ممانی، مشتاق فاطمہ، غلام الثقلین سجاد حسین اور غلام الحسنین، زندہ ہوتے تو اپنے اس وارث پر بجا طور پر فخر و ناز کرتے، اس مضمون میں اسی اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بیان کرنا چاہتی ہوں۔

بچپن اور جوانی

سیدین صاحب عمر میں مجھ سے تقریباً دس سال بڑے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے بچپن اور نوعمری کی باتیں خود میرے مشاہدے میں نہیں آئیں۔ البتہ بزرگوں سے سنا کرتی تھی اور ان میں سے کچھ حافظے میں محفوظ رہ گئی ہیں وہ ہمارے باپ چچا کی اولاد میں سب سے پہلے بیٹے تھے۔ اس لئے ان کی پیدائش سے سارے خاندان میں مسرت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی پچھلے پہر، تہجد کے وقت دادا نے مسجد میں یہ خوش خبری سنی تو جسم کے سارے کپڑے ایک فقیر کو بخش دیے اور کمبل لپیٹ کر گھر آئے۔ اگرچہ سیدین کی بڑی بہن جوان سے تین ساڑھے تین سال بڑی تھیں، خاندان کی بڑی لاڈلی تھیں اور ان سے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی بہت محبت و پیار رہا مگر خود سیدین صاحب پر سارا خاندان جس طرح فدا رہا اسکی مثال بہت کم ملے گی خاندان اور اہل وطن کو اس ہونہار نوجوان سے محبت کے ساتھ ساتھ اس پر فخر بھی کچھ کم نہ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سیدین صاحب بچپن ہی سے بڑے نیک اور سیدھے تھے۔ شرارت، ہنگامے، ضد، حسد، دوسروں کو ستانا اور پریشان کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ بزرگوں کا حکم سر جھکا کر مانتے، برابر والوں سے خلوص اور محبت اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ کھیل کود کے زیادہ شوقین نہیں تھے (لیکن بعد میں علی گڑھ میں

ٹینس اور بیڈمنٹن کا شوق پیدا ہو گیا تھا جو وہاں بھی اور کشمیر میں بھی برابر قائم رہا۔) پڑھنے میں شروع ہی سے بہت تیز تھے اور جیسے ابھی اردو پڑھنا سیکھا مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ بہن بھائیوں سے، خصوصاً بڑی باجی[1] سے بچپن ہی سے بہت محبت کرتے تھے۔ بہت چھوٹے سے تھے تب سے یہ حال تھا کہ دونوں بھائی بہن میں سے کسی کو کوئی بزرگ یا ابا میاں کے دوست کوئی چیز دیتے اور وہ بہت اصرار کے بعد لینے پر تیار ہو جاتے تو بڑے بھولپن سے کہتے "تو پھر میری باجی کے لئے بھی دیجئے۔" اور یہی وہ کہتیں "سدن میاں کے لئے بھی دیجئے۔" اس پر بڑی ہنسی ہوتی تھی۔ منجھلی بہن سیدہ خاتون جوان سے تین سال چھوٹی تھیں، ان سے سیدین صاحب بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اور دونوں بہن بھائی میں بہت دوستی بھی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ میں شاید اس وقت چھ یا سات برس کی ہوں گی۔ بھائی جان علی گڑھ سے جاڑے کی چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے اور چھت پر جو کمرہ تھا اس میں رات کو سوتے تھے۔ پتھر کا کوئلہ نیا نیا چلا تھا۔ اس کی زہریلی گیس کے اثرات سے لوگ واقف نہ تھے۔ چھوٹی باجی[2] سویرے اٹھ کر سب کے لئے چائے بنایا کرتی تھیں۔ رات کو باہر کے دالان میں روئی کے موٹے پردے پڑ جاتے تھے۔ اندر سہ دری میں اماں کے پاس میں سوتی تھی اور دوسرے لوگ باہر دالان میں۔ ایک صبح اٹھ کر چھوٹی باجی نے پتھر کے کوئلے کی انگیٹھی سلگائی اور اسے اندر لا کر پانی گرم ہونے کو رکھا۔ اور نماز پڑھنے کے بعد اس کے

---

[1] مختار فاطمہ بیگم سید محمد مستحسن زیدی

[2] سیدہ خاتون

پاس آ بیٹھیں۔ گیس ان کے دماغ کو چڑھ گئی اور یکایک وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئیں۔ اماں، ہم بچے اور گھر کے سب لوگ دوڑے اور رونے چیخنے کی آوازیں بھائی جان کے کان تک پہنچیں، تو وہ ننگے سر، ننگے پیر چھت سے نیچے دوڑے آئے اور یہاں اپنی محبوب بہن کو اس حال میں دیکھ کر، تیر کی طرح گھر سے باہر نکل گئے اور ذرا دیر بعد کسی ڈاکٹر کو لے کر واپس آئے۔ جس نے سب کو اطمینان دلایا، کچھ دوا دی اور چھوٹی باجی ہوش میں آگئیں۔ ایک بات واضح کردوں۔ اس وقت ہمارے گھرانے کی تہذیب میں بغیر کوٹ یا اچکن اور ٹوپی پہنے گھر سے نکلنا نہایت معیوب بات سمجھی جاتی تھی جس کی کوئی نوجوان ہمت نہ کر سکتا تھا۔ بہن کو ہوش آنے تک بھائی کی جو حالت تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ ان دونوں بھائی بہن کی صورت اور سیرت میں بے حد مشابہت تھی۔ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں ذہانت میں بھی وہ بھائی سے کچھ ہی کم ہوں تو ہوں۔ اگر وہ زندہ رہتیں تو کیا عجب ہے کہ ان ہی کی طرح خاندان کا نام روشن کرتیں۔ مگر بائیس سال کی عمر میں وہ خدا کو پیاری ہو گئیں۔ لیکن ان کا ان مٹ داغ بھائی بہنوں کے سینے پر ان کی نشانی بن کر رہ گیا۔ سیدین صاحب کو جتنی گہری الفت اس بہن سے تھی۔ وہ شاید پھر کسی سے نہ ہو سکی۔

اپنے والد کو تو بچپن سے انھوں نے اپنا ہیرو اور آئیڈیل مان لیا تھا اگرچہ صرف گیارہ سال کی عمر تک ہی باپ کی محبت اور تربیت کی دولت انکو نصیب ہو سکی اور پھر ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ان سے گہری عقیدت اور محبت ہمیشہ رہی۔ اس کا کچھ اندازہ اس مضمون سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو انھوں نے خواجہ غلام الثقلین پر "مرد درویش" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ مضمون ان کی تصنیف "آندھی میں چراغ" میں بھی شامل ہے عمر بھر ان کی مثال

ان کے سامنے رہی"۔ یہ احساس رہا کہ ایسے باپ کا بیٹا ہونے کا حق انہیں ادا کرنا ہے۔

لیکن سب سے گہرا نقش میرے دل پر اس محبت کا ہے جو سیدین صاحب کو اپنی ماں سے اور ماں کو ان سے تھی۔ یوں تو ہر ماں اپنے بچوں کو چاہتی ہے لیکن ہماری اماں کو اپنے بچوں سے جو والہانہ محبت، ان کے لئے قربانی اور ایثار کرنے کا جو اتھاہ جذبہ، ان کی زندگیاں، سنوارنے کی تربیت کرنے کی جو لگن تھی اس کے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور سیدین سے تو انھوں نے بیوہ ہونے کے بعد اپنی ساری تمنائیں وابستہ کر دی تھیں۔ وہ انھیں باپ کا سچا جانشین بنانا چاہتی تھیں۔ اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے ہر دکھ اور پریشانی خوشی سے جھیلتی تھیں۔ اسی طرح سیدین بھی پرستش کی حد تک ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ کیا عشق تھا ان ماں بیٹے کو ایک دوسرے سے۔ بے شک ایسی مائیں، جیسی سیدین کی ماں تھیں بہت کم ہوتی ہیں۔ لیکن سیدین ایسے بیٹے بھی کس ماں کو ملتے ہیں؟ فرمانبرداری اور سعادت مندی میں ان کی مثال مشکل سے نظر آئے گی۔ ۲۳ء میں انہیں انگلینڈ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ ملا مگر وہ اسے اس قلق میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے کہ اماں کیسے میری جدائی برداشت کریں گی؟ لیکن ماں نے بیٹے کے مستقبل کے لئے دل پر پتھر رکھ کر یہ جدائی گوارا کی۔ اور اصرار کر کے انھیں بھیج دیا تو بیٹے نے پہلا خط پانی پت کے ریلوے اسٹیشن سے لکھا۔ دوسرا دہلی سے۔ تیسرا بمبئی سے۔ پھر دو سال تک ہر ہفتے اس پابندی سے خط لکھتے رہے (اس وقت خط سمندر کے جہاز سے ایک مہینے بعد پہنچتا تھا، مگر ہمیں ہفتے کے ہفتے خط ملتے رہتے تھے) کہ جب

ایک ہفتہ ان کا خط نہیں آیا تو سارا خاندان سخت پریشان ہو گیا اور اماں کی تو جان پر ہی بن گئی۔ سید ین صاحب کا ایک خط جو وہاں سے انھوں نے اماں کو لکھا تھا نیچے درج ہے :-

۸ر جولائی ۱۹۲۵ء

مخدومہ مکرمہ جناب والدہ صاحبہ۔ تسلیم بعد تعظیم

یہ عریضہ لیڈز کے ایک ہوٹل کے کھانے کے کمرے میں لکھ رہا ہوں۔ آج میری یہاں سے روانگی ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں گاڑی آجائے گی۔ پہلے میرا ارادہ یہاں سے "جھیلوں کے ضلع" میں جانے کا ہے جو انگلستان کے نہایت خوبصورت حصوں میں سے ہے۔ اس کے بعد دو تین روز لندن ٹھہرتا ہوا جرمنی جاؤں گا۔

گذشتہ ہفتہ نتیجے سے اطلاع دے چکا ہوں۔ پروفیسر صاحب سے گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ میرے تھیسس سے بہت خوش ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر اس کو بجائے ایک سال کے دو سال ٹھہرنے کے بعد پیش کیا جاتا تو شاید ڈاکٹری کی ڈگری ہی مل جاتی۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ اگر اب سے تین سال بعد ہندوستان سے ایک نئی کتاب لکھ کر بھیجوں تو اس کا امتحان یہاں کیا جا سکتا ہے۔ لیڈز کے دوستوں سے رخصت کافی پُر رقت تھی۔ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ یہ لوگ جو فطرتاً اس قدر سرد اور خشک ہوتے ہیں اس قدر مہربانی

اور محبت سے پیش آئیں گے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے دورانِ قیام میں یہاں کسی کو کسی قسم کی رنجش نہیں دی۔ اور بہت سے نہایت شریف اور نیک فطرت لوگوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے مجھ سے وہی سلوک کیا جو وہ اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے کرتے۔ تقسیم ڈگری کا جلسہ گذشتہ ہفتہ کو ہوا تھا۔ اور اس میں علاوہ ہم لوگوں کے آنریری ڈگری شہزادی میری (جارج پنجم کی بیٹی) کو بھی دی گئی تھی۔ اس روز غالباً سب سے زیادہ خوشی کا اظہار تالیوں کے ذریعے لوگوں نے اس وقت کیا جب ڈگری مجھے دی گئی۔ مجھے یہ بات لکھتے ہوئے تامل ہوتا ہے کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ ممکن ہے اس سے یہ خیال ہو کہ مجھے کوئی اپنی تعریف مدنظر ہے۔ لیکن میں نے یہ بات صرف اس لئے لکھی ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے اس خاکسار نے یہاں کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ کی شایانِ شان نہ ہو۔ اور مجھ سے لوگوں کے خوش ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ میں نے کوئی انگریزوں کی تعریف یا خوشامد کی ہو۔ (جیسا کہ بدقسمتی سے بعض طالب علم کرتے ہیں) کیوں کہ شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جس نے انگریزی حکومت کے خلاف (مجھ سے[1]) زیادہ تقریریں کی ہوں لیکن اس یونیورسٹی کے طالب علموں کی تعریف میں میرا یہ کہنا

---

[1] یہ لفظ خط میں رہ گئے ہیں۔

فرض ہے کہ وہ ہر سچی بات کو جو خلوص سے کہی جائے سننے کو تیار رہیں اور اس کا برا نہیں مانتے۔

میں اس وقت جلدی میں ہوں اس لئے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ پیاری باجی جان کو خیریت سے اطلاع دے دیجئے گا۔ شاید چچا ابا صاحب کو مختصر خط لکھ سکوں۔ سب بزرگوں کو آداب بچوں کو نام بنام پیار۔

خاکسار آپ کو دیکھنے کا مشتاق

سیدین

اس خط کو پڑھ کر کون یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اکیس سال کے نوجوان کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ بعد میں لکھے ان کے خطوط کہیں زیادہ دلچسپ پر لطف اور بے تکلف انداز بیان کا ایک دل کش نمونہ ہیں۔ لیکن سیدین صاحب کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر اس خط سے روشنی پڑتی ہے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو ماں کی محبت اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کس قدر تھا۔

۱۹۲۵ء میں سیدین صاحب اعزاز کے ساتھ ایم۔ایڈ۔ کی ڈگری لے کر واپس آئے تو پہلے سے بھی زیادہ نرم گفتار، شیریں مزاج، ملنسار اور با محبت۔ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں پرنسپل مقرر ہونے کے بعد ماں بہنوں کو علی گڑھ لے گئے۔ بیٹے کی واپسی کے بعد اماں پونے تین سال ہی زندہ رہیں۔ جس میں سے آٹھ دس مہینے شدید بیماری میں گذرے۔ اس عرصے میں سیدین صاحب نے ہر خوشی اور راحت ان کے قدموں پر نثار کرنے کی کوشش کی۔ ان کے وہ سب قرضے ادا کیے

جوانھوں نے گذشتہ کئی سال میں کچھ گھر یلو ضرورتوں سے اور کچھ اپنی بے پناہ فیاضی کی وجہ سے لئے تھے۔ علی گڑھ میں وہ بھائی جان کے سب دوستوں اور ساتھیوں کی بھی "اماں" تھیں۔ ان کی ماں بہنیں بیویاں سب اماں کے پاس آتی رہتیں۔ سیدین صاحب نے اپنی منجھلی بہن کی اور اپنی شادی کے معاملے میں خاندان کے بعض افراد کی ناراضگی اپنے پر لے لی اور اماں کو اس سے بچایا۔ ایک خط میں انھوں نے اماں کو لکھا:۔

"...... آپ عزیزہ سیدہ کی جانب سے ہرگز متفکر نہ ہوں۔ میں نے آپ سے یہ پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر کہتا ہوں، میں ہر ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں اور اس میں جو برائی مجھ پر عائد ہو مجھے اس سے ذرا گھبراہٹ نہیں۔ برائے خدا آپ اس قدر گھبراہٹ اور پریشانی سے خود کو بچائیں۔..."

گھر میں کئی نوکر تھے اور ان کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ اماں کو آرام پہنچائیں۔ خاندان بھر کے لوگ ان سے ملنے یا کسی کام سے علی گڑھ آتے جاتے رہتے۔ اور سیدین صاحب ان کی اسی طرح خاطر مدارات اور بزرگداشت کرتے جیسے خود اماں کی کرتے تھے۔ وہ بیمار ہوئیں تو دوا علاج میں جان لڑا دی۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا پہاڑ پر لے گئے۔ دلی میں گھر لے کر ڈاکٹر رحمان[1] اور ڈاکٹر انصاری[2] کا

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمن [2] ڈاکٹر مختار احمد انصاری

علاج کرایا۔ دہاں بیٹیوں کے علاوہ بہت سے پانی پت کے عزیز بھی موجود تھے۔ خود بھائی جان چھٹی لے کر علی گڑھ سے آتے اور انکے پاس رہتے، ان کا کام کرتے مسکرا مسکرا کر اماں سے باتیں کرتے، جیسے وہ ان کی خطرناک حالت کو جانتے ہی نہ ہوں، ان کے آنے سے اماں کا بیمار چہرہ کھل جاتا اور زندگی کی ایک لہر ان میں دوڑ جاتی۔ پھر جب حکم قضا پورا ہوا تو انھوں نے اس عزیز ترین ہستی کی جدائی کو اس صبر کے ساتھ جھیلا جو ان ہی کا حصہ تھا اور عمر بھر ان کا حصہ رہا۔ ہاں اماں کی ایک تمنا پوری نہ ہو سکی۔ بیٹے کی شادی کا ان کو بہت ارمان تھا۔ بھائی جان کے لئے کتنے ہی پیام خاندان کے اور خاندان سے باہر کے برسوں سے آرہے تھے۔ ہمارے گھرانوں میں یہ دستور نہ تھا کہ پیام لڑکی والوں کی طرف سے آئیں۔ یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی۔ مگر سیدین صاحب سے لوگ اتنی محبت اور ان کی عزت کرتے تھے کہ یہ رواج توڑ دیا گیا تھا۔ اماں کو اتنی بڑی ذمہ داری کا بڑا احساس تھا اور اپنے لائق بیٹے کے لئے لایق دولہن تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ کئی جگہ بات چلی مگر معاملہ طے نہ ہوا اور وہ یہ حسرت لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ انہیں یہ فکر بھی تھی کہ بیٹے کا بیاہ ہو جائے تو کم سن بچوں کو بہو کے سپرد کر جاؤں گی۔ مگر انکی بہو عزیز جہاں بیگم آئیں تو انھوں نے نند اور دیور کو بہت محبت دی۔ ان میں بہت سی خوبیاں اپنی ساس کی سی تھیں۔ تبھی تو انھوں نے اپنے شوہر کا دل جیت لیا تھا۔

سیدین صاحب کی بے داغ جوانی پر پوری روشنی تو ان کے بے تکلف اور گہرے دوست ہی ڈال سکتے ہیں۔ چھوٹی بہن ہونے کے ناتے میں اس سے زیادہ واقف بھی نہیں اور کچھ زیادہ کہنے کی گستاخی بھی نہیں کر سکتی۔

لیکن اتنا جانتی ہوں کہ علی گڑھ اور پانی پت میں، خاندان اور خاندان سے باہر، نوجوانوں کو ان کی مثال دی جاتی تھی۔ رومانی مزاج دوست (رنگین مزاج تو ان کے حلقہ احباب میں شاید تھے ہی نہیں) ان کا مذاق بھی اڑاتے، فقرے بھی کستے مگر پیٹھ پیچھے۔ سامنے کس کی مجال تھی کہ اس زاہد شب زندہ دار، خوش مذاق، ظریف نوجوان پر فقرے کسے جس کی بے پناہ پھبتیاں کسی کو نہ چھوڑتی تھیں۔ ان کے کیریکٹر کی مضبوطی اور پاکبازی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شریک حیات، (جو ایسے ماحول سے آئی تھیں جہاں مردوں کی رنگین زندگی عام بات تھی) ان کے اونچے کیریکٹر پر بے حد نازاں تھیں۔ اگر کوئی مذاق میں بھی (یا بد باطنی سے) ان کے شوہر پر کوئی الزام رکھتا تو وہ اپنی نرم مزاجی کے باوجود غصہ سے بے قابو ہو جاتی تھیں۔ اکثر مجھ سے شکایت کرتیں، میں ہنس کر ان کو ٹھنڈا کرتی "بھابی جان! کیا چاند پر خاک ڈالنے سے پڑ سکتی ہے؟" بیگم سیدین ہی کے سنائے ہوئے دو واقعات کا میں یہاں ذکر کروں گی جس سے اندازہ ہوگا کہ سیدین صاحب کی زندگی میں بھی زلیخائیں آئیں جنھوں نے ان کا دامن چاک کرنا چاہا۔ مگر اس یوسف وقت کی مضبوط سیرت کے سامنے ان کے ڈنک گر گئے۔

جب وہ انگلستان گئے تو خاندان بھر میں یہ چرچا تھا کہ ان کی شادی یا منگنی کر کے بھیجا جائے کہ اس زمانے میں جو نوجوان ولایت جاتے ان میں سے اکثر "میم بیوی" لے آیا کرتے تھے۔ مگر بھائی جان شادی یا منگنی پر تیار نہ تھے۔ اور میری اماں کو اپنے بیٹے پر پورا اعتماد تھا۔ اور ان کے بیٹے نے اس اعتماد کو سو فیصدی پورا کیا۔ سیدین کا حسن صورت و سیرت ایسا نہ تھا کہ وہاں لڑکیاں ان کی گرویدہ نہ ہوتیں کئی لڑکیوں سے ان کی دوستی

ہوئی مگر انھیں سیدین کی بہن بن جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ انگلستان کے قیام ہی کا واقعہ ہے کہ ایک خاتون بری طرح ان پر فریفتہ ہوگئیں اور ان کو رجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر یہ اپنی معصوم طبیعت کی بنا پر کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ ایک بار کسی بہانے سے وہ انھیں ایک تنہا کمرے میں لے گئیں۔ کافی وقت گذر گیا۔ وہ منتظر تھی اور یہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آخر وہ اٹھی، سیدین صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا "تم بڑے معصوم ہو۔ ایسا شریف اور پاکباز نوجوان میں نے نہیں دیکھا۔"

اس سے بھی بڑی آزمائش برسوں بعد پختہ عمر میں پیش آئی۔ ایک خاتون جو شریف گھرانے کی تھیں اور خاصے اچھے عہدے پر مامور، کچھ فائدے اور مصلحت کی خاطر، کچھ ان سے متاثر ہو کر بری طرح ان پر فریفتہ ہوگئیں اور برسوں انکے پیچھے پڑی رہیں۔ انھوں نے بیگم سیدین سے بھی خوب دوستی گانٹھ لی تھی۔ مدت تک تو دونوں میاں بیوی ان کا مقصد سمجھ ہی نہ سکے اور ان کے "خلوص" اور "خصوصیت" سے بہت متاثر رہے۔ جب معاملہ بہت بڑھ گیا اس وقت بھی سیدین صاحب نے سوا اپنی بیوی کے کسی سے یہ بات نہیں بتائی۔ دونوں ان سے ایسے خوفزدہ تھے جیسے کوئی بچہ "ہوّے" سے ڈرتا ہو۔ ویسے یہ بات بتا دوں کہ سیدین صاحب کی بہت سی عورتوں سے دوستی تھی جن میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں، عورتیں بھی اور معمر خواتین بھی۔ وہ سب سے بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ بعض وقت لوگوں کو ان کے خلوص پر شبہ بھی ہو جاتا تھا۔ شاید ابتدا میں ان "خاتون" کو بھی غلط فہمی ہوئی ہو۔ لیکن سیدین صاحب کے دل میں عورت کا احترام اور اس کے لئے گہرا انس تھا کہ وہ کسی سے رکھائی نہ کر سکتے تھے۔ مگر عمر کی اس منزل میں، ایسے حالات میں اور ایسی عورت سے جس طرح

سیدین صاحب نے اپنا دامن بچایا اور کبھی اس کی ہتک یا اس سے بے رخی نہیں کی۔ یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ اور جس طرح ان کی بیوی نے ان پر پورا اعتماد کیا اور خاموشی سے نہ صرف خود "دوستی" نباہتی رہیں بلکہ اپنے شوہر سے ملنے جلنے پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اس کی مثال بھی کم سے کم میں نے نہیں دیکھی۔ سیدین کی پاکبازی کے سامنے ایسی کتنی عورتوں کے ڈنک گر گئے اور ان میں سے بعض ان کی عقیدت مند بن گئیں اور بعض خاموشی سے الگ ہٹ گئیں۔ مگر کوئی بھی ان کی دشمن نہیں بنی۔

لیکن سیدین صاحب کی پاکبازی کسی خشک مزاج صوفی یا اکل کھرے زاہد کی سی نہ تھی۔ یہ ایک با اصول، دین دار نوجوان کا کیریکٹر تھا جو محبت اور سیکس دونوں کو مقدس سمجھتا تھا اور اپنی اس اچھوتی محبت کا نذرانہ اس با عصمت لڑکی کو پیش کرنا چاہتا تھا جو اس کی رفیق حیات بنے گی اور شادی کے بعد بیوی کا اس طرح وفادار رہنا ان کا ایمان تھا جس طرح بیوی ان کی وفادار تھی۔

میاں بیوی

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں اشارہ کیا ہے خاندان اور خاندان سے باہر بہت سے لوگ اس کے خواہش مند تھے کہ اس ہونہار نوجوان سے اپنی لڑکی کا رشتہ کریں۔ خاندان میں روایت پرستی اور خودداری زیادہ تھی۔ اس لئے کسی نے کھل کر اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ غیر گھرانوں کی طرف سے البتہ، اماں کو پیام وسلام ملتے رہتے تھے تعلیم یافتہ متوسط گھرانوں کے علاوہ جاگیرداروں، تعلقداروں اور اونچے سرکاری افسروں "خان بہادر" اور "سر" کی بیٹیوں کے پیام آتے رہے۔ اس غریب نوجوان کے لئے جو اس وقت چار سو روپے ماہوار کا ٹریننگ کالج علی گڈھ میں نوکر تھا۔ اور اچھے لڑکوں کا بھی اس دور میں کال نہ تھا۔ ان میں بعض لڑکیاں اس زمانے کے لحاظ سے اچھی تعلیم یافتہ بھی تھیں۔ اکثر خوب مالدار تھیں اور بعض بہت خوب صورت بھی۔ اماں اور خود بھائی جان حیران بھی تھے کہ یہ الٹے پیام کیوں آرہے ہیں۔ اور پریشان بھی کہ کس کا انتخاب کریں۔ خاندان میں شادی نہ کرنے کی اول تو والد مرحوم کی وصیت تھی۔ پھر اماں یہ نہ چاہتی تھیں کہ ایک لڑکی کو بہو بنا کر باقی سب عزیزوں کی دل آزاری کریں۔ باہر کی لڑکیوں کے انتخاب میں یہ مشکل تھی کہ ان ماں بیٹے میں بڑی

خودداری اور استغنا تھا۔ فکر یہ تھی کہ مالدار گھرانے کی لڑکی آئے گی تو ہمارے گھرانے میں جس کی قدریں اور تھیں (اور جو انھیں جان سے زیادہ عزیز تھیں) وہ کیسے کھپ سکے گی؟ پھر بھی اس زمانے میں عزیز جہاں بیگم سے بات خاصی آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر جب اماں سے کسی نے یہ کہا کہ ان کی ایک بزرگ خاتون یہ کہتی ہیں کہ "چار سو روپلّی میں لڑکا کیا خود کھائے گا کیا ہماری لڑکی کو کھلائے گا اور ساتھ ہی کنبہ بھی پالنا ہوگا" تو ان کو بہت دکھ ہوا اور بات انھوں نے وہیں ختم کر دی۔

اماں اور بہن کے انتقال کے بعد سیدین صاحب کا گھر ویران ہوگیا۔ اور ان دونوں صدموں کا ان کی صحت پر بھی بہت اثر پڑا۔ ہمارے چچا خواجہ غلام السبطین (جو بھتیجے کو بے حد چاہتے تھے) اور دوست کرنل بشیر حسین زیدی، (جن سے مرحومہ بہن سیدہ خاتون کی منگنی ہو چکی تھی) دونوں نے اصرار کیا کہ وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کو چلیں اور بھائی جان کو لے کر تین چار مہینے تک سیاحت کی اور واپس آئے تو صحت بحال تھی اور صدمے کو انھوں نے جھیل لیا تھا۔ باجی، ہجی اماں اور پھوپھی اماں ان کا گھر بسانے کی فکر میں تھیں۔ دولہن کی تلاش شروع ہوگئی۔ عزیز جہاں بیگم کے بھائی ساجد صاحب[1] نے پھر تحریک کرائی۔ باجی نے لڑکی کو جا کر دیکھا پسند کیا۔ اور بھائی جان کو بتایا۔ بھائی جان نے کہا۔ "باجی آپ کو لڑکی پسند ہے تو مجھے بھی ہے۔" آخر جنوری ۱۹۳۰ء میں چند ہفتوں کے اندر رشتہ طے ہو کر شادی ہوگئی۔ عزیز جہاں کی نانی نے کہا۔ میں کسی رسم کو نہیں مانتی

---

[1] صاحبزادہ ساجد علی خاں۔

سوا اس کے کہ شرعی مہر پر نکاح ہو جائے۔ یہاں کس کو انکار تھا۔ ان مرحومہ نے جنہیں سب میّا کہتے تھے جہیز میں علاوہ پہننے کے چند جوڑوں کے پانچ مٹی کے برتن اور کلام مجید، جانماز، تسبیح اور سجدہ گاہ دی کہ یہی بی بی فاطمہ کا جہیز تھا۔ اور ہمارے گھرانے کی بڑی بوڑھیوں نے اگرچہ اعتراض کئے۔ لیکن میری چچی، خالہ اور پھوپھی نے یہ سب سامان سر پر رکھا اور کہا ہمارے لئے یہ سعادت ہے (کئی ماہ بعد انھوں نے علاوہ کوٹھی کے ہزاروں کا جواہرات کا زیور اور بھاری کپڑے وغیرہ بھابی جان کو دیے۔ مگر اُس وقت وہ ایک مثالی شادی کرنا چاہتی تھیں) شادی میں پانی پت سے تقریباً سارا خاندان اور بھائی جان کے کتنے ہی دوست شرکت کے لئے آئے تھے۔ اپنی حیثیت سے کچھ بڑھ کر ہی دولہن کے لئے کپڑے زیور تیار کرائے گئے۔ ان کا وسیع گھر چھوٹا پڑ گیا تھا۔

ہمارے گھر میں برسوں بعد شادی کا یہ پہلا موقع آیا تھا اور شادی بھی کس کی سیدین کی جو خاندان بھر کی آنکھ کا تارا تھے۔ گھر بھرا ہوا تھا، ہر طرف چہل پہل تھی، مگر ہم بھائیوں اور بہنوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور دل میں درد کی ٹیسیں کہ جن دو ہستیوں کو اس شادی کی سب سے زیادہ تمنا تھی وہ ہم سے بہت دور تھیں۔ مگر چاروں بہن بھائی ایک دوسرے سے اپنا غم چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے تھے۔

عزیز جہاں بیاہ کر سسرال میں آئیں تو ان کے لئے یہ بالکل ایک نئی دنیا تھی۔ مگر وہ تھوڑے ہی دن میں سسرال میں گھل مل گئیں اور اپنی محبت اور نیکی اور سادگی کی بدولت سب کی پیاری بن گئیں۔ اور شوہر کے دل پر تو انھوں نے آتے ہی راج کرنا شروع کر دیا تھا۔ کم خوش نصیب

ہوں گے جن کو سیدین کی طرح اپنے خوابوں کی تعبیر ملی ہوگی۔ ہاں عشق سیدین نے بھی کیا۔ مگر کس سے؟ اپنی بیوی سے جسے پہلی بار شب عروسی کو دیکھا تھا۔ کس مرد نے اس طرح اپنی بیوی کو چاہا ہوگا؟ اسے ایسی عزت اور رفاقت دی ہوگی؟ عزیز جہاں میں بہت سی صفات تھیں۔ مگر وہ جس ماحول سے آئی تھیں اس میں اور ہمارے گھرانے کے رہن سہن، خیالات وغیرہ میں بہت فرق تھا۔ ان کی تعلیم اچھی تھی۔ اردو فارسی ایک مولوی سے اور انگلش ایک اینگلو انڈین گورنس سے پڑھوائی گئی تھی۔ مگر سخت پردے اور قدامت پرستی کے دائرے ان کے گرد اس قدر تنگ کر دیے گئے تھے کہ شادی کے بعد کی زندگی ان کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ مگر انھوں نے بہت جلد اپنی غریب سسرال کے رنگ میں اپنے کو رنگ لیا۔ وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھیں جس کو خوبیٔ قسمت سے سیدین جیسا جوہری نصیب ہوا، سیدین صاحب نے صبر، لگن، اعتماد، محبت اور نرمی سے ان کی تربیت کی۔ ان کی خوبیوں کو ابھارا، ان کی صفات کو نکھارا، خامیوں کو دور کیا، خوبیوں کو سراہا اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور جلد ہی وہ ایسے شوہر کی رفاقت اور دوستی کے قابل بن گئیں —— اور سچ مچ رفیق رنج و راحت ثابت ہوئیں۔ ان دونوں نے مل کر زندگی کی مسرتیں بھی لوٹیں اور کڑے امتحان بھی دیے۔ دکھ اور بیماریاں بھی جھیلیں اور ایک دوسرے کی تیمارداری اور دلداری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ذمہ داریاں بھی اٹھائیں، ناگواریاں بھی سہیں۔ بدگمانیاں بھی جھیلیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ ان میں باہم ان بن یا جھڑپ نہ ہوتی تھی۔ یا کوئی غلط فہمی کبھی پیدا نہ ہوئی ہو۔ لیکن اس کی خبر کسی دوسرے کو نہ ہوتی تھی۔ دونوں آپس ہی میں نپٹ لیتے تھے۔

اصولی اور بڑی باتوں میں بھابی جان جھک جاتیں اور بھائی جان کا کہنا ماننا پڑتا۔ بہت سی "چھوٹی چھوٹی" باتیں بھابی جان کی خوشی کے لئے بھائی جان مان لیتے ــــ یہ باتیں ہیں "چھوٹی" کہہ رہی ہوں۔ مگر شوہر عام طور پر ان ہی "چھوٹی چھوٹی" باتوں، پر اکڑ جاتے ہیں، ضد یا جلتے ہیں۔ اور دونوں کی زندگی مصیبت بن جاتی ہے۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ کب اور کہاں کس کی بات ماننی چاہئے۔ میں بھابی جان کی رازدار تھی۔ اور اکثر مجھے وہ سب کچھ بتا دیا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے یہ خواہش ہی رہی کہ کبھی سیدین صاحب کو اپنی بیوی سے غصے میں یا اونچی آواز سے بات کرتے یا جھڑکتے سن لوں، تو ان کو فرشتوں کی صف سے عام آدمیوں کی صف میں کھینچ لاؤں۔ مگر ان کی ملکوتی محبت کے آئینہ پر کبھی میل نہیں آیا۔ اور "یہ آرزو" پوری نہ ہوئی۔ جس انداز میں وہ اپنی بیوی کو سمجھاتے؛ حالات سے سمجھوتا کرنے، خدا پر بھروسہ کرنے اور اس کے بندوں کے کام آنے کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

۱۹۶۱ء میں وہ ایجوکیشن منسٹری کی سکریٹری شپ سے الگ ہوگئے اور چند ماہ تک گھر میں لکھنے پڑھنے میں اور باہر دوسری علمی اور تہذیبی مصروفیات میں وقت کاٹتے رہے۔ اس زمانے میں بیگم سیدین بہت پریشان تھیں۔ ان کی طبیعت بہت حساس تھی اور چھوٹی سی بات سے بھی وہ پریشان ہو جاتی تھیں اور اس وقت تو ان کو یہ فکر تھی کہ سیدین صاحب کی صحت پر "بے کاری" کا اثر نہ پڑے۔ اسی زمانے میں سیدین صاحب کسی کام سے باہر گئے۔ بیگم سیدین نے انھیں جو خط لکھے ان میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا ہوگا۔ وہاں سے سیدین صاحب نے ایک خط تو سب کے نام

بھیجا اور ایک الگ پرچہ صرف بھابی جان کے نام لکھا۔ اتفاق سے یہ پرچہ مجھے ان کے خطوط میں مل گیا۔ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح سے اپنی بیوی کی تربیت کرتے اور کس پیار اور نرمی سے سمجھاتے تھے:۔

"صرف عزیزم کے لئے۔

اس کے ساتھ جو دوسرا خط ہے وہ تو گویا سب کے نام ہے۔ یہ خط کی چند سطریں تمھارے لئے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف!

تم نے اپنے کئی خطوں میں کوئی کوئی بات پریشانی اور بے ہمتی کی لکھی ہے۔ اگر تم معاف کرو تو یہ پوچھوں کہ کیوں! اب عمر کی آخری منزل میں ہمیں اپنے اندر کی طرف سے اطمینان اور سچی خوشی کی جوت جگانی چاہئے۔ اس کے لئے خارجی اسباب پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ آخر ساری عمر آرام کے ساتھ گزاری اگر بالفرض اس وقت پریشانی بھی ہو تو کیا اس کو انسانوں کی طرح نہ جھیلیں؟ تمھیں مکان یا بے مکانی یا بے مرکزی کا گلہ ہے۔ ٹھیک تو یہ بھی ہو جائے گا لیکن اگر اس میں وقت بھی لگے تو گلہ کیوں ہے؟ یا تو ہم نے جو کیا وہ غلط ہے۔ ہمیں اس چیز کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیئے تھا جو ناحق اور باطل ہے اور پھر آرام سے رہتے۔ یا سچی بات کرنی چاہئے۔ اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی قیمت ادا کرنی چاہیئے۔ مجھے تو یہ شکایت ہے (یا شکریہ!) کہ اس نے ایمان کا امتحان ساری عمر

نہیں لیا۔ اب کہ آخری عمر میں اس نے یہ سعادت بخشی ہے۔ وہی اس کی توفیق دے کہ میں (اور تم) دونوں اس میں پورے اتریں اور روپے پیسے جسمانی آرام، نام و نمود کی خاطر اس پر آنچ نہ آنے دیں.. اور ہمارے ایمان میں اس قدر کمزوری نہ پیدا ہو کہ کسی شخص کو خدا سے زیادہ صاحب اقتدار سمجھیں۔ یا اس کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی پر مقدم جانیں۔

معاف کرنا اگر میرا یہ سب کچھ لکھنا تمھیں ناگوار گذرے۔ لیکن میرے دل پر اس خیال کا بہت بار ہے کہ تم اپنے موجودہ حالات کی وجہ سے اس درجہ ہراساں ہو اور جس ایمان اور خداترسی نے تمھاری ساری زندگی کو منوّر رکھا ہے اور تمھیں اس قدر خدمتِ خلق کی توفیق دی ہے، تم اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکی ہو۔ اگر ہم اپنے دل کو مضبوط رکھیں اور ایمان کی رسّی کو تھامیں تو کون قوت ہمارے اندر کے اطمینان کو چھین سکتی ہے؟"

جاننے والے جانتے ہیں کہ سیدین ان باخدا لوگوں میں تھے جو "ایمان کی رسّی" کو ہمیشہ تھامے رہتے ہیں اور کوئی قوت جن کے "اندر کے اطمینان" کو نہیں چھین سکتی ہے۔

بیگم سیدین اپنے شوہر کو بہت چاہتی تھیں۔ ان کی بے حد قدر و عزت کرتی تھیں۔ ان جملوں سے محبت کی اس گہرائی، اس احترام کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو ان کے دل میں اپنے شوہر کے لئے تھا۔ خدا اور رسول کے بعد سب سے اونچا مقام ان کے دل میں سیدین کا تھا۔ ۱۹۵۰ء تک

وہ ایک چاہنے والی بیوی تھیں جس کا اکیلا سہارا اس کا شوہر ہوتا ہے اور ہر معاملے میں وہ اس کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن شوہر کی شدید بیماری میں انکی سیرت کا ایک اور رخ سامنے آیا۔ جس طرح انھوں نے حوصلے، ہمت، سلیقے اور سوجھ بوجھ سے ان کی تیمارداری کی اور ان کو ہر طرح کا آرام وسکون پہنچایا وہ بھی ایک کارنامہ تھا۔ اور پھر ان کے تندرست ہونے کے بعد بھی جدوجہد میں لگی رہیں کہ سیدین صاحب کو پریشانیوں اور فکروں سے بچائیں۔ وہ خاموشی سے گھریلو اور خاندانی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتیں ان کے غم اور دکھ بٹاتیں، ان کو کسی حادثہ یا سانحہ کی خبر بڑی احتیاط سے دیتیں، ان کی ہر خواہش اور خوشی دل وجان سے پوری کرتیں۔ اب ان کی دیکھ بھال اور خدمت کو ہی انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا لیا تھا۔ تیرہ برس انھوں نے جیسے سیدین صاحب کو پھولوں میں تولا اور .... ان کی صحت وسلامتی کے لئے جان کھپا دی ...... بڑی لمبی اور دلکش داستان ہے یہ۔ لیکن قدرت کو شاید یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کسی کو مسرتوں کا چھلکتا جام مدت تک نصیب ہو۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں "وِس کانسن" (امریکہ) میں تین مہینے کی جاں گزا بیماری کے بعد انھوں نے، اپنی دلی تمنا کے مطابق شوہر کے زانو پر سر رکھے رکھے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس دوران میں سیدین صاحب نے پانی کی طرح روپیہ بہایا، بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کرایا، دن رات تیمارداری کی، ہر وقت خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ مگر حکم خدا کچھ اور تھا جب ان کی جدائی کی گھڑی آئی تو سیدین نے اس جانکاہ حادثہ کو بھی اسی صبر اور خاموشی کے ساتھ جھیل لیا۔ جس طرح اس سے پہلے غموں کو سہاتے آئے

تھے۔ بھابی جان کے بعد، ان کا محبوب جسم ہندوستان لانے سے پہلے، انھوں نے ایک خط میں یہ جملہ لکھا تھا۔ "دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور چھوڑ دیتا ہوں کہ اب اس سے کیا مانگوں؟" کیا یہ جملہ پورے مرثیہ پر بھاری نہیں؟۔ پھر نو سال تک اس محبت کی شمع دل میں فروزاں کئے، جدائی اور تنہائی کی بھاری صلیب اٹھائے وہ اپنے فرائض پوری ذمہ داری، دل کی پوری آمادگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اب ان کی مسرت اور زندگی کاٹنے کا سہارا کام تھا — کام، جس سے ان کو عشق تھا۔ مقصد جس کو وہ ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "محبّت کر کے کھو دینا اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے کہ کوئی بدنصیب اس نعمت سے محروم رہے!"

خاندان اور دوستوں سے تعلقات

کسی شخص کی سیرت کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ جو لوگ اس سے بہت قریب ہیں، ان سے اس کے کیسے تعلقات رہے ہیں۔ کچھ یہ بھی ہمارے ہاں کا دستور سا ہے کہ ہر دل عزیز اور شہرت و عزت رکھنے والی ہستیوں سے عام طور پر خاندان والے جلتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں سے بہت سے حضرات اپنے اہل خاندان کو نظر انداز کر کے احساس کمتری و احساس محرومی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ نہیں جانتی یہ سیدین صاحب کی ہستی پیشانی کی کشش تھی یا ان کے دل کی وسعت اور گداز، ان کی گفتگو کا سحر تھا یا دلِ درد مند کا کرشمہ، محبت کی گہرائی یا دوسروں کو سمجھنے اور انکی رائے کا احترام کرنے کی برکت یا پھر ان سب کا امتزاج، کہ وہ جس طرح باہر کی دنیا میں محبوب و ہر دل عزیز رہے اپنے وسیع خاندان کے بھی وہ بہت پیارے تھے۔ لوگ ان کو چاہتے بھی تھے اور ان پر فخر بھی کرتے تھے۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ اگر دنیا میں فرشتے بھی بستے تو ان کے بھی عزیز دل کو ان سے شکایت ضرور پیدا ہوتی۔ بے شک بعض لوگ ان سے کڑھتے یا جلتے تھے۔ بعض کسی غلط فہمی کی وجہ سے بدگمان ہو جاتے بعض حسد کے مرض میں مبتلا تھے۔ یا یوں ہی خدا واسطے کا بیر۔ اور کچھ کو تو

محض ان سے یہ شکایت تھی کہ وہ ہم کو سب سے زیادہ کیوں نہیں چاہتے۔ کسی اور کو کیوں چاہتے یا اس کی تعریف کرتے ہیں (حالانکہ چاہت کے پیمانے ابھی تک دریافت نہیں ہوئے) ایسے لوگ ان پر کڑی تنقید کرتے بُرا بھلا کہتے، اعتراض بھی کرتے۔ مگر پیٹھ پیچھے۔ سامنے آتے ہی ہر ایک کا ڈنک اس مجسم خلوص و محبت کے سامنے گر جاتا تھا جس کا نام سید آمین تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود سیدین صاحب کو بالکل خبر نہ ہوتی کہ لوگ ان سے خفا ہیں یا بُرا کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کے چھوڑے تیر پہنچانے میں مزہ آتا ہے۔ ایسے لوگ اگر ان سے یہ بات بتاتے کہ فلاں یا فلاں کو آپ سے شکایت ہے یا وہ یہ کہہ رہا تھا تو اوّل تو سیدین صاحب یقین نہ کرتے اور الٹا کہنے والے سے بحث کرکے یہ ثابت کرتے کہ خود اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا پھر بعض وقت خود اپنے کانوں سے سن لیتے تب بھی دکھ ضرور ہوتا، مگر وہ اسے کبھی ظاہر نہ کرتے۔ انہیں دکھ اس کا ہوتا تھا کہ کوئی شخص کیوں ایسی چھوٹی اور گھٹیا بات کرتا ہے۔ اس کا نہیں کہ انہیں بُرا کہتا ہے اور ان کے برتاؤ میں تو کبھی فرق آ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ایسے نکتہ چینوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اور ان کے مداح بے گنتی ہیں۔ ان کے خُلق کو ایک صاف شفاف نرم رو، میٹھے چشمے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس سے ہر پیاسا سیراب ہو سکتا تھا۔ عجب مقناطیسی کشش تھی کہ جو کسی طرح ایک بار قریب پہنچ جائے وہ ان کی طرف کھنچتا ہی چلا جاتا تھا۔ ان کے فیض سے جو اپنوں سے شروع ہوا تھا نہ جانے کتنے غیروں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ صرف ان کی دنیوی دولت ہی سے نہیں بلکہ ذہنی، اخلاقی، علمی، ادبی، دینداری کی دولت سے بھی جو وہ غیر محسوس

طور پر ہر جاننے والے پر لٹاتے رہتے تھے۔

ماں سے ان کو جو محبت تھی اس کا ذکر کر چکی ہوں۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں، جن میں نانا، چچا، پھوپیاں، خالائیں، چچی اور دوسرے بہت سے عزیز شامل تھے، ان سب کی وہ بہت عزت اور بڑا خیال کرتے تھے۔ اور اپنے بھائی اور بہنوں کو تو انھوں نے کیا کچھ نہیں دیا۔ باپ کی شفقت اور سرپرستی، بھائی کا پیار، ماں کے بعد ماں کی سی محبت سے اس طرح مالا مال کر دیا کہ احساسِ بدنصیبی اور محرومی ان کے دل سے محو ہو گیا۔ بڑی باجی جب تک اپنے گھر پرشاد آباد رہیں وہ ان کو اور ان کے شوہر سید محمد مستحسن زیدی کو محبت و احترام کا نذرانہ پیش کرتے رہے جب اچانک بھائی صاحب جوانی ہی میں چل بسے تو یہ حادثہ پورے خاندان کے لئے بڑا سخت تھا۔ خود سیدین صاحب کے لئے بھی جوان کو اپنے سگے بڑے بھائی کی جگہ سمجھتے تھے۔ مگر انھوں نے اس صدمے کو بھی خاموشی کے ساتھ جھیل لیا۔ اور باجی اور ان کی بچیوں کو جن پر یہ پہاڑ ٹوٹا تھا دلاسا اور سہارا دیا۔ بھانجیوں کی تعلیم میں کوشاں رہے۔ اور ان کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ وہ ان کو اولاد کی طرح چاہتے تھے، بڑی بھانجی صابرہ کو، جو ذہانت، قابلیت، شرافت نفس اور مزاج کی نرمی اور دردِ دل کی دولت سے انھیں کی طرح مالا مال تھی وہ حد سے زیادہ چاہتے تھے۔ اس سے ان کو ذہنی رفاقت اور دوستی بھی ملتی تھی۔ باجی کا وہ اس قدر احترام کرتے تھے جیسے ماں کا حالانکہ دونوں کی عمر میں چند سال ہی کا فرق تھا اسی طرح چھوٹے بھائی[1] جان بھی باجی کے ساتھ بڑے ادب و احترام سے پیش آتے

---

[1] خواجہ اظہر عباس

تھے۔ میں اور خود باجی کی لڑکیاں ان سے زیادہ بے تکلف اور ان کی جناب میں قدرے گستاخ تھیں۔ چھوٹی باجی سے بھائی جان کو جو محبت تھی میں نے پہلے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ سیدہ کی تعلیم کی انھیں بہت فکر تھی۔ پانی پت میں اس وقت کوئی مسلمان لڑکیوں کا اسکول نہ تھا اور کسی ہندوؤں یا عیسائیوں کے لڑکیوں کے مدرسے میں بھلا ہمارے خاندان کی لڑکیاں کیسے جا سکتی تھیں؛ خاص طور پر میری منجھلی پھوپی اماں اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔ دونوں چچا جنھوں نے بڑی باجی کو اردو، فارسی اور عربی پڑھائی تھی اب پانی پت سے باہر رہتے تھے۔ لیکن بھائی جان ہر ممکن کوشش کرتے رہے کہ سیدہ کی تعلیم جاری رہے۔ جب چھٹیوں میں آتے تو انھیں خود پڑھاتے، علی گڑھ سے عمدہ عمدہ کتابیں بھیجتے۔ نئی کتابیں جو نکلتی تھیں ان میں سے جو مفید سمجھتے وہ خرید کر تحفے میں دیتے۔ رسالے ان کے نام جاری کراتے، انگریزی کی آسان کتابیں لا کر دیتے۔ اور ڈکشنری کی مدد سے پڑھنا سکھلاتے۔ وہ مرحومہ خود پڑھنے لکھنے کی بہت شوقین تھیں۔ اردو بہت اچھی جانتی تھیں۔ فارسی میں بھی اچھی دستگاہ رکھتی تھیں۔ انگریزی بھی خاصی پڑھ لیتی تھیں۔ انھوں نے فارسی کی ایک کتاب دوستداران بشر کا ترجمہ "خادمانِ خلق" کے نام سے کیا تھا۔ جو ان کے انتقال کے بعد بھائی جان کی خواہش پر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ ان کی یہ واحد نشانی ہمارے پاس رہ گئی۔ علی گڑھ میں جب وہ جا کر رہیں تو یہ دوستی اور محبت اور گہری ہوئی اور ان کی علمی قابلیت بڑھانے میں سیدین صاحب نے اور زیادہ کوشش کی۔ بڑی چھان بین اور تلاش کے بعد ان کی نسبت اپنے عزیز دوست بشیر حسین زیدی سے کی اور اس سلسلہ میں خاندان کے بہت سے لوگوں کی

ناراضگی کی بھی پروا نہ کی۔ لیکن اماں کے آٹھ مہینے کے بعد وہ بھی خدا کو پیاری ہوگئیں اور یہ کلی پھول نہ بن سکی۔ ان کی ادبی اور ذہنی صلاحیتیں دنیا کے سامنے نہ آسکیں۔

چھوٹے بھائی اور بہن کو چاہتے تو وہ بچپن ہی سے تھے۔ لیکن جب تک اماں اور چھوٹی باجی زندہ رہیں ہم لوگ ان دونوں سے زیادہ قریب اور مانوس تھے۔ بھائی جان ہمارے ہیرو تھے۔ اور ہم دور سے گویا ان کی پرستش کرتے تھے۔ مگر ایسا لگتا کہ ہمارا ان تک پہنچنا (یعنی ان سے بے تکلف ہونا) ایسا ہے جیسے آدم خاکی کا چاند تک پہنچنا۔ لیکن جب کم عمری میں ہم ماں اور پھر بہن کے پیار سے محروم ہوگئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس ساری کائنات میں ہم تنہا ہیں۔ اس وقت غیر محسوس طور پر ہم بھائی جان سے اور بھائی جان ہم سے قریب — اور قریب آتے گئے۔

چھوٹے بھائی جان طبیعتاً بہت شرمیلے تھے۔ بھائی جان کا بہت ادب کرتے تھے اور ان سے زیادہ بے تکلف نہ تھے۔ مگر ان کو اس قدر چاہتے اور ان کی اتنی قدر و عزّت کرتے تھے کہ سعادت بیٹا باپ کی بھی اس سے زیادہ کیا کرسکے گا۔ ہمیشہ ان کے آرام کی فکر رکھتے۔ ان کا ہر کام دلی خوشی کے ساتھ کرتے، ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی پر خوش ہوتے۔ ان کی قابلیت اور ذہانت ان کی علمی اور تعلیمی خدمات پر سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ دنیا میں شاید ہی کسی چھوٹے بھائی نے جو بڑے بھائی سے تعلیم، شہرت، دولت اور دنیاوی حیثیت میں کم ہو، اسے خلوص دل سے اتنا چاہا ہوگا، اس پر اس طرح جان چھڑکی ہوگی جیسے سید ین کے چھوٹے بھائی نے۔ ساتھ ہی بھاوج سے بھی انہیں بڑی محبت تھی اور دوستی اور بے تکلفی بھی۔ بھائی بھاوج

دونوں اس چھوٹے بھائی کو (جو بھائی سے سات سال چھوٹا اور بھاوج سے چند ماہ بڑا تھا) بیٹے کی جگہ سمجھتے تھے۔ جب سیدین صاحب علی گڑھ آ گئے تو بھائی کو پانی پت سے بُلا کر کالج میں داخل کرایا۔ وہاں انھوں نے بی۔ اے۔ تک تعلیم پائی۔ ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ دلوایا۔ مگر اظہر عباس کو وکالت کا شوق نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بھائی کی اجازت اور مدد سے حالی پبلشنگ ہاؤس قائم کیا جو اس وقت بڑا معیاری نشری ادارہ سمجھا جاتا تھا اس نے حالی کی کئی تصانیف اعلیٰ پیمانے پر شائع کیں۔ خاص طور پر "مسدس حالی" کا صدی ایڈیشن جو حُسن ظاہری میں بھی بے مثال تھا۔ سیدین صاحب نے بھائی کی شادی بڑے حوصلے اور شوق سے اسی طرح کی جیسے بیٹوں کی کی جاتی ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی احمد فاطمہ کو بھی بہت چاہتے تھے جو انکی چچازاد بہن بھی تھیں اور پیاری بھاوج بھی۔

رہی چھوٹی بہن تو پہلے تو اسے وہ بچی ہی سمجھتے رہے۔ ویسے اس کی تعلیم کی فکر رہتی تھی۔ اظہر اور سیدہ پر تاکید رکھتے کہ مصداق کو پڑھایا کریں انگلستان سے واپس آئے اور یہ معلوم ہوا کہ اسے لکھنے کا شوق ہے تو اپنے مخصوص انداز میں ہمت افزائی کی۔ پریم چند اور دوسرے اچھے مصنفوں کی کتابیں منگا کر دیں۔ کہانیاں سناتے۔ ادھوری کہانیاں سنا کر انہیں پورا کرنے کی فرمائش کرتے۔ انگریزی کی سادی سادی کہانیاں اور ناولوں کے خلاصے سناتے اور اس کی تحریروں پر اصلاح دیتے۔ کچھ عرصے بعد زنانہ رسالوں میں کہانیاں بھیجنے پر اکسایا۔ اور اس طرح اسکے ادبی ذوق کی تربیت انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ علی گڑھ میں ملازم ہونے کے بعد سب کو پاس بلا کر رکھا تو اسے گرلز اسکول میں داخلہ دلایا...

جو اگرچہ بہت چھوٹی کلاس میں ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہاں پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جاتی تھی اور اسے انگریزی برائے نام آتی تھی۔ انھوں نے بہن کو بددل نہیں ہونے دیا۔ حساب اور اردو میں اسے بہت اچھے نمبر ملتے تو اس کی بڑی تعریف اور ہمت افزائی کرتے۔ دوسرے لوگ جن میں ہم عمر بھائی بہن پیش پیش تھے۔ اس کی افسانہ نگاری کا مذاق اڑاتے تھے۔ مذاق سیدین صاحب بھی اڑاتے تھے مگر کس قدر مختلف تھا چھیڑنے اور بنانے کا یہ انداز جو اسکے شوق کے لئے مہمیز کا کام کرتا تھا لیکن چھوٹی بہن کی طرف دوستی کا پہلا ہاتھ انھوں نے والدہ کے انتقال کے بعد بڑھایا۔

اماں کے انتقال نے مجھے بالکل توڑ دیا تھا۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں ان سے بہت زیادہ مانوس تھی اور وہ بھی مجھے بچی سمجھتی تھیں۔ والدہ کے انتقال کے کچھ عرصے بعد سیدین صاحب واپس علی گڑھ گئے تو اگلے دن ہی مجھے ان کا ایک لمبا سا خط ملا جو ۲۰ ستمبر ۲۸ء کا لکھا ہوا ہے اسکا کچھ حصہ نیچے درج کرتی ہوں۔

مصداق پیاری دعائیں!

مجھے فوراً لکھو تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ اور کچھ دل لگا یا نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنی مرضی کے خلاف یہاں پر رہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہاں بہنوں وغیرہ کے ہونے سے چند دن میں کچھ طبیعت بہل جائے گی۔ اب تم کو دل اور مضبوط کرنا چاہئے۔ مشاغل اور انہماک اور کام کاج میں توجہ کو بٹانا چاہئے۔ ہماری اماں کی روح ہر وقت ہمارے ساتھ موجود ہے۔ اور ہماری خوشیوں اور غموں اور تفکرات میں شریک

ہے۔ اب ہم کو ہر کام اس خیال سے کرنا چاہئے کہ ان کی روح جیسے جنّت میں اور ہر طرح کا آرام حاصل ہے، ہمارے ضرورت سے زیادہ رنج یا ہمارے کسی کام کی وجہ سے افسردہ نہ ہو۔ تمھیں اللہ میاں نے بہت اچھی عقل اور سمجھ دی ہے اس کا استعمال کرکے اور اپنے بزرگوں اور پیشواؤں کے نمونے کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی اور عمل سے ایسا نمونہ قائم کرو کہ بالکل فخر بھائی بہن ہو جاؤ۔..... میرا دل ہر وقت تم میں پڑا رہتا ہے۔ لیکن یہ تقویت ہے کہ تم "زنانہ وار" (مردانہ وار ہی کیوں کہا جائے؟) اپنی موجودہ پوزیشن کے نازک فرائض ادا کروگی۔ اباجی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ تمھارے پڑھنے کے لئے کتابیں منگا دیا کریں — تم یاددہانی کرا دینا۔

تمھارا بھائی سیّدین

چودہ برس کی غم سے چور لڑکی کو تسلی دینے اور حوصلہ بندھانے کا کتنا پیارا، فطری اور بے ساختہ انداز تھا یہ جس نے زخم پر مرہم کا کام کیا۔ پھر بھائی بہن کی یہ دوستی بڑھتی گئی..... اور جب آٹھ مہینے کے بعد منجھلی بہن بھی خدا کو پیاری ہو گئیں جنھوں نے اس عرصے میں چھوٹے بھائی بہن کو ماں کا سا پیار اور حفاظت کا احساس دیا تھا تو باوجود غم کی انتہائی شدّت کے سیدین صاحب چھوٹے بھائی بہن کی دلداری اور دل جوئی میں اور زیادہ لگ گئے۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں ان کی شادی ہو گئی تو ان کی دُلھن نے بھی ان دونوں کو ماں کی سی محبت دینے کی کوشش کی۔ ان کو نند اور دیور کی شادی کا بڑا شوق تھا اور شوہر کو بھی اس پر اکساتی

رہتی تھیں کہ ان دونوں کی شادی جلد ہونی چاہیئے۔ بہن کے لئے کئی پیغام آئے۔ جن میں سیدین صاحب کی نظر انتخاب اپنے عزیز دوست پر پڑی جن کی وہ بہت قدر و عزت کرتے تھے۔ وہ بہن کے مزاج اور خیالات سے واقف تھے۔ اور شاید خود اس سے بھی زیادہ، اس کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے لئے اعلیٰ ذہن اور کردار کا ساتھی چاہیئے، خواہ مالِ دنیا... کے لحاظ سے وہ کتنا ہی کم حیثیت ہو۔ اور کیسی ہی کٹھن زندگی بسر کرتا ہو بڑے شوق اور حوصلہ اور خوشی کے ساتھ انھوں نے چھوٹی بہن کی شادی اس طرح کی جیسے وہ اپنی سب سے بڑی بیٹی کو بیاہ رہے ہیں۔ رخصتی کے وقت انھوں نے ایک بیحد مختصر خط اپنے دوست کو لکھا۔ دیکھئے کیا دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد اس سے زیادہ کچھ کہا جا سکتا ہے؟

"۷ر اپریل

برادرم عابد صاحب — تسلیم

لکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ اور بہت کچھ دل چاہتا ہے لیکن سوائے اس کے اس وقت اور کچھ نہیں لکھ سکتا کہ:-

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

میری بہن میری طرح بہت بے وقوف اور حساس ہے اس کو آپ کے اور خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

آپ کا

سیدین

نو دس مہینے بعد بہن جو بھائی کے گھر علی گڑھ آئی ہوئی تھی سخت

بیمار ہوگئیں۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ سیدین صاحب کی پریشانی کی حد نہ تھی۔ دوا علاج پر تو خیر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیا ہی مگر فکر اور تشویش کا یہ حال تھا کہ عزیزوں اور دوستوں سے دیکھا نہ جاتا۔ ان کے ایک رفیق کار نے اس زمانے میں عابد صاحب سے کہا۔ "سیدین بہن کی بیماری پر اتنا خرچ کر رہے ہیں اور اتنے سخت پریشان ہیں، ایسے بھائی دنیا میں کہاں ہوتے ہیں؟" یہی جملہ اٹھائیس برس بعد ڈاکٹر وگ[1] نے ان کے انتقال کے بعد میری حالت دیکھ کر کہا — "ان کی حالت جو بھی ہو ایسے بھائی کہاں ہوتے ہیں!" بیماری سے جب میں ذرا سنبھلی تو بیگم سیدین کی بھاوج نے ہنس ہنس کر مجھے سنایا۔ "جانتی ہو جب لیڈی ڈاکٹر نے تمھارے کمرے سے باہر نکل کر کہا کہ تمھارے بچنے کی امید بہت کم ہے تو سیدین پچھاڑ کھا کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔" بے ہوش تو وہ نہیں ہوئے تھے یہ ان کا مبالغہ تھا۔ مگر حالت کچھ ایسی تھی جسے مبالغہ آمیز لفظوں میں ہی بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس بیماری کا سلسلہ برسوں چلتا رہا اور سیدین صاحب محبت، دلداری، موقع پڑنے پر تیمارداری اور مدد کرتے رہے۔

جب تک وہ علی گڑھ میں رہے بہن کے پاس روز کا دن آنا جانا تھا پھر کشمیر، رامپور اور بمبئی چلے گئے۔ تو بہن بہنوئی مہینوں ان کے پاس جا کر رہتے، سیر و تفریح کرتے، آرام کرتے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا اپنا تخلیقی کام سکون و اطمینان سے کرتے رہتے۔ بہن کی ادبی صلاحیتوں کی قدر کرنے اور اس کی ہمت بڑھانے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ اسی کے ساتھ وہ اپنا یہ حق اور فرض سمجھتے تھے کہ اس کی چیزوں پر صحت مند تنقید کریں، اس کا مذاق

---

[1] ڈاکٹر کے۔ ایل۔ وگ سیدین صاحب کے معالج

اڑائیں، اس کو، MODESTY کی تعلیم دیں کہ وہ "ہمچو من دیگرے نیست" کے وہم میں مبتلا ہو کر جمود کا شکار نہ ہو جائے۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے۔ انھیں افسوس تھا کہ وہ اچھی انگلش نہیں جانتی۔ اس کی تلافی کے طور پر وہ انگلش کی عمدہ عمدہ کتابیں، ناول، افسانے، ڈرامے وغیرہ پڑھنے پر اسے اکساتے رہتے اس کمی کا جو اثر زندگی پر پڑنا تھا وہ تو پڑا۔ مگر ان کی اور اپنے شوہر کی رہنمائی اور ہمت افزائی نے اس کمی کو محرومی کا داغ بننے نہیں دیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ دونوں بھائی بہنوں کی دوستی اور زیادہ پائیدار ہوتی گئی۔ مشترکہ صدموں نے اس دوستی کی جڑیں اور گہرائی تک پہنچا دی تھیں۔ ویسے بعض باتوں میں دونوں میں اختلاف بھی ہوتا۔ بعض معاملوں میں ان کے اصول الگ الگ تھے۔ بعض ہستیوں کے بارے میں وہ ہم رائے نہ تھے۔ لیکن مذہبی قدروں اور اخلاقی اصولوں پر دونوں کا یکساں عقیدہ تھا۔ کس بھائی نے بہن کو اتنا چاہا ہوگا؟ کس بہن نے اپنے بھائی سے اتنا پایا ہوگا؟ میں نہیں جانتی!

یہ حصہ کچھ طویل ہو گیا۔ مگر میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ انھوں نے اپنے بھائی بہنوں، اپنی بیٹیوں اور دوسرے عزیزوں کو کیا کچھ دیا۔ اور اس کے لئے میں نے اپنے ساتھ ان کے حسن سلوک کو نمونے کے طور پر پیش کر دیا۔ اس میں اگر خود ستائی کا کوئی پہلو نکلے تو مجھے معاف کر دیا جائے، مجھے ان کی شخصیت کا یہ رخ دکھانا ہے، اپنی ستائش منظور نہیں۔

ان کی محبت اور خلوص میں اپنے بھائی بہن کے ساتھ ساتھ رشتے کے بہن بھائیوں، ہم وطن نوجوانوں دوستوں کے بھائیوں (اور بعد میں ان کے بچوں) سبھی نے اپنا اپنا قیمتی حصہ پایا ہے، جس میں جتنی صلاحیت تھی اتنا۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کے گھر کے ایک بڑے سے کمرے نے چھوٹے سے

بورڈنگ ہاؤس کی شکل اختیار کرلی تھی جس میں رشتے کے بھائیوں کے علاوہ ایک دو غریب ہم وطن اور دوستوں کے ایک دو بھائی وغیرہ رہتے تھے وہیں کھانا کھاتے تھے اور گھر کے فرد سمجھے جاتے تھے۔ برسوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ طالب علم بدلتے رہے "بورڈنگ ہاؤس" قائم رہا۔

رشتے کی بہنوں سے بھی انھیں بہت پیار تھا اور انھیں اپنی سگی بہنوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جب کبھی خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کا ذکر چھڑتا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے "توبہ — وہ تو میری بہن ہے"! یہ سب بہنیں، میرے دونوں بھائیوں کو بہت چاہتی تھیں۔ ان میں کئی تو ایسی تھیں جن کے خود اپنا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔ اور وہ سیدین صاحب اظہر عباس اور احمد عباس کو سگا بھائی سمجھتی تھیں۔ ان بہنوں میں سیدین صاحب کو سب سے زیادہ الفت مجّی (بیگم احمد عباس) سے تھی۔ اس کی غیر معمولی صفات، اس کی ذہانت، قابلیت، خدمت کے بے پناہ جذبے، انسانیت کے درد اور سب سے محبت کرنے کے جذبات کی سیدین صاحب کے دل میں بے حد قدر تھی۔ وہ اس کی صفات کو اُبھارتے اور رما سب تعریف کرکے دل بڑھاتے رہتے۔ خود مجی ان سے سگے بھائیوں جیسی محبت کرتی بلکہ اپنا گرو اور ہیرو مانتی تھی۔ لیکن یہ حسین شخصیت جوانی میں دل کی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ اور کئی سال صبر اور حوصلے سے اس آزمائش کو جھیلا۔ وفات سے چند دن پہلے دل کا کامیاب اپریشن بھی ہوا۔ مگر پھر ایک دن اچانک خدا کو پیاری ہوگئی۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی میں تھی۔ دوسرے سب عزیز دہلی اور علی گڑھ میں۔ اور سیدین صاحب یونسکو کی کسی میٹنگ میں پیرس گئے ہوئے تھے۔ خاندان والوں پر جو گزرنا تھی گزری۔ مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ سیدین صاحب اس حادثہ کو کیسے سہاریں گے۔

سیدین صاحب اپنی اس ہونہار بہن کو کتنا چاہتے تھے۔ کس قدر اسکی صفات سے متاثر تھے اس کا انداز یہ خط پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ جو انھوں نے خاندان والوں کے نام مشترک لکھا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ تسلی دینے کا کیسا نرالا انداز ہے۔ اور اچھی زندگی سے کچھ سیکھنے کا کتنا دلکش درس ہے:۔

"۲-۹-۵۹

میرے پیارو

میں کیا خط لکھنا چاہ رہا تھا اور کیا خط لکھ رہا ہوں۔ اپنی بدقسمتی اور محرومی پر یقین نہیں آتا۔ آپریشن کامیاب ہو جانے کے بعد تو کبھی اس طرف ذہن گیا ہی نہ تھا کہ یہ چراغ بجھ جائے گا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ـــ اس وقت کیا لکھوں، کچھ لکھتے بن نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ہزاروں یادیں اور تصویریں ذہن میں آرہی ہیں۔ اور ان سب میں اس پیاری بہن کی محبت کی چاشنی بھری ہوئی ہے جس نے ایک کمزور جسم اور ناسازگار حالات میں اپنے اندر ایک ایسی قندیل روشن کی تھی جس کی کچھ نہ کچھ روشنی ان سب پر پڑی جن کے راستے سے وہ گذری ....

.... ماں کا سایۂ عاطفت چند سال ہی میں اٹھ گیا۔ باپ پوری توجہ اور نگرانی نہیں دے سکے۔ ابتدائی زندگی ہی میں ذمہ داری کا بوجھ پڑا۔ مالی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ صحت ٹھیک نہیں رہی۔ بے شک اس سے خیال ہوتا ہے کہ اسے زندگی کی ظاہری نعمتوں میں سے (صحت، فراغت، حسب منشا

کام) بہت کچھ نہیں ملا۔ لیکن جو ملا وہ ہم میں سے اکثر کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابل رشک ہے۔ ابتدائی زندگی کے حالات کی وجہ سے بہت ممکن تھا کہ اس میں ترشی، مردم بیزاری خود کے ساتھ کمزوروں کی سی ہمدردی اور رحم کا جذبہ پیدا ہو جاتا...... لیکن مجیؔ نے باوجود ان تمام باتوں کے ایک ایسی حسین سیرت تعمیر کی، جیسی خاندان بھر میں کیا، دور دور ملنا مشکل ہے۔ پھر زندگی میں اس نے کیا کیا نہیں پایا؟ بے شمار لوگوں کی محبت، عزیزوں اور جاننے والوں کی خدمت کی سعادت۔ ایثار اور بے نفسی، جس نے دوسروں کے آرام اور خوشی کو اپنی خوشی اور آرام پر ترجیح دی، جس کی سیرت کا سونا تکلیفیں اٹھا کر بھی کندن بنتا گیا، جس نے اپنے خلوص اور محبت کی بدولت کتنوں کے دل میں گھر کیا۔ جس نے روس کے اور بمبئی کے ہسپتالوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ کس کس چیز کا ذکر کروں تیری، میری پیاری بہن! محروم اور بدنصیب تو ہم ہیں۔ جو شخص اپنا اتنا صاف، روشن بے لوث نقش اتنے دلوں میں پر چھوڑ جائے، اس نے تو زندگی کی سب سے بڑی نعمت پالی۔ اور ہم بھی محروم نہیں ہیں۔ جن کے دلوں میں اتنا قیمتی خزانہ ہو وہ خوش نصیب ہیں، بشرطیکہ وہ اس کی قدر کر سکیں۔ بشرطیکہ اس کی مدد سے اپنی تنگیوں اور خود غرضیوں کا علاج کر سکیں۔ غم کی دولت بہت ہمت چاہتی ہے، اس کا اٹھانا آسان نہیں۔ لیکن وہ اتنی قیمتی ہے کہ وہ آنسوؤں میں

نہیں بہائی جا سکتی۔ آنسو تو خیر بہیں گے، دل کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ لیکن وہ کافی نہیں۔ دل میں اس حادثہ سے جو گداز پیدا ہو اس کو مشعل بنا سکیں۔ اور زندگی میں برت سکیں جب بات ہے۔ یہ ذرا دور کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن مجی کا ماتم میں اسی طرح کر سکتا ہوں۔ اس کی زندگی کی شمع یہی راستہ دکھاتی ہے۔

میری عزیز، اور بچیوں اور عزیزوں! میری طرف سے فکر نہ کرو۔ سخت جان ہوں، یہ بھی جھیل لوں گا۔ اور یوں بھی ہر شخص وقت کے ہاتھوں رہن ہے۔ مجی کی یاد ہر وقت آئے گی لیکن اس کے درد کا سرمایہ ضائع نہیں کروں گا۔ اشکے کہ زدل خیزد و در دیدہ شکستم من۔ اس وقت اور خط لکھنے کا یارا نہیں۔ یہی خط اور عزیزوں کو دہلی اور علی گڑھ میں دکھا دینا۔ زہرا کا جو حال ہے اس کا تم اندازہ کر سکتی ہو باچھو[1] کو کیسے خط لکھوں اور کہاں لکھوں وہ تو بے حد صابر باپ کا بیٹا ہے۔ اس سے کیا کہوں وہ تو خود ہمیں ہمت اور صبر دکھائے گا۔ معلوم نہیں باچھو بمبئی میں ہے یا دہلی۔ اس کے نام کا خط ملفوف ہے۔ مہربانی کر کے اگر وہ بمبئی میں ہو تو فوراً وہاں بھیج دو۔ چند روز بعد اسے مفصل خط لکھوں گا۔

تمہارا غم نصیب سیدین

---

[1] خواجہ احمد عباس کا لقب

ایسے غم میں اس طرح صبر کرنے والے اور اس طرح دوسروں کو دلاسا دینے والے دنیا میں کتنے ہیں؟

سیدین صاحب کی بہنیں صرف ان کے خاندان ہی میں نہیں ہندوستان پاکستان کے علاوہ دنیا کے اور کئی ملکوں میں بھی موجود ہیں۔ جس کو ایک بار انھوں نے بہن کہہ دیا وہ عمر بھر کے لئے ان کی ہو جاتی اور وہ اس کے ہو جاتے۔ انگلستان میں ۲۳ء یا ۲۴ء میں انھوں نے مارگریٹ سے یہ پاک رشتہ جوڑا تھا جو آخر تک قائم رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ جب وہ انگلستان جاتے وہ ان سے ملنے آتی یا اپنے شہر بلاتی، اپنے شوہر اور بچوں سے ملاتی تھی۔ "ہوائی" میں ایک بہن "نانا" ہے، جو اب پاکستان میں ہے۔ امریکہ میں کئی بہنیں ہیں۔ ایک بہن اُمّتل ہیں۔ جو ان کے محترم بزرگ دوست سید راس مسعود کی رفیق حیات تھیں۔ اس وقت وہ ان کی آپا بنی تھیں۔ اور اسی رشتے کو جس خلوص، گہرائی اور پیار سے ان دونوں نے لگ بھگ چالیس برس نبھایا۔ اس کی مثال تو دنیا میں سگے بھائی بہن میں بھی کم ہی ملتی ہے۔ ایک بہن "زرینہ کریم بھائی" بمبئی میں ہیں۔ جو بیان کی شیرینی، مزاج کی نرمی، خلوص اور محبت صبر و برداشت میں بہت کچھ سیدین صاحب سے مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی کتنی قدر کرتے تھے اس کا بیان کرنا آسان نہیں۔ ان کی ایک سکھ بہن سردار مہندر سنگھ کی بیوی سرجیت جموں میں ہیں۔ جب ملتی تھیں مجھ سے کہتیں "بہن میرے بھائی کی صحت کا خیال کیجئے۔ میں ان کی طرف سے بہت پریشان رہتی ہوں!" ایک بہن راج پوپلے ہے جو گذشتہ چھبیس برس یا ستائیس برس سے ان کے راکھی باندھتی تھی۔ "بھائی جان" کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھی۔

دونوں اس بندھن کو جس پریم اور شردھا کے ساتھ نباہتے تھے جس طرح اس کے سارے آداب پورے کئے جاتے تھے۔ جس پیار سے وہ اسے ساڑھی یا روپے دیتے تھے۔ جس محبت اور اپنائیت سے وہ ان کے ٹیکہ لگا کر، آرتی اتارتی اور راکھی باندھتی تھی ــــ کیا ہندو بہن بھائی..... اس سے بڑھ کر کریں گے؟ ایک بہن کنو ہے جسے انھوں نے مجی کی وساطت سے جانا اور بہت محبت کی ایک رضیہ سجاد ظہیر ہے۔ جس کے والد سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ اور کوئی چالیس سال سے وہ اسے بہن سمجھتے تھے۔ اس کے سارے بھائی پاکستان جا بسے ہیں، اور وہ کہا کرتی تھی " ہندوستان میں تو بس اب میرے ایک ہی بھائی رہ گئے ہیں۔ بھائی جان " یعنی سیدین صاحب۔ ان کی کہانیاں وہ بڑے شوق سے سنتے تعریف کرتے، اب وہ کہتی ہے "مصداق اب او کھلے آنے کو جی نہیں چاہتا ــــ بھائی جان کے بغیر!"

یہ فہرست بڑی طویل ہے ــــ اس میں ان کے دوستوں کی بیویاں بھی شامل ہیں جن کو کہتے بھابی اور سمجھتے بہن تھے۔ یہ رشتہ ان کو کتنا پیارا، کیسا مقدس لگتا تھا، یہ کوئی ان بہنوں کے دل سے پوچھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل میں عورت کا اتنا احترام اور اس سے ایسی پاک محبت تھی جس کی مثال حقیقی زندگی میں، ادب اور شاعری میں بھی نایاب نہیں تو بے حد کمیاب ضرور ہے۔ ہاں ان کے نانا حالی کے کلام میں اس کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ عورت جو ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، دوست ہے۔ ہر روپ میں ان کے دل میں اونچے سنگھاسن پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ سیدین صاحب بڑے ظریف آدمی تھے اور ان کے

مزاح کا نشانہ بننے سے کوئی بچ نہ سکتا تھا۔ مگر ہنسی مذاق میں بھی وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس سے عورت کی تحقیر یا کمتری کا کوئی پہلو نکلے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ کرشمہ تھا اس پائیدار اثر کا جو ان پر اپنی ماں کی شخصیت کا پڑا تھا۔ ایک مرد کے ذہن میں عورت کا جو تصور بنتا ہے اس میں بہت کچھ اس کی ماں کی سیرت جھلکتی ہے۔

بچوں خصوصاً لڑکیوں سے گہری محبت سیدین صاحب کی خاندانی خصوصیت ہے۔ ان کے پرنانا، نانا، باپ، چچا، سبھی کا یہ حال تھا کہ بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کو چاہتے تھے۔ ہمارے گھرانے کی بیبیاں فخر و مسرت کے ساتھ بچوں سے کہا کرتی تھیں "تمھاری ماں اصل میں ہم نہیں بلکہ تمھارے باپ ہیں" سیدین صاحب کے کوئی لڑکا نہیں تھا، جس کا ان کی بیوی کو بہت قلق تھا۔ مگر وہ خود اپنی ہر لڑکی کو سات بیٹوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب کشمیر میں ان کی چھوٹی بچی سیدہ پیدا ہوئی تو بعض لوگوں نے آکر باقاعدہ افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت سیدین صاحب کے چہرے پر غصے اور ہنسی کی ملی جلی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ بچوں سے ان کو جو محبت تھی اس کو صرف ممتا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس دل میں ماں کی محبت کی ساری گرمی اور نرمی سموئی ہوئی تھی۔ اپنی چاروں بیٹیوں کو وہ کس قدر چاہتے تھے۔ ان کی تربیت کی کیسی فکر تھی۔ ذہنی نشوونما کے لئے کیا کچھ کرتے تھے۔ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی کیسی لگن تھی وہ کس کس طرح ان کی صلاحیتوں کو ابھارتے اور کمزوریوں کو دور کرکے ان کو دنیا میں کچھ بننے اور کچھ کرنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان سے کتنی بے تکلفی سے پیش آتے، کیسی دوستی رکھتے، اس کا بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

یہ کہانی تو ان کی کوئی لڑکی ہی سنا سکتی ہے۔ وہ زبان سے یا رسمی انداز میں اظہارِ محبت کم کرتے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں، ان کا چہرہ، ان کی باتیں، ان کا رواں رواں اس محبت کا ترجمان تھا۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنی لڑکیوں کی خوبیوں اور قابلیت اور صلاحیتوں کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ یہ بھی ان کی تربیت کا ایک انداز تھا۔ اس میں ذرا سا طنز، ہلکی سی ظرافت، تھوڑی سی چھیڑ کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ اور یہ انداز صرف اپنی بیٹیوں ہی کے لئے نہیں ہر اس لڑکی اور لڑکے کے لئے تھا جس کو وہ دل سے عزیز رکھتے تھے ان کی تمنا تھی کہ ان کی لڑکیاں سیرت، اخلاق، ذہنی اور دماغی قابلیت میں ان کی سچی جانشین بنیں۔ اسی لئے انتہائی محبت کے باوجود وہ ضرورت کے وقت چشم نمائی اور تنبیہ کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ ایک واقعہ میں کبھی نہ بھول سکی۔ اس وقت ہم سب کشمیر میں تھے۔ دونوں بڑی لڑکیاں سات آٹھ سال کی ہوں گی۔ بچیاں باغ میں کھیل رہی تھیں، کسی ملازم نے ٹوکا تو دونوں نے اسے جھڑک دیا بلکہ ایک نے تو اس کے ٹھوکر مار دی۔ شکایت بھابی جان تک پہنچی۔ انہیں بہت غصہ آیا اور بھائی جان سے کہا۔ میں نے کبھی بھائی جان کو اس قدر غصہ میں نہیں دیکھا تھا۔ ایک چھڑی سے انھوں نے لڑکیوں کی تھوڑی سی خبر لی۔ میں اور بھابی جان کانپ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ ذرا دیر بعد بھابی جان نے مجھے بلایا اور کمرے سے ملے ڈریسنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جھانکا —— ایک بکس پر بھائی جان بیٹھے تھے۔ دونوں لڑکیاں ان کے زانوؤں پر بیٹھی تھیں اور باپ کے گلے میں ان کی باہیں پڑی تھیں۔ اور تینوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ ان آنسوؤں کی قیمت کوئی کیا لگا سکتا ہے؟ وہ

اپنی لڑکیوں کے چاہنے والے باپ ہی نہ تھے، معلم، نقاد، مشیر، دوست سبھی کچھ تھے۔ خاص طور پر اپنی بڑی لڑکی زہرہ سے ان کی گہری دوستی اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اس کو نہ صرف چاہتے بہت تھے بلکہ اس کی خوبیوں کو جو یوں بھی کچھ کم نہیں اور بھی بڑھا چڑھا کر دیکھتے تھے۔ ان کے بعض چاہنے والوں کو اس سے شکایت بھی ہوتی کہ وہ زہرہ کی یا اپنی اور اولاد کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ سیدین صاحب کی تعریف اولاد کو بگاڑنے والی نہ تھی بلکہ اس سے خوب سے خوب تر بننے کی تربیت اور حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ مگر بات یہ تھی کہ خاندان کے سبھی افراد کے دل میں ان کی توجہ محبت اور تعریف کی تمنا تھی اور ایک کا دوسرے پر رشک کرنا قدرتی سی بات تھی ورنہ اپنی اولاد کو کون نہیں سراہتا اور سیدین صاحب کے برتاؤ میں تو تفریق و امتیاز کو بہت کم دخل تھا۔ وہ سبھی کو چاہتے اور سبھی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بھائی کے بچوں سے انہیں بہت الفت تھی۔ خاص کر اپنے بھتیجے انور عباس سے جو ان کے پورے خاندان میں اکلوتا لڑکا ہے۔ اور بہن کی بچیوں کو تو انھوں نے اپنی اولاد ہی کی طرح پالا تھا اور سمجھا تھا میری نند کی لڑکیوں کو، جو میری بیٹیوں کی طرح ہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے آخر زمانے میں میری سب سے چھوٹی لڑکی سے ان کی بڑی دوستی ہو گئی تھی اور وہ تو ان پر جان ہی وارتی تھی۔

سیدین صاحب میں یہ صفت تھی جو دنیا میں پہلے بھی کمیاب تھی اور اب تو نایاب ہی ہوتی جا رہی ہے کہ وہ انسانی شخصیت کا دل سے احترام کرتے تھے۔ خاص طور پر نوجوان نسل کی شخصیت کا جسے وہ آنیوالے زمانے کا معمار سمجھتے تھے۔ ہر لڑکا اور لڑکی جو ان سے ملنے آتا، وہ اس سے

دل چسپی لیتے، اس کے مذاق کی باتیں کرتے، اس کی جھجک دور کرنے کی کوشش کرتے۔ اور ذرا دیر میں اپنے سے بے تکلف بنا لیتے۔ نوجوانوں کی صلاحیتوں کو ابھارنا، ان کو مفید مشورے دینا، انہیں اچھی زندگی بسر کرنے کے گر سکھانا کام کی اہمیت اور عظمت کا احساس دلانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ خود رحمی، خود پرستی، دنیا سے بیزاری اور نا امیدی کی لعنتوں سے انھوں نے اپنے آپ کو پاک کر لیا تھا اور ہر ایک کو یہی سکھاتے تھے۔ عام طور پر یہ تربیت بغیر کسی شعوری کوشش کے ہوتی تھی جس طرح صاف ٹھنڈا میٹھا پانی پیاس بجھا دیتا ہے، سیدین صاحب کی قربت اور گفتگو یوں ہی ذہن اور روح کی پیاس بجھا کر اسے آسودگی بخشتی تھی۔ لوگ ان کے پاس سے اٹھتے تو وہ خود اپنی نظر میں کچھ اونچے اٹھ جاتے تھے۔ اپنی اہمیت اور عزت نفس کا ایک دل خوش کُن احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ یہ قیاسی باتیں نہیں۔ کتنے لوگوں نے خود مجھ سے یہ بات کہی کہ ہم ان کے پاس سے واپس آتے تو ایسا محسوس کرتے تھے۔ سیدین صاحب کے دوستوں میں ان کے کئی شاگرد اور نوجوان عقیدت مند بھی شامل ہیں۔ اپنے شاگردوں میں سے بہت سے لوگوں سے ان کے عمر بھر تعلقات رہے۔ جو زیادہ ہونہار، محنتی اور قابل ہوتا اس سے یہ محبت گہری اور دوستی پائیدار ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اپنے اس محترم استاد سے اتنا کچھ سیکھا اور پایا ہے۔ اور اسے زندگی میں برتا ہے، جس سے جانے کتنوں کی زندگیاں سنور گئیں۔ محبت اور عقیدت کی جو بے پایاں دولت ان سے سیدین صاحب کو ملی وہ صرف ایک سچے معلم کو نصیب ہو سکتی ہے۔

سیدین صاحب کے دوستوں کی تعداد کا پورا اندازہ تو خود مجھے

بھی نہیں۔ ہر ملک میں ان کے واقف کار ہیں اور ان میں سے بعض ان کے گہرے مخلص دوست ہیں۔ لڑکپن ہی سے باوجود شرمیلے اور کم آمیز ہونے کے ان کے کافی دوست بننے شروع ہو گئے تھے۔ جن میں ہم عمر عزیز اور کلاس فیلوز زیادہ تھے۔ ان میں پھوپھی زاد بھائی "خواجہ حبیب علی" اور ایک دوسرے کزن خواجہ سرور حسن سے ان کی بہت گہری دوستی اور دلی محبت تھی۔ ایک صاحب عثمان درزی جو پانی پت میں ٹیلر ماسٹر تھے اور کبھی بچپن میں حالی مسلم اسکول میں ان کے ساتھ پڑھا ہوگا، ان سے بھی وہ پرانی دوستی کے ناتے جھک کر ملتے تھے۔ اب وہ لاہور میں ہیں اور بڑے بڑے مکانوں اور اچھے بزنس کے مالک ہیں۔ کئی سال ہوئے سیدین صاحب عزیزوں سے ملنے پاکستان گئے تو عثمان صاحب نے بہت بڑی دعوت ان کے اعزاز میں کی اور بڑے خلوص سے اصرار کیا کہ آپ یہاں آجائیے۔ میرا ایک مکان آپ کے لئے حاضر ہے۔ وہ مسکرائے اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ میاں تمہارا مکان خدا تمہیں مبارک کرے۔ میں اپنا وطن کیسے چھوڑ سکتا ہوں! عمر کے ساتھ ساتھ سیدین صاحب کے دوستوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ کالج کے زمانے میں خواجہ منظور حسین سید محمود حسین، سید بشیرالدین وغیرہ سے گہری دوستی تھی۔ پھر ولایت میں یوں تو بہت سے دوست بنے۔ مگر دو دوست ایسے تھے جن سے دوستی بڑھ کر سگے بھائیوں کی محبت میں بدل گئی۔ ہمارے چچا خواجہ غلام السبطین مرحوم خوش ہو کر کہا کرتے تھے۔ "کون کہتا ہے کہ آج کے زمانے میں سچے اور مخلص دوست نہیں ملتے۔ سیدین کے دوستوں جیسے دوست تو ہم کو بھی نہیں ملے، کہاں ہوتے ہیں دنیا میں ذاکر صاحب، عابد صاحب

سید صاحب[1] اور زیدی صاحب[2] جیسے دوست ؟" واقعہ یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ خلوص اور بے لاگ محبت کے معجزے ہر دور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اصل میں سیدین صاحب کو اپنے سارے دوست سگے بھائی کی طرح پیارے تھے۔ اپنے سے بڑی عمر کے دوستوں کا احترام بھی بہت کرتے تھے۔ ہم عمروں سے خلوص اور محبت اور چھوٹوں پر شفقت ان کی زندگی کا دستورالعمل تھا۔ سر سید راس مسعود، سید سجاد حیدر یلدرم سید تحمل حسین وغیرہ بزرگ دوستوں میں تھے جو سیدین کو بے حد چاہتے اور بڑی قدر کرتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، سید بشیر حسین زیدی ان کے بے حد قریبی دوست اور ہمدم تھے۔ ان میں سے کسی دوستی کی عمر پچاس سال سے کم نہ ہوگی۔ ساتھ کام کرنے والوں میں سے بھی بعض سے دوستی ہو جاتی تھی۔ ہندوستان میں علی گڑھ، کشمیر، رام پور، بمبئی اور دلی میں اور باہر کے ملکوں میں بہت سے مقامات پر ان کے رفیق کار پھیلے ہوئے ہیں۔ سیدین صاحب ان کی عزت کرتے۔ ان کی فلاح و بہبود کی فکر رکھتے۔ ان کے برتاؤ میں افسری کا انداز نہیں تھا۔ کام خوب لیتے تھے۔ غلطی یا بے اصولی پر تنبیہہ بھی کرتے مگر اس میں تلخی یا حقارت نہ ہوتی۔ اگر کسی کو سختی سے ڈانٹنا پڑتا تو وہ بھی برا نہ مانتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اس خیر سگالی اور خلوص کو محسوس کر لیتا تھا۔ جو اس درشتگی کے پیچھے کارفرما ہوتا اور وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرتا۔ ان کے پی اے اور ٹائپسٹ اور چپراسی وغیرہ تو ان پر

---

[1] سید تحمل حسین مرحوم، استاد ٹریننگ کالج علی گڑھ

[2] سید بشیر حسین زیدی۔

جان ہی چھڑکتے تھے۔

ننھے بچوں سے انہیں غیر معمولی محبت تھی۔ ان کا ٹیگور کی طرح اس بات پر عقیدہ تھا کہ جو بچہ دنیا میں آتا ہے وہ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس محبت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ بیٹیوں سے بھی بڑھ کر اپنے نواسوں اور نواسی سے پیار تھا۔ جب منجھلی لڑکی ذکیہ کا پہلا بچہ نبی ہوا اور چند ماہ کے بعد بلقیس کی بچی سیما پیدا ہوئی تو نانی تو خیر حد سے زیادہ خوش تھیں ہی۔ مگر نانا کی مسرت کی بھی انتہا نہ تھی۔ ننھے بچوں سے مخاطب ہو کر دلچسپ باتیں کرنا (جو اکثر ان کے ماں باپ کو سنانی مقصود ہوتی تھیں) بچوں کو اپنی چائے میں سے چمچے بھر بھر کر پلانا، اپنے پاس لٹانا، ان کی طرف سے دوسروں کو خط لکھنا ان کی تصویروں پر ان کی طرف سے لکھ کر عزیزوں کو بھیجنا، ایسی باتیں بہت مرغوب تھیں۔

اگر کہیں ہندوستان سے باہر گئے ہوتے تو بڑوں کے ساتھ شیر خوار بچوں کو بھی خط لکھتے، ٹیپ پر باتیں ریکارڈ کر کے بھیجتے اور خود بچے کی غوں غاں ریکارڈ کرا کے منگاتے۔ جب بلقیس کا لڑکا سلمان عفران پیدا ہوا اس وقت سیدین صاحب ہوائی میں تھے۔ یہ خبر سن کر جو مسرت انہیں ہوئی۔ اس کا کچھ اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ننھے سلمان کو ٹیپ کر کے وہاں سے بھیجا تھا۔ ان کے کاغذات میں اس خط کا مسودہ مجھے ملا ہے۔ جو یہاں درج کرتی ہوں:-

" از ہونولولو (ہوائی)

پیارے سلمان

میں نے تمھیں عارضی طور پر یہ نام دیا ہے۔ جب تم خود اپنا نام بتا سکو گے تو اس کو بدل دیں گے.... سب سے پہلے تو میں تمھیں اس دنیا میں آنے کی مبارکباد دیتا ہوں اور الوہا کہتا ہوں جس کا مطلب یہاں کی زبان میں خوش آمدید ہے اور اگر "لو" کو ذرا کھینچ کر "آلوہا" کہیں تو اس کا مطلب ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمھیں ان دونوں معنوں میں الوہا کہتا ہوں۔ اور اس خدا سے جس نے ہمیں سب کو یہ نعمت دی ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمھیں اس زندگی میں جو تمھارے سامنے ہے، خوشی اور اطمینان بخشے، خوشی اور اطمینان جو اچھا کام کرنے سے، محبت کرنے سے اور دوسروں کی محبت جیتنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیوں تم سے محبت کرتا ہوں؟ بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! اس لئے کہ تم میری ایک پیاری بلکہ بہت سے پیاروں کے محبوب ہو۔ تم بلقیس اور غفران[1] کی زندگی میں ایک شمع بن کر آئے ہو (کم سے کم مجھے یہی امید ہے) اس لئے کہ تم سیما کے بھائی ہو جو مجھے بہت پیاری ہے۔ ذرا اس بات کا خیال

---

[1] بریگیڈیر محمد غفران

رکھنا کہ وہ تمھیں پیار تو بہت کرے گی لیکن اگر کبھی غصہ چڑھا تو ٹھوکے گی بھی خوب !..... لیکن تم کام درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات ، اس کی محبت اور غصہ دونوں کو پی جانا کہ اس میں بہت مزا ہے ۔ میں تم سے اس لئے محبت کرتا ہوں کہ تم اپنی ننّا کے پیارے ہو جن کو کئی سال تمھارا انتظار رہا ۔ اور اب جب کہ میرے اور تمھارے خدا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا ہے تو میں دونوں کی طرف سے اس محبت کا اظہار کرتا ہوں ۔ افسوس ہے کہ تم ان سے نہیں ملے ورنہ تمھیں معلوم ہوتا کہ وہ کس قدر اچھی اور چاہنے والی تھیں ۔ اس وقت وہ میری طرح تم سے دور نہ ہوتیں اور نہ خط لکھنے پر بس کرتیں بلکہ تمھارے پاس آتیں ۔ تمھیں سینے سے لگاتیں ۔ تمھاری ہر وقت بہت دیکھ بھال کرتیں ۔ تمھارے لئے کپڑے بناتیں اور بلقیس کو ایک طرف بٹھا دیتیں ۔ جس طرح انھوں نے تمھارے بھائی شاہد کی پیدائش پر کیا تھا ۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ سعادت تمھاری قسمت میں نہ تھی .... اب یہ محبت اور دلداری تمھیں ان کی پیاری بیٹیوں یعنی امّی اور خالاؤں کے واسطے سے نصیب ہو گی ۔ اور خدا کرے کہ ان کی محبت اور صحبت بھی تمھارے اندر وہی چراغ جلائے جو تمھاری ننّا جلانے کی کوشش کرتیں ۔

میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم ان کو سمجھ نہیں سکتے ۔ کیوں کہ تم ابھی میری زبان نہیں

بولتے اور میں تمھاری زبان نہیں سمجھتا۔ مگر کیا کروں؟ جب تک میری بولی بولنے اور اچھی طرح سمجھنے لگوگے میں موجود نہ ہوں گا۔ اس لئے سوچتا ہوں کچھ باتیں کہہ ہی ڈالوں۔ نہ سمجھوگے تو تمھارا کیا نقصان ہوگا۔؟

یہ دنیا جس میں تم نے اپنے پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے قدم رکھے ہیں۔ ایک عجیب وغریب، الجھی ہوئی اور بے ربط دنیا ہے، جہاں کے بیشتر بسنے والے ہر قسم کی بے ایمانیاں اور بے اصولیاں اور ظلم کرتے رہتے ہیں اور اس طرح انھوں نے خدا کی اس بستی کو شیطانوں کی بستی بنا دیا ہے ...... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک بڑی دلکش اور امید ابھارنے والی دنیا بھی ہے۔ اس میں ایسے مرد اور عورتیں پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں جن کو دیکھ کر یا ان کا حال سن کر یا پڑھ کر، جن کی خدمت کی تڑپ جس کی علم کی پیاس، جن کی فیاضی، جن کی خوبصورتی کا احساس، جن کی حق شناسی اور حق دوستی شیطان کو مایوس اور مردم بیزاروں کو حیران کر دیتی ہے۔ اس لئے جب بھی تمھارا جیسا کوئی پیارا بچہ جنم لیتا ہے تو اس دنیا کے بنانے والے کے من میں پھر آشا کے چراغ جل اٹھتے ہیں، پھر اسے امید ہوتی ہے کہ یہ بچہ میری امت میں شامل ہوگا اور بھٹک کر شیطان کی ٹولی میں نہیں پہنچ جائے گا۔ تو سلمان پیارے تو یہ دوراہہ .... ہر کسی کے سامنے ہوتا ہے۔ اور تمھارے سامنے بھی آئے گا میری دعا ہے کہ اس وقت تم مضبوطی اور جوش اور خوش دلی کے

ساتھ وہ راستہ اختیار کرو جسے صراط مستقیم کہا گیا ہے، ان سبھوں کا راستہ جن پر خدا نے اپنے انعاموں کی بارش کی ہے، وہ راستہ نہیں جن پر بہت سے مسافر بھٹک گئے اور خدا کی ناراضگی کا بوجھ ان کو اٹھانا پڑا۔ تمہارے لئے یہ راستہ اختیار کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ تمہاری امی میں یہ حوصلہ ہے کہ خدا کے حقوق ادا کریں، ان میں محبت اور ذہانت کا مادہ ہے، خود اعتمادی ہے، فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ تمہارے ابا میں دیانت داری ہے۔ اصول پرستی ہے، استقامت ہے خدمت کا مادہ ہے..... پھر تمہاری نہ امی ہیں۔ جن کو خدا نے بہت سی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے ان میں انسانیت ہے علم دوستی اور علم تشنگی ہے، سمجھ داری ہے، دل نوازی کا سلیقہ ہے...... اور تم اپنی ذکیہ امی کو بھی پہچاننے لگے ہو یا نہیں؟......... کیا پوچھا تم نے؟ ان میں کیا چیزیں ہیں؟ ان میں بھی محبت کا بڑا مادہ ہے، سوشل دل کشی ہے، مہمان نوازی ہے، وہ دلوں کو بہت جلد موہ لیتی ہیں۔ (سوائے تمہارے خالو جان کے کسی سے لڑتی جھگڑتی نہیں ہیں) سب بچوں کو (جواب تمہارے آنے کے بعد اپنے ہی گھر میں ماشاء اللہ پنجتن ہو گئے ہیں) بہت چاہتی ہیں اور انہیں — SPOIL کرتی ہیں۔ خوش سلیقہ اور خوش مذاق ہیں..... اول، اول کیا بتاؤں؟ اچھا تم اپنی تیسری امی "چھدیا"[1] کو پوچھ رہے

---

[1] سیدہ

ہو کہ اس کا میں نے ذکر نہیں کیا۔ اور کیا کہا تم نے ؛ تم اس سے خفا ہو کہ وہ تمھارے پاس نہیں آئی۔ میرے پیارے اس کا اس میں زیادہ قصور نہیں۔ وہ اتنی دور ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ! (تمھارے جیسے چھوٹے تو نہیں، لیکن تمھارے آبا سے زیادہ چھوٹے) مگر یقین جانو کہ وہ بھی تمھاری پیدائش کی خبر سے اس قدر خوش ہوئی، اس قدر خوش ہوئی جس کی حد نہیں۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ محبت کرتی ہے۔ (گو خط لکھ کر اس کا ثبوت نہیں دیتی۔ اور یہ اس کی انکساری کی دلیل ہے) باتیں ایسی بڑی بڑی اور پختہ کاری کے ساتھ کرتی ہے کہ چالیس سال کی معلوم ہوتی ہے۔ کام ایسے بھولے کہ چودہ سال کی۔ لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے...... تو یہ ہیں وہ لوگ جو تمھارے قریب ترین عزیز ہیں اور ان سے تم بہت سی اچھی باتیں سیکھ سکتے ہو۔ اور زندگی کے میدان میں ایک شریف اور خوبصورت اور خوش سیرت مجاہد کا کام کر سکتے ہو...... ان کے علاوہ تمھاری جامعہ والی ننا اور عابد صاحب ہیں اور علی گڑھ والی ننا اور ان کی بچیاں ہیں اور بمبئی والے عزیز ہیں اور تمھارے بڑے آبا[1] ہیں جو صحافی ہیں اور ننھی منی[2] ہیں (جنھوں نے تمھیں دھوکا دینے کے لئے یہ نام رکھ

---

[1] محمد سبحان صاحب

[2] برگیڈیر غفران کی بھانجیاں

لئے حالانکہ کچھ ایسی ننھی منی بھی نہیں) تم ان سب سے اور اپنے
بزرگوں کے حال سے اور دنیا کے اچھے اور بڑے آدمیوں کی
زندگی سے کیا کیا سبق نہیں لے سکتے ؟ چونکہ میں جانتا ہوں کہ میں
تمھیں ان میں سے چند لوگوں کے حالات بھی نہیں سُنا سکوں گا اس
لئے میں نے تمھاری خاطر ایک کتاب لکھ چھوڑی ہے جس کا نام
ہے "آندھی میں چراغ"۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بڑے ہو کر
اس کو پڑھو، اس لئے نہیں کہ میں نے لکھی ہے بلکہ اس لئے
کہ اس میں جن لوگوں کی سیرت میں نے بیان کی ہے ان کی
ذات میں بڑے حسین چراغ روشن تھے۔ وہ انسان دوست
تھے، ان میں علم کی لگن تھی یا محبت اور خدمت کی تڑپ
...... ان کے خزانے ان کے دل اور دماغ کے اندر تھے
ان کی زندگی میں جوت زیادہ تر وہیں سے آتی تھی۔ انھیں
ہر وقت روپے پیسے، جائیداد، قوت، رسوخ، اثر کی تلاش
نہیں رہتی تھی۔ ان کے دل کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے
رہتے تھے۔ میری آرزو ہے کہ تمھاری ذات میں ان قدروں
کا جلوہ ہو تاکہ شیطانوں کی دنیا کو خدا کی دنیا بنانے کے بڑے
کام میں تم بھی شریک ہو سکو۔ سلمان پیارے، میری کیا مجال
ہے کہ میں اپنی طرف سے کہہ سکوں۔ میرے پاس کیا رکھا
ہے .. اور میں نے کیا کیا ہے ؟ لیکن میں اپنے شاعر کا پیغام
اپنی زبان سے تمھیں سنا دیتا ہوں اس میں اس نے بتایا ہے
کہ زندگی کی اصلی دولت نہ روپیہ ہے نہ مکان، نہ کارخانے

نہ مشینیں۔ اس کی اصل دولت ہیں افراد۔ اور افراد کی دولت کیا ہے؟ ان کے دماغ کی جولانی، دل کا گداز، حسن آفرینی، تلاش اور تحقیق کا جذبہ، خوب سے خوب تر کی جستجو، اس دولت کی تفسیر اقبال نے یوں کی ہے:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا گداز
مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل میری رزم گاہِ حیات
گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

جب مجھے ٹیپ رکارڈر پر خط لکھا جائے تو تمھاری ہنسی اور تمھارا رونا دونوں رکارڈ ہو کر میرے پاس آنے چاہئیں سنتا ہوں تم بڑے ضدی ہو، اس معاملہ میں ضد نہ کرنا سلمان پیارے خدا تمھارے ساتھ ہو اور تمھاری زندگی سوارت کرے۔"

ویسے تو یہ خط ہر تبصرے سے بالا ہے۔ اور سیدین صاحب کی سیرت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ میں نے یہ طویل خط یہاں اس لئے درج کیا کہ اگرچہ انھوں نے اسے اپنے نومولود نواسے سلمان کے نام ٹیپ کر کے بھیجنے کے لئے پنسل سے قلم برداشتہ لکھا تھا۔ مگر اس میں انھوں نے اسے جو درس دیا ہے، جو پیام، جو آرزو، جو ہدایت انھوں نے سلمان کو دی ہے وہ دراصل وہی ہے جو عمر بھر وہ نوجوان نسل کو اپنی تعلیم سے اور اپنی مثال سے دیتے رہے! یہ پیام صرف سلمان تک، صرف ان کے خاندان کے نوعمر افراد تک ہی نہیں محدود رہنا چاہیئے۔ بلکہ نئی نسل کا ہر بچہ اور نوجوان اس سے کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی سیرت کی تشکیل کر سکتا ہے اور (سیدین صاحب کے قول کے مطابق) اس دنیا کو جہاں وہ آیا ہے، شیطان کی بستی بنانے کی جگہ خدا کی دنیا بنانے کی جدوجہد کر سکتا ہے۔

سیدین صاحب کے انتقال سے (دسمبر ۱۹۷۹ء) کئی مہینے پہلے ان کی چھوٹی لڑکی سیدہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ کینیڈا سے ہندوستان آئی۔ اس کا ننھا بچہ مراد ایک سال پہلے جب وہ کینیڈا گئے تھے ان سے بہت ہل گیا تھا۔ اب وہ لگ بھگ تین سال کا بڑا پیارا، ذہین اور سنجیدہ بچہ تھا جس کی صورت اور انداز میں سیدین صاحب سے بڑی مشابہت پائی جاتی تھی۔ وہ کوئی چھ مہینے ان کے پاس رہا اور ان کی محبت کا مرکز بنا رہا۔ اس کے پیار میں جیسے وہ اپنی بیماری بھول گئے تھے۔ فکریں اور پریشانیاں پس پشت پڑ گئی تھیں۔ کام تو خیر ان کی زندگی تھا اور اب بھی اسی انہماک سے ہوتا تھا۔ مگر باقی وقت کا بیشتر حصہ مراد کی نذر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو جب ماں باپ اور خالہ وغیرہ باہر چلے جاتے تو وہ رات گئے تک ان کے بستر پر لیٹ کر

ان سے باتیں کرتا اور سنتا سنتا سو جاتا۔ کبھی بستر گیلا کر دیتا تو سیدین صاحب کی پیشانی پر شکن تک نہ آتی اور صاحبزادے شرمندہ ہو کر "پاپا" پر الزام رکھ دیتے تو وہ خوب ہنستے۔ کیا دوستی تھی ان دو معصوموں میں۔ ساتھ کھیلتے۔ اکثر ساتھ کھانا کھاتے، ساتھ ٹہلنے جاتے، وہ بچہ کو دلچسپ کہانیاں سناتے، اپنے نوخیز باغ کے پھول اور پودے دکھاتے، ان کے نام سکھاتے، اس کے ساتھ بے ساختہ ہنستے۔ وہ ہنسی جو مدت سے ان کے ہونٹوں سے چھن گئی تھی۔ تقریباً روزانہ گیارہ بجے دن کو اُسے لے کر میرے گھر آتے — عام طور پر اس وقت میں لکھنے کے کام میں مشغول ہوتی ہوں — وہ بچے کو سکھا کر اندر بھیجتے۔ ننھے ننھے قدموں سے دوڑتا ہوا مراد میرے پاس آتا اور دور ہی سے پکارتا "پھوپی جان!.... میں اکیلا آیا ہوں — پاپا نہیں آئے —" اور پیچھے سے ان کا چاند سا مسکراتا چہرہ نظر آتا اور میری دنیا میں مسرت کی ہزاروں کرنیں بکھر جاتیں پھر وہ کہتا — (یہ بھی پاپا سکھا کر لاتے تھے) "پھوپھی جان — کچھ چائے — کچھ کافی" — ہم دونوں اس کے ساتھ ہنستے، ہنساتے، عابد صاحب بھی کام چھوڑ کر آتے، چائے یا کافی پی جاتی — اس وقت یہ محسوس ہوتا کہ ہم چاروں سے زیادہ مسرور انسان اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔

ان کے آخری سفر سے چار یا پانچ دن پہلے یہ بچہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بمبئی اور وہاں سے کنیڈا چلا گیا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کا سیدین صاحب پر بہت اثر ہوا۔ جیسے ان کو پہلے سے احساس تھا کہ یہ آخری رخصت ہے۔ مراد کو سینے سے لگا کر ان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ یہ ان کی عجیب خصوصیت تھی کہ آنکھوں سے کتنی ہی برکھا ہوتی رہے، چہرہ کھلا رہتا تھا پھر تین دن تک برابر وہ اس کا ذکر کرتے رہے۔ اسے بمبئی فون کرتے رہے....

بڑا ہو کر مراد کیا جان سکے گا کہ اس نے کیسی نعمت پائی تھی جو اتنی کم سنی میں اس سے چھن گئی۔

اپنے ذاتی نوکروں سے ان کا سلوک مثالی تھا جب تک بھابی جان زندہ رہیں۔ اپنے نوکروں کی خاطر مدارات ---- جی ہاں خاطر مدارات ---- ان کے کھانے پینے، کپڑے لتے کا خیال رکھنا، خود صبح سویرے نماز کے بعد چائے بنا کر سب سے پہلے گھر بھر کے نوکروں کو پیالے بھر بھر کر پلانا، ان لوگوں کے خاندان والوں کو بلا بلا کر مہمان رکھنا، ان کی دوا علاج کرانا، ان کو سب سے چھپا کر بڑے بڑے قرضے دینا۔ زیادہ تنخواہ دے کر دوسروں کو کم بتانا ---- غرض جس کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی کرنا، یہ سب بھابی جان کے ذمہ تھا۔ اور بھائی جان ان کو چھیڑنے کے لئے مذاق اڑاتے تھے۔ مگر اس بات کی ان کے دل میں بڑی قدر تھی۔ پھر بھابی جان کے بعد جب سیدین صاحب کو براہ راست نوکروں سے سابقہ پڑا تو وہ بھی اسی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر ان سے شفقت اور محبت کا سلوک کرتے۔ نوکر کئی کئی مہینوں کی چھٹیاں مناتے، تنخواہیں انھیں پہنچتی رہتیں۔ واپسی کے لئے سفر خرچ کا منی آرڈر کیا جاتا۔ اور اس کے واپس نہ آنے پر کوئی گھر کا فرد اعتراض کرتا، وہ اس کی طرف سے صفائی دیتے، اُلٹی اس کی طرف داری کرتے۔ بھائی، میاں کہہ کر بات کرتے۔ یہ رسمی "مساوات" نہ تھی بلکہ وہ سچ مچ انھیں بھائیوں یا بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تو تھی کہ ہر جگہ ان کے ذاتی نوکر ہوں یا سرکاری چپراسی، اردلی وغیرہ جو ان کو ملتے تھے، سبھی ان کا کام دل و جان سے کرتے، کسی خدمت سے خواہ کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو، منھ نہ موڑتے تھے جو نوکر ان کے ہاں رہ لیتا پھر کسی دوسری جگہ اس کا رہنا مشکل تھا۔ خاندان کے کسی فرد کی مجال نہ تھی کہ ان کے کسی نوکر کو کچھ کہہ سکے۔ یا

اس کی ان سے شکایت کرے۔ اس ضمن میں دو کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ ایک شیریں جو سیدین صاحب کی ہم عمر تھیں۔ ان کو ہماری والدہ نے پالا اور شادی بیاہ کیا تھا۔ عمر بھر وہ ہمارے خاندان میں گھر کی لڑکی کی طرح سمجھی جاتی رہیں۔ ان کو ہم بہن بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ ہم دونوں چھوٹے بھائی بہن کو تو انہیں نے پالا تھا۔ وہ خاص طور پر "اپنے بھائیوں" پر جان دیتی تھیں۔ اور ان میں سے کسی کے بلانے پر اپنا گھر بار، میاں بچے سب کو چھوڑ کر دلی، بمبئی، رام پور پہنچ جاتیں۔ ان میں کچھ ایسی صفات تھیں کہ جہاں جاتیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتیں۔ بھابی جان ان کو نندہی کی طرح سمجھتی تھیں۔ بھائی جان کو بھی ان سے بہت محبت اور ان کا بڑا خیال تھا۔ گذشتہ چند سال سے وہ زیادہ تر میرے پاس رہتیں۔ مگر جب "دونوں بھائیوں" میں سے کوئی بلاتا تو فوراً چلی جاتیں۔ جب بھائی جان کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تو وہ بمبئی میں تھیں۔ خبر ملتے ہی دوڑی آئیں۔ ساری ساری رات اور دن دن بھر چپ چاپ ان کے کمرے میں بیٹھی رہتیں۔ بھائی جان پیار بھری ڈانٹ پلاتے "تو کیوں بیٹھی رہتی ہے یہاں آخر؟" وہ نرمی اور مظلومی سے جواب دیتیں "بھائی جان میں تو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی ہوں۔ آپ کا کیا بگڑتا ہے؟" وہ لاجواب ہو کر مسکرا دیتے۔ ان کی حیثیت کبھی نوکر کی نہ تھی۔ نہ دوسرے ان کو ایسا سمجھتے تھے نہ وہ خود۔ بلکہ ایک چاہنے والی عزیزہ کی طرح سب ان سے برتاؤ کرتے۔ سیدین صاحب کے انتقال سے پونے دو ماہ پہلے انہیں کے گھر میں شیریں پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا۔ سیدین صاحب نے شروع میں ان کا علاج کرایا۔ ہولی فیملی بھیجا مگر شیریں کے اصرار پر میں نے ان کو راضی کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کے پاس پہنچا دی جائیں۔ وہ جاتے وقت بھائی جان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ انھوں نے شیریں کو گلے لگا کر دلاسا

دیا۔ خود سہارا دے کر کار میں سوار کرایا اور اپنے آنسو پیتے رہے۔ وہ آج بھی اپنے گاؤں میں معذور و مفلوج پڑی "اپنے بھائی جان" کو یاد کرکے بلک بلک کر روتی رہتی ہیں۔ ان کی حالت ایسی نہیں کہ اس سانحہ عظیم کی خبر سہار سکتیں اس لیۓ ان کو یہ کہہ کر بہلا دیا ہے کہ وہ سیدہ کے پاس امریکہ علاج کے لیۓ گئے ہیں ۔۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل کو خبر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیۓ بچھڑ گئے ہیں۔[1]

ان کا دوسرا نوکر عبدالمجید کشمیری ہے۔ کوئی تیرہ سال پہلے کشمیر میں وہ ان کے دفتر میں چپراسی کی حیثیت سے آیا تھا۔ مگر سال بھر بعد سیدین صاحب کشمیر سے چلے آۓ اور اگلے سال بیگم سیدین خدا کو پیاری ہوئیں۔ ہم سب کے اصرار پر سیدین صاحب اس پر تیار ہو گئے کہ مجید کو بلا کر ان کے کام کے لیۓ رکھا جائے۔ وہ کارگذار، سلیقہ مند، محنتی اور ان سے محبت کرنے والا آدمی تھا۔ اپنی مستقل نوکری اور بال بچوں کو کشمیر میں چھوڑ کر وہ سیدین صاحب کے پاس چلا آیا۔ اور تقریباً دس سال تک ان کی بڑی محبت اور لگن سے خدمت کی۔ (یوں سیدین صاحب کی خدمت کرنا بہت آسان کام تھا) اس کے دل میں سیدین صاحب یا ان کے خاندان سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو، مگر خود سیدین صاحب اس کے ہمیشہ شکر گذار ہی رہتے۔ وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر جاتا اور مہینوں نہ آتا، خط کا جواب نہ دیتا تو ہم لوگوں کو شکایت ہوتی۔ مگر کبھی فرشتہ صفت بھائی جان کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ ہمیشہ اس کی طرف داری اور تعریف ہی کرتے رہے۔ زندگی میں انھوں نے اس سے جو سلوک کیا وہ کیا، مگر

---

[1] یکم فروری ۱۹۷۲ء کو وہ بھی اس دنیا سے چل بسیں۔

اس کا بھی خیال رکھا کہ ان کے بعد وہ ایک دم بے سہارا نہ ہو جائے۔

سیدین صاحب اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کبھی نوکروں کو زحمت نہ دیتے۔ مجید جیسے نوکر یا شیریں جیسی بہن خود ہی خیال کر کے کام کر دیں تو اور بات ہے۔ نگران کو یہ بھی پسند نہ تھا۔ بیماری میں کبھی مجید کو اپنے کمرے میں سلانے پر تیار نہ ہوئے کہ رات کو اس کی نیند خراب ہو گی۔ ان کی جدائی کا صدمہ ان کے عزیزوں اور دوستوں کے لئے تو سخت ہے ہی، مگر نوکروں کے لئے بھی، خواہ وہ پرانے ہوں یا تھوڑے ہی دن پہلے ان کے پاس آئے ہوں، کچھ کم نہیں۔ وہ آج بھی ان کے ذکر پر بچوں کی طرح رو پڑتے ہیں۔

انکسار اور خودداری

سیدین صاحب کے مزاج میں سچا انکسار تھا۔ شیخی، تکبر، خودستائی خود پرستی کی بیماریاں ان کو چھو کر بھی نہ نکلی تھیں۔ یہ بناوٹی انکسار نہ تھا کہ لوگ دل میں تو سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے آدمی ہیں۔ مگر چونکہ بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ وہ منکسر مزاج ہو۔ اس لئے بڑے تکلف اور اہتمام سے لوگوں سے جھک کر ملتے ہیں۔ سیدین صاحب کی عمر بیس یا اکیس سال کی تھی۔ جب انھوں نے لیڈز سے اپنے نانا خواجہ سجاد حسین کے کسی خط کے جواب میں لکھا تھا:-

> "جوں جوں دنیا کو دیکھتا ہوں، اپنی ذات کے بارے میں میرا انکسار کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنے کسی کارنامے کے متعلق فخر کرنا بڑی گھٹیا بات ہے۔ دنیا میں بے شمار انسان ایسے ہیں جن کے کاموں کے مقابلے میں اپنے کام کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہے......."

اور یہ احساس بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا۔ یہ وہ انکسار تھا جو عظیم شخصیتوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے، زندہ معاصرین کی قابلیت اور شخصیت سے متاثر ہونے، ان کے کارناموں کو بڑھا کر اور خود اپنے کمالات کو گھٹا کر دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ مزاج ہے جو آدمی کو بڑے بڑے کام کرنے پر اکساتا ہے۔

ایسے کام جو محض بڑا آدمی کہلانے، بڑے عہدے اور نام پانے کے لالچ میں نہیں کیے جاتے، جن میں ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا نہیں ہوتی۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سیدین صاحب کی قابلیت، ذہانت، ان کا خاندانی اور تہذیبی پس منظر، ان کی شخصیت کی مقناطیسی کشش، تقریر و تحریر کا جادو وہ چیزیں تھیں جن کو لے کر اگر وہ سیاست کے میدان میں جاتے تو بہت کامیاب ہوتے اور حکومت و اقتدار کی اونچی چوٹی پر پہنچ جاتے۔ پھر پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے جو ان کے تعلقات تھے، ان کے سہارے بھی ان کے لئے وزیر یا سفیر بننا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر سیدین صاحب علم و تعلیم کی خدمت کو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ طفیلی جاہ و منصب اور اضافی عزت و عظمت کی ان کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ یہ جھوٹے نگ، کچے رنگ ہیں جو چار دن میں اپنی چمک دمک دکھا کر ماند پڑ جائیں گے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ نہیں ہوں ....." وہ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر، دنیا بھر کے ملکوں میں کانوکیشن آڈریس پڑھنے، لکچرز دینے، یا مہمان پروفیسر کی حیثیت سے پڑھانے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ ان کو ڈگریاں اور اعزاز پیش کیے جاتے تھے، دوسرے ملکوں میں جاتے تو اخباروں میں ان کی تصویریں چھپتیں، نمایاں جگہ پر ان کی تقریروں کے اقتباسات دیے جاتے، ان کی تعریف میں کالم کے کالم سیاہ کیے جاتے۔ مگر ہندوستانی اخبار ان تقریبوں کے ذکر سے یا تو بالکل خالی ہوتے یا سرسری انداز میں دو چار سطر میں ان کا ذکر کرکے ٹال دیتے۔ اس لئے کہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آتا تھا کہ اپنی پبلسٹی کا خود اہتمام کریں۔ اور آپ جانیں ہمارے اس پیارے دیس

میں صاحبانِ اقتدار کی چاپلوسی اور خود اپنی تعریف سے کسے اتنی فرصت ملتی ہے کہ بغیر کسی تحریک کے سچے مستحق کو داد دینے کا خیال آئے۔ لیکن یہ خیال ان کے قریبی دوستوں یا عزیزوں کو ہو تو ہو انھیں اس کا ذرا بھی ملال نہ تھا۔ ان کا تو یہ حال تھا کہ اگر گھر والوں کو مجبوراً کوئی ایسا واقعہ سنانا پڑ جائے جس میں ان کی' یا ان کی تقریر و تحریر کی' تعریف کا پہلو نکلتا ہو تو وہ مزاحیہ انداز میں خود اپنے پر فقرے کس کے، تعریف کرنے والوں کا مذاق اڑا کر اس کی تلافی کر دیتے تھے۔ وہ اگر کہیں جاتے اور لوگ انہیں نہ پہچان پاتے تو وہ اس انتظار میں نہیں رہتے تھے کہ جاننے والے آئیں اور انہیں کسی ممتاز مقام پر بٹھائیں بلکہ خاموشی سے کسی کونے میں بیٹھ جاتے۔

ایک بار سوڈان کی حکومت نے انھیں اپنے ملک میں تعلیم کی از سر نو تنظیم کے لئے تعلیمی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے بلایا۔ وہ کئی ماہ وہاں جا کر رہے۔ ان کا مستقر خرطوم تھا۔ کچھ عرصے بعد کسی دوسرے شہر میں ایک میوزیم دکھانے کے لئے ان کو مدعو کیا گیا۔ اور معزز مہمان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ یہ طے ہوا تھا کہ ان کو قیام گاہ سے لے جانے کے لئے کچھ حضرات پہنچیں گے۔ اُن لوگوں کے آنے میں دیر ہوئی تو سیدین صاحب اکیلے وہاں پہنچ گئے۔ میوزیم کے اندر جانا چاہتے تھے کہ منتظمین نے ٹوکا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ کچھ انکسار کچھ شرارت سے انھوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ سادگی سے کہا — آپ کا میوزیم دیکھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے معذرت کی۔ معاف کیجئے! آج ہمارے ہاں ایک معزز مہمان آرہے ہیں۔ جب تک وہ میوزیم کا معائنہ نہ کرلیں کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور صورت حال سے لطف اٹھاتے رہے۔ ذرا دیر بعد کوئی صاحب

جوان کو پہچانتے تھے آئے اور یہ دیکھ کر بدحواس ہو گئے کہ اس روز کے مہمان خصوصی کو پیشوائی کرنے والوں نے باہر روک رکھا ہے۔ مگر سیدین کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ لوگوں سے انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور اندر چلے گئے۔

جب، وہ کشمیر ڈائرکٹر تعلیمات ہو کر گئے اس زمانے میں وہاں افسروں کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ لوگ ان کے سامنے اس طرح بچھ بچھ جاتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ سیدین صاحب وہاں پہنچے تو راستے ہی میں پیشوائی کرنے والوں، خوشامد اور خاطر کرنے والوں کی یورش شروع ہو گئی۔ ہوتا یہ کہ اول تو لوگوں کو یقین نہ آتا کہ یہ خوش مزاج، ہنس مکھ نوجوان ان کا نیا ڈائرکٹر تعلیمات ہے۔ جب پہچان جاتے تو اس قدر نیازمندی کا اظہار کرتے کہ سیدین صاحب کو سخت کوفت ہوتی۔ سات سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد انھوں نے کم سے کم اپنے محکمہ میں افسری اور ماتحتی کے رشتوں کو بہت کچھ برادرانہ تعلقات میں بدل دیا اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ سب تعلیمی خدمت کرنے والے ایک ہی فرض کو ادا کرتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:۔

"ہم لوگ جو علمی اداروں میں کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ روپیہ ہے، نہ رسوخ، نہ قوت نہ شہرت، ان کے پاس صرف ایک چیز ہے۔ اور وہ ان کی رائے کی آزادی ہے...."

وہ ہر تعلیمی کام کرنے والے کو عزتِ نفس اور آزادیِ رائے کا سبق دیتے تھے۔ خوشامد، چاپلوسی، دوسروں کی غیبت، اپنی کاربرآری کے لئے

جوڑ توڑ کرنا انھیں سخت ناپسند تھا اور اس معاملے میں وہ اکثر اپنے ماتحتوں کو سختی سے تنبیہہ کرتے تھے کشمیر کے ہونہار نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا، ان کے دل میں ریاست کی سچی خدمت کی لگن پیدا کرنا، ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ محمودہ احمد علی جواب ریاست کے ایک بہت بڑے WOMEN'S COLLEGE کی پرنسپل ہیں۔ سیدین صاحب کے کشمیر جانے کے کچھ ہی عرصے بعد اپنی تعلیم ختم کرکے سری نگر آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت پنجاب یونیورسٹی کے امتحان خاص امتیاز کے ساتھ پاس کئے تھے۔ اور علی گڑھ اور لاہور میں ان کو اچھی نوکری ملنے کی امید تھی۔ وہ یہ سن چکی تھیں کہ کشمیر میں کوئی نئے ڈائرکٹر تعلیم آئے ہیں۔ مگر اپنے ہاں کے سرکاری افسروں سے بدگمان تھیں۔ سیدین صاحب نے اخبار میں ایک کشمیری لڑکی کے فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہونے کی خبر پڑھی تو فوراً مبارک باد کا خط لکھا اور یہ دعوت دی کہ تم جیسے لوگوں کی کشمیر کو بہت ضرورت ہے اور تمھارا فرض ہے کہ یہاں تعلیمی حالت کو سدھارنے اور کشمیری عورتوں میں تعلیم پھیلانے کا کام انجام دو۔ محمودہ کو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی۔ وہ کہتی ہیں کہ میں سیدین صاحب سے ملنے گئی۔ حسب عادت ان سے بہت تیز تیز باتیں کیں لیکن ان کی نرمی، بردباری اور شفقت نے مجھے بہت متاثر کیا اور ان کی رہبری نے میری زندگی کا رخ متعین کر دیا اور میں نے کشمیر کی اور تعلیم کی خدمت میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر تو ان سے اور ان کے خاندان بھر سے سیدین صاحب اور ان کے گھرانے کے عزیزانہ تعلقات ہو گئے جو آج تک قائم ہیں۔

مسز ساجدہ جو آج کل کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیمات ہیں سیدین صاحب سے بہت متاثر ہیں اور ان کے تعلیمی خیالات کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھتی ہیں۔

سیدین صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ آخری بار جولائی ۱۹۷۱ء میں سیدین صاحب کشمیر گئے تو اپنے سب دوستوں، ساتھیوں اور پرانے ملازموں تک سے تجدید ملاقات کی۔ وہاں صادق صاحب مرحوم سے لے کر معمولی شہری تک نے جس خلوص اور محبت سے ان کی پذیرائی کی اس کا سیدین صاحب کے دل پر بہت اثر تھا۔ ساجدہ صاحبہ بھی ان سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ انھیں بھی کچھ عرصہ پہلے قلب کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا۔ سیدین صاحب نے اپنے مخصوص اپنایت اور محبت کے انداز میں ان کی تعریف کی ۔۔۔ "ساجدہ تم ہر بات میں میری روش پر جا رہی ہو!" یہ بات سناتے سناتے ساجدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ چند مہینے ہوئے مسز ظفر علی صاحبہ (جو ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور جنھوں نے انسپکٹریس تعلیمات کی حیثیت سے سیدین صاحب کے ساتھ کئی سال کام کیا تھا) میرے پاس تعزیت کے لیے آئیں تو پورے وقت درد، محبت اور احترام سے ان کا ذکر کرتی رہیں۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا۔" آپ کو ایسے بھائی پر جتنا ناز ہو کم ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ کشمیر سے آنے کے پچیس برس بعد تک وہاں کے لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے جو گہری محبت اور عقیدت ہے وہ شاذونادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

یوں سیدین صاحب بڑے منکسر مزاج تھے لیکن کسی بڑے آدمی، کسی افسر، یا حاکم کے سامنے جھکنا نہ جانتے تھے۔

خاکساروں سے خاکساری تھی

سربلندوں سے انکسار نہ تھا

جو لوگ عمر، قابلیت، ذہانت، علم وغیرہ میں ان سے بڑے ہوتے ان کا وہ

بے شک احترام کرتے تھے۔ مگر یہ احترام عہدے یا کرسی کا نہ تھا۔ کشمیر میں وہ وزیر اعلیٰ تک سے برابری کے ساتھ ملتے تھے۔ شری گوپالا سوامی آئینگر، جن سے عام طور پر لوگ بہت مرعوب تھے، سیدین صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ مہاراجہ کے دربار میں شاید صرف ایک بار مجبوراً گئے کہ وہاں کے آداب کی خاطر درباری لباس پہننا پڑتا تھا۔ پگڑی باندھنی، تلوار لگانی پڑتی تھی۔ اگرچہ ہماری نظر میں وہ اس لباس میں خود ایک شاندار شہزادے معلوم ہوتے تھے۔ مگر خود ان کو اس سے بہت کوفت ہوئی اور انھوں نے خود اپنا مذاق اڑایا رام پور میں نواب صاحب کے ہاں دربار داری کے آداب سبھی افسروں کو برتنے پڑتے تھے۔ لیکن سیدین صاحب ان تکلفات سے آزاد رہے۔ انھوں نے کبھی نواب صاحب کو "حضور" اور "سرکار" نہیں کہا جب کہ اور کوئی بغیر اس لقب (سرکار) کے ان کو مخاطب کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ "نواب صاحب" ہی سے کام چلاتے رہے۔ نواب صاحب کے ہاں تقریباً ساری رات کا دربارِ خاص رہتا تھا۔ اور جن حضرات پر وہ مہربان ہوتے ان کو روزانہ وہاں حاضری دینی پڑتی تھی۔ ایک بار تو سیدین صاحب مجبوراً گئے۔ مگر دوسرے ہی دن معذرت کر لی۔ "معاف کیجئے نواب صاحب، میں سویرے سونے اور صبح سویرے اٹھنے اور کام کرنے کا عادی ہوں۔ پھر گھر پر میری بیوی میرا انتظار کرتی رہتی ہیں" نواب صاحب بھی سمجھ گئے تھے کہ سیدین صاحب سے اگر انھیں کام لینا ہے تو رعب جما کر یا اپنی مرضی پر چلا کر نہیں لے سکتے۔ اس لئے انھوں نے کبھی ان کی کسی بات میں بے جا دخل نہیں دیا۔ بمبئی میں وزیر اعلیٰ کھیر[1] صاحب سیدین صاحب

---

[1] بی۔ جی۔ کھیر

کے بڑے قدر دان تھے اور خود سیدین صاحب بھی ان سے بہت متاثر تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جب مولانا آزاد نے سیدین کو بمبئی سے دلی بلایا تو کھیر صاحب کو بڑا افسوس تھا۔ اور وہ ہر قیمت پر انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ مگر مولانا آزاد کے حکم سے مجبور تھے۔ اور خود سیدین صاحب کی بھی یہ خواہش تھی کہ انھیں مولانا کے ساتھ کام کرنے کی سعادت نصیب ہو اور پھر انہیں مرکزی وزارتِ تعلیم کے جائنٹ سیکریٹری اور پھر سیکریٹری کی حیثیت سے وسیع میدان میں علمی اور تعلیمی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ اسی لئے وہ خوشی سے دلّی آنے پر تیار ہو گئے۔ یہاں ان کے دوست ہمایوں کبیر سیکریٹری تھے دونوں ایک دوسرے کی قابلیت کے معترف تھے اور ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ خود مولانا آزاد جو بڑے بڑوں کو نام لے کر پکارتے تھے، سیدین صاحب کو ہمیشہ "خواجہ صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو بیشتر قبول کر لیتے تھے۔ ان کے خاندان بھر پر شفقت فرماتے تھے۔ اکثر باریابی کا موقع دیتے۔ کبھی کبھی دعوت بھی کرتے تھے۔ ان کے سیدین صاحب کے والد اور نانا سے ذاتی تعلقات رہ چکے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین اور مولانا حالی سے انہیں بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ اور اسی نسبت سے وہ سیدین صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک واقعہ میرے دل پر نقش ہے۔ ۱۹۵۰ء میں بمبئی میں سیدین صاحب پر قلب کا شدید دورہ پڑا۔ تو میں بمبئی جانے سے قبل عابد صاحب کے ساتھ مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ بمبئی کی آب و ہوا اور پر شور زندگی بھائی جان کے لئے سازگار نہیں ہے اور میری دلی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح دلی آجائیں۔ چونکہ مولانا مجھ پر بڑا اکرم فرماتے تھے۔ میں نے ان کو بھائی جان

کی بیماری کی خبر سنانے کے بعد عرض کیا۔ مولانا وہاں ان کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ آپ انھیں دہلی بلا لیجئے۔ مولانا بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے.... بے قراری سے کمرے میں چکر لگائے۔ "اللہ رحم کرے —— اللہ رحم کرے" کئی بار منھ سے نکلا۔ پھر بیٹھ گئے۔ کوئی وعدہ نہیں کیا —— "خدا خواجہ صاحب کو صحت دے —— معاملہ میرے پیش نظر ہے" بس اتنا کہا۔ میں اگلے دن بمبئی چلی گئی۔ شاید دو ہفتے کے بعد ہی حکومت ہند کی طرف سے بمبئی کی حکومت کو خط ملا۔ جس میں سیدین صاحب کی خدمات وزارت تعلیم کے جائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے طلب کی گئیں۔ دہلی آنے کے بعد بہت جلد وہ اڈیشنل سیکریٹری اور پھر سیکریٹری ہو گئے۔

تقریباً گیارہ سال تک سیدین صاحب نے یہاں کام کیا۔ چند خود پرست حاسد لوگوں کو چھوڑ کر وہ عام طور پر ہردلعزیز رہے۔ اور چھوٹے سے بڑے تک سب ان کی عزت اور ان سے محبت کرتے تھے۔ خود سیدین صاحب کا بھی ان سے ایسا ہی برتاؤ تھا۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عہدہ دار کا انھیں یکساں خیال تھا اور سب کے کام پر ان کی نظر رہتی تھی ہر آدمی سے مناسب اور موزوں کام لینے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اصول کے معاملہ میں وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے اور حق بات کہنے اور منوانے کے معاملہ میں وہ بڑے سے بڑے آدمی سے ٹکر لینے میں جھجکتے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کے حقوق اور ان کی عزت کا انھیں بڑا خیال رہتا تھا۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوتی تو وہ خود اس کی سپر بن جاتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا وہ مولانا آزاد کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور خاص طور پر قرآن مجید کے مترجم اور مفسر کی حیثیت سے

ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن ضرورت پڑے تو ان سے اختلافِ رائے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اکثر مہذب بحث مباحثہ کے بعد اپنی بات منوا لیا کرتے تھے۔

سیدین صاحب کے کاغذات میں ان کے ایک خط کا مسودہ مجھے ملا ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کو لکھا تھا۔ یہ خط غالباً اس زمانے میں لکھا گیا ہوگا جب ہمایوں کبیر صاحب کے بعد بعض نا اہل صاحبانِ اقتدار نے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے انتظامات میں رخنہ اندازی اور ریشہ دوانیاں کرنی شروع کر دی تھیں اور سیدین صاحب کے لئے کام کرنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

"آپ نے ترجمان القرآن کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہے:۔

امید ہست کہ بیگانگیِ عرفی را
بہ دوستی سخنِ ہائے آشنا بخشند

اس عریضہ کو لکھنے کی بھی معذرت پیش کرتا ہوں اور باوجود جناب کے وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ رکھنے کے امیدوار کرم ہوں کہ جناب چند منٹ اس کو پڑھنے کے لئے نکال سکیں گے۔ جناب نے آج صبح مجھے بلا کر جو ملاقات کا موقع دیا اس کے لئے سپاس گذار ہوں۔ کیوں کہ اس کی بدولت ایک ضروری معاملہ جس کے بارے میں غلط فہمی کا امکان ہو سکتا تھا وہ صاف ہو گیا۔ اس وقت وہ سب باتیں جو میں عرض کرنا چاہتا تھا شاید پاسِ ادب کی وجہ سے عرض نہیں کر سکا۔ اگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے چند جناب کے گوش گذار کر دوں۔

جناب کو معلوم ہوگا کہ میں گذشتہ تیس سال سے تعلیم کے میدان میں کام کرتا رہا ہوں (میں ۲۶ء میں انگلستان سے لوٹ کر علی گڑھ ٹریننگ کالج کا پرنسپل مقرر ہوا تھا) اس عرصے میں ابتدائی چند سال تو ڈاکٹر ضیاء الدین کی ماتحتی میں کام کرنا پڑا۔ اور دل و دماغ پر جو کیفیتیں گذرنی تھیں گذر گئیں۔ لیکن الحمدللہ کہ اس وقت بھی یونیورسٹی کا ایک نہایت جونیر خادم ہونے کے باوجود کبھی ان کی حق ناشناسی اور باطل دوستی کے ساتھ معاملہ نہیں کر سکا۔ اور جس بات کو اپنی کمزور عقل کے مطابق حق سمجھا۔ اس کی علی الاعلان تائید کی۔ اس کے بعد خوبیِ قسمت سے چند ایسے بزرگوں اور حاکموں کے ساتھ کام کرنا پڑا جن کی صحبت کو میں زندگی کی انتہائی خوش بختی تصور کرتا ہوں۔ ان میں سر راس مسعود، سر گوپالا سوامی آئینگر، مسٹر کھیر اور جناب والا کی ذاتِ گرامی شامل ہے۔ جن کے سر چشمۂ فیض نے ایک معمولی پتھر کو شکل و رنگ اور گوہر تابی بخشی۔ میں نے اس طویل عرصے میں علم و تعلیم اور (اپنی سمجھ کے بقدر) انسانی قدروں کی خدمت کے سوا کسی چیز کو اپنا مطلوب نہیں سمجھا۔ کبھی CAREERISM کا بت اپنے سامنے نہیں رکھا۔ کبھی کسی غیر مناسب ذریعے سے قوت یا اختیار یا اثر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کشمیر جیسی جگہ میں جہاں کا سکۂ رائج سازش اور ریشہ دوانی تھا۔ اپنے دامن کو آلایش سے صاف رکھا اور خدا کا شکر ہے کہ اس راہ پر چل کر، کہ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، اب زندگی کی آخری

منزل میں یہ سوچنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

"آخری منزل" اس لئے عرض کیا کہ میں تو ۵۰ء میں حاصل سے ہاتھ دھو چکا تھا اب تو محض بنانے والے کی رعایت اور مصلحت سے نفس شماری کا سلسلہ جاری ہے۔

۵۰ء کے آخر میں جب مجھے دہلی آنے کی دعوت دی گئی تو صرف ایک کشش تھی جو مجھے یہاں لائی، یہ خیال کہ جناب کی صحبت اور قدم بوسی کا شرف نصیب ہوگا۔ میں نے منسٹری میں بھی جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کام کیا ہے ان کے لئے بھی دل میں لگن یا والد مرحوم کی تصانیف سے پیدا ہوئی یا جناب کے چشمۂ فیض سے۔ اس کام (میں آپ) کا اعتماد اور شفقت ہی دل و دماغ کا سہارا بنی رہی۔ یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ غلطیاں نہیں کیں (بہت سی کی ہوں گی) لیکن دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک میرا علم ہے کبھی کوئی کام اصول اور دیانت کے خلاف یا کسی غیر مستحق کو مدد پہنچانے کے لئے نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں ایسا ہوتے دیکھا، دنیاوی مصلحت کے خلاف اس کی مخالفت کی اور شاید اس سے نقصان بھی اٹھایا...... اور کچھ عرصے سے میں دیکھتا ہوں کہ بعض حلقوں کی طرف سے اور بعض ایسے اثرات کے ماتحت جن سے جناب کا ضمیر روشن مجھ سے زیادہ باخبر ہے۔ نہ صرف یہ کوشش کی

گئی کہ وزارت تعلیم پر ناجائز حملے کئے جائیں بلکہ خود میری پوزیشن کو بھی نقصان پہنچایا جائے۔ اور اس کا ایک شاعرانہ حربہ وہ تھا جس کے ذریعہ (غالباً مختلف موقعوں پر) اس بات کی کوشش کی گئی کہ خود جناب کے دل میں میری طرف سے بے اعتمادی پیدا کی جائے۔ میں ان لوگوں کی بے جا مخالفت یا ناراضگی کو اطمینان بلکہ خوشی کے ساتھ جھیل سکتا ہوں جن کی میرے دل میں قدر نہیں کیوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اِذا مرّوا باللغوِ مرّوا کراماً لیکن جو چیز مجھے بالکل گوارا نہیں۔ وہ یہ خیال ہے کہ کسی ایسے شخص کو، جس کے لئے میرا دل سراپا عقیدت و احترام ہے، میری طرف سے خفیف سی بھی بدگمانی ہو لیکن اِدھر مجھے احساس ہوا ہے کہ شاید غیر شعوری طور (پر) اس پروپگینڈا کے زیر اثر جو نامبارک مصلحتوں کے پیش نظر کیا گیا جناب نے کبھی کبھی ایسا محسوس کیا ہے اور بعض لوگوں کو ایسی جرأت ہوئی ہے کہ وہ جناب کے سکریٹری کے بارے میں جناب سے بالکل غلط قسم کی شکائتیں اور حکایت آفرینیاں کریں۔ میری یہ آرزو ہے کہ میں جس قدر عرصے بھی جناب کے ماتحت کام کروں جناب کے پورے اعتماد کے ساتھ کروں۔ کیوں کہ اس پر میری قوت اور کارگذاری کا انحصار ہے۔ میری خودداری اس بات کی اجازت نہ دے گی کہ میں اپنی زندگی کے نصب العین کو محض کسب معاش کی سطح پر لے آؤں۔ اس لئے میں نے یہ جرأت کی ہے کہ جناب کو اس ذاتی مسئلہ کی طرف توجہ دلاؤں

کیوں کہ اس کا اثر سرکاری کارگذاری پر بھی پڑتا ہے۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق موجودہ تنظیم اور تقسیم کار سے ہے اور جس کی بعض مشکلات کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے۔ کام کو عمدگی کے ساتھ چلانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ تمام افسرانِ وزارت سے مساوات کا سلوک کیا جائے۔ اور ہمت افزائی اور ٹرئننگ کے ذریعہ ان کی صلاحیتِ کار کو بڑھایا جائے۔ اگر اس کے بجائے ہر معاملہ میں اور بات بات میں جواب طلبی اور تفتیش کی فضا پیدا ہو جائے ان کے خلاف ہر کس و ناکس کی شکایت کی پذیرائی کی جائے۔ (خواہ وہ نیک نیتی ہی پر مبنی کیوں نہ ہو) تو خوش دلی کے ساتھ کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے انتظامی امور، ریاستوں کے ساتھ تعلقات وغیرہ میں انتظام کے مسلمہ اصولوں کی پاس داری ضروری ہے۔ اگر ان سے واقفیت نہ ہو اور منصبی حیثیت سے محض احکام جاری کر دیے جائیں تو اس سے کام میں رکاوٹیں اور قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں بھی سکریٹریٹ افسران خصوصاً سکریٹری اور وزراء میں کام اور ذمہ داری کی صحیح تقسیم لازمی ہے۔ جیسا کہ جناب کو معلوم ہے وزراء حکومت پالیسی کا تعین کرتے ہیں۔ اور جن کاموں کے لئے ان کی منظوری قانوناً ضروری ہے یا جن اہم معلومات میں ان کی ہدایت مفید ہے وہ دیتے ہیں۔ سکریٹری منسٹری کا انتظامی افسر مجاز ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ منسٹری میں ڈسپلن قائم رکھے اور

کاموں کی صحیح تنظیم کرے۔ اگر اس میں اس کی ذمہ داری تقسیم ہو جائے اور افسران براہ راست اور بلا واسطہ جائنٹ اپنے ذاتی معلومات وغیرہ کے لئے وزرا کی طرف رجوع کرنے لگیں تو انتظامی شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ایسی فضا نہ پیدا ہونے پائے اور امید ہے کہ جناب والا اور وزیر ریاست کے تعاون سے مجھے اس میں کامیابی ہوگی۔ گذشتہ عرصے میں اس بارے میں کچھ ڈھیل سی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ایک دفعہ عرض کیا تھا۔ بعض افسران نے اپنے معاملوں کے متعلق منسٹری کے اندر اور باہر اس قسم کی پیروی کی جس کو میں نامناسب اور حکومت کے احکام کی خلاف ورزی سمجھتا ہوں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ مندرجہ ذیل امور کے لئے جناب کی عقدہ کشائی درکار ہے۔

۱۔ کاموں کی مناسب تفویض تاکہ منسٹر سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری وغیرہ کے کاموں اور حلقہ اختیار میں تمیز باقی رہے اور ہم سب کو معلوم ہو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔

۲۔ افسران کے اچھے کام کی مناسب قدر کی جائے اور غیر ضروری جواب طلبی وغیرہ سے ان کی ہمت شکنی نہ ہو۔ یوں بھی اس طرح قیمتی وقت جو کام میں صرف ہونا چاہیئے محض رپورٹوں کے لکھنے میں ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ اگر کوئی شکایت وصول ہو تو ان کو احتیاطاً ٹھیک

نہ سمجھا جائے بلکہ سکریٹری کے پاس تحقیق کرنے کے لئے بھیج دیا جائے۔

۴۔ منسٹری کے کام کی تعداد اور تنوع کا جناب والا کو اندازہ ہے۔ اگر اس میں غیر ضروری جواب طلبیاں اور موشگافیاں شامل ہو جائیں تو وہ حیطۂ امکان سے باہر ہو جائے گا۔ یوں تو "کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات" لیکن جب اس کا اثر خود کام کی کیفیت پر پڑے تو میرا فرض ہے کہ جناب کو اس طرف توجہ دلاؤں ۔۔ [1]"

جیسا میں نے کہا یہ خط کا کٹا پھٹا مسودہ ہے، جس کو سامنے رکھ کر دوسرا خط لکھ کر بھیجا گیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولانا نے اس کا کیا جواب دیا۔ اور نہ یہاں اس خط کو پیش کرنے کا مقصد اصل خط وکتابت پر روشنی ڈالنا ہے جو ان کے اور مولانا کے درمیان ہوئی ہوگی۔ میں صرف یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ سیدین صاحب کی سیرت میں جہاں حد سے زیادہ نرمی تھی وہاں رزم حق و باطل کے وقت فولاد کی سی سختی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ خط کے انداز میں انکسار ہے۔ مگر حق بات بے دھڑک کہنے سے وہ ذرا بھی نہیں جھجکے۔ کسی کا نام نہیں لیا۔ صرف اشارے کر دیے ہیں۔ جن کو مولانا خود سمجھ سکتے تھے اس میں ان اعتراضات، ناانصافیوں اور ریشہ دوانیوں کی کوئی تفصیل نہیں جو ان کے ساتھ کی گئیں۔ ہاں ان کے ماتحت ساتھیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جا رہا تھا اور ان کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں۔ ان کو صاف لکھا ہے۔

---

[1] آخر کی ایک سطر پڑھی نہیں جا سکی۔

شخصیت کی یہی مضبوطی، ہر دلعزیزی اور حق پرستی کا جذبہ تھا جس کی قیمت مولانا آزاد کے بعد سیدین صاحب کو ادا کرنی پڑی۔ اور ان کی بے داغ سیرت پر کیچڑ اچھالی گئی۔ لیکن وہ اس وقت بھی حق پرستی اور صاف گوئی سے باز نہ آئے۔

مخالفت سہارنے کی قوت

سیدین صاحب میں ایک بڑی کمزوری تھی۔ (یوں ہمارے مروجہ اخلاق میں اسے بڑی خوبی سمجھا جاتا ہے) عموماً وہ لوگوں کے کردار کا تنقیدی نظر سے جائزہ نہیں لیتے تھے۔ اور انھیں ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا وہ اپنے کو ظاہر کرتے تھے۔ ان کی خوش بین نگاہ کو ہر انسان کی خوبیاں تو فوراً نظر آجاتیں مگر اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا پتہ بہت دیر میں، بہت مشکل سے اس وقت چلتا جب وہ اظہر من الشمس ہوجاتیں۔ وہ کسی کے بارے میں بُرا گمان کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اصل خوبیوں کو پرکھ لینا اور ان سے کام لینا تو انہیں خوب آتا ہی تھا۔ بعض وقت لوگوں میں فرضی صفات بھی دیکھ لیتے تھے۔ اور ان کو بھی سراہتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ معلم تھے نقاد نہیں۔ اور جب وہ کسی کی خامیوں اور عیبوں سے واقف بھی ہو جاتے تو ان کو نظر انداز کر کے اس کی خوبیوں کو ابھارتے اور عیبوں کو دور کرنے کی اپنے مخصوص انداز میں کوشش کرتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ اگر وہ کوشش کرے تو کمزوریوں پر فتح پا سکتا ہے چھوٹے

دل کے، کم ظرف، حاسد لوگوں کو پہچاننا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ بعض ایسے لوگوں سے انھوں نے بہت دکھ اٹھائے۔ اول تو وہ مانتے ہی نہ تھے کہ کوئی ان سے حسد کرتا یا دشمنی رکھتا ہے۔ لیکن جب بات بالکل ظاہر ہو جاتی تو انھیں بڑا سخت دھچکا لگتا۔ ان کا دل ٹوٹ جاتا کہ آدمی اتنا بھی گر سکتا ہے، لیکن کیا مجال کہ وہ اپنے منھ سے کبھی اس کو برا بھلا کہیں یہی نہیں ان کے چاہنے والے اور دوست اسے کچھ کہتے تو یہ بات بھی ان کو ناگوار ہوتی اور وہ الٹی اس کی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کرتے۔ کشمیر میں کچھ کشمیری برہمن ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اور ان کا ایک اخبار ڈائرکٹر تعلیمات پر کیچڑ اچھالنے اور اس کی فرضی بے انصافیاں ثابت کرنے میں لگا رہتا تھا کوئی اور ہوتا تو اس بوچھاڑ سے گھبرا جاتا اور کشمیری مسلمانوں کے ساتھ جو انصاف وہ کرتے تھے، ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا تدارک کرنے کی کوشش کرتے تھے اس سے ہاتھ اٹھا لیتے، کہ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ مگر ایک طرف وہ اس بوچھاڑ اور ہنگامے سے ذرا بھی ڈرے نہیں، اور دوسری طرف ان بدتمیزیوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب حکومت نے اخبار کے ایڈیٹر کو بلا کر تنبیہہ کی تو اس اخبار میں ایک صفحہ پر موٹے کالے حاشیہ کے اندر دو تلواروں کے درمیان یہ مصرعہ لکھتا رہا۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں

اور برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ذاتی طور پر خود ان کے یہ مخالف سیدین صاحب کی عزت کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے پچھلے باب میں اشارہ کیا ہے۔ جب وہ ایجوکیشن منسٹری میں سیکریٹری تھے تو ان کی مخالفت شروع ہو گئی تھی۔ جس سلسلہ میں انھوں نے مولانا آزاد کو وہ خط لکھا تھا جو ہم نے پچھلے باب میں درج کیا ہے۔ پھر مولانا کے بعد وزیر صاحب جو بیچارے احساس کمتری کے شدید مریض تھے (اور جن پر سیدین صاحب کے احسانات بھی کم نہ تھے) ان کے دشمن ہو گئے اور طرح طرح کے بہتان ان پر لگائے یہاں تک کہ ان جیسے بے داغ کردار رکھنے والے انسان کی دیانت کو بھی مشکوک قرار دیا۔ سیدین صاحب حیرت اور صدمہ سے دم بخود رہ گئے! وہ اسی وقت استعفا دینے پر تیار تھے۔ مگر ان کے دور اندیش دوستوں نے سمجھایا کہ یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ اس سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ الزام درست ہیں۔ اب سیدین صاحب کا اصرار ہوا کہ عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔ بات پنڈت نہرو تک پہنچی۔ وہ سیدین صاحب کو چھوٹے بھائی کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی ذرا سی دل شکنی یا بدنامی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے وشنو سہائے صاحب سے بحیثیت کیبنٹ سیکریٹری کہا کہ سیدین کے اطمینان کے لئے اپنے طور پر تحقیقات کرو۔ وشنو سہائے صاحب نے تحقیقات کی تو ظاہر ہے سب الزام غلط ثابت ہوئے۔ ان الزاموں میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنا علی گڈھ کا مکان اس کی اصل قیمت سے بہت زیادہ قیمت پر مسلم یونیورسٹی کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔

تحقیقات میں جو سرکاری انجینئر کی طرف سے ہوئی تھی، کہا گیا کہ سیدین صاحب کا مکان، بہت محتاط تخمینہ کے طور پر ایک حساب

سے تقریباً پینتالیس ۴۵ ہزار اور دوسرے سے اس سے بھی کئی ہزار زیادہ کا بیٹھتا ہے اور یونیورسٹی بتیس ۳۲ ہزار میں یہ مکان خرید کر بہت فائدے میں رہی ہے۔

ہاں صرف ایک الزام میں کچھ اصلیت تھی۔ یعنی ایک بار جب وہ امریکہ گئے تو وہاں کی یونیورسٹی نے ان کی بیوی کا سفر خرچ وغیرہ بھی دیا تھا۔ سیدین صاحب نے اپنے انکم ٹیکس کے حساب میں اسے درج نہیں کیا تھا۔ ان کی دیانت جتنی بے داغ تھی اتنے ہی وہ کاروباری معاملات سے بے خبر تھے اور ان کے سلسلہ میں آنکھ بند کر کے دوسروں کے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ انھیں یہ بتایا گیا تھا کہ بیگم سیدین کے اخراجات کے لئے جو رقم ملی تھی اس کا خود ان کی آمدنی سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے ہی انھیں اپنی غلطی کا علم ہوا مزید انکم ٹیکس فوراً ادا کر دیا۔ بعد میں بھی دو ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارے انکم ٹیکس کے کارگزار محکمے نے برسوں پہلے کی کوئی اصلی یا فرضی انکم ٹیکس کی رقم ان کے نام نکال دی اور وہ انھیں ادا کرنی پڑی۔ کاروباری معاملات سے بے خبری میرے خاندان کے مردوں کی خصوصیت رہی ہے (بجز میرے ایک چچا کے) اور ہمیشہ یہ لوگ دھوکے کھاتے رہے ہیں۔ یہی حال سیدین صاحب کا تھا۔ اس لئے بار بار دھوکا کھاتے اور نقصان اٹھاتے تھے۔

ان چھوٹی چھوٹی چٹکیوں کا ان کے کمزور اور حساس دل پر بہت اثر پڑا۔ مگر ان کے دل میں بدلہ لینے کا خیال تو کیا آتا انھوں نے دشمنوں اور حاسدوں کے خلاف زبان سے بھی کبھی ایک لفظ نہیں کہا نہ دوسروں کو کہنے دیا۔ اور پھر یہی دشمن اور حاسد سیّدین کے بلند کردار کے سامنے جھکنے اور

بعض اوقات ان سے مدد لینے پر مجبور ہوئے تو میرے عالی ظرف بھائی نے سچے دل سے انھیں معاف کر دیا۔ ان کی ہر مدد کی اور بدی کے بدلے نیکی کرنے کی حکایتوں کو جو ہم بزرگوں سے سنا کرتے تھے حقیقت بنا کر دکھا دیا۔

جب اتنی بڑی بڑی مخالفتوں کو وہ اس حوصلے سے سہار لیتے تھے تو ان چھوٹی چھوٹی مخالفتوں کا جو خاندان کے بعض افراد، یا باہر کے لوگ ان کی کرتے، یا پیٹھ پیچھے بدگوئی کرتے، ان پر الزام دھرتے، ان کا بھلا سیدین صاحب کیا جواب دیتے؟ میں نے ہمیشہ ان کے منھ سے (اور یہ بھی بہت کم) سنا تو بس یہی لوگوں کو مجھ سے شکایت ہو تو ہو — مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں! اور سچ مچ اس قلب صافی پر کبھی گردِ کدورت نہیں جمی۔

ظرافت و خوش طبعی

مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا غالب کو حیوان ظریف لکھا ہے۔ سیدین صاحب کو حالی دیکھتے تو کیا کہتے؟ ظرافت کا جیسا پاکیزہ اور لطیف ذوق ان میں تھا وہ لاکھوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ سوقیانہ پن اور پھکڑپن سے منزہ، دل شکنی اور دل آزاری سے مبرّا ظرافت تھی۔ اگرچہ وہ کسی محفل میں چھا جانے کی کوشش نہ کرتے بلکہ ہر ایک کو باتیں کرنے کا موقعہ دیتے تھے اور دوسروں کی باتوں سے دلچسپی لیتے، لطف اٹھاتے تھے۔ مگر ان کی شگفتہ گفتگو، بے ساختہ فقرے، پرلطف لطیفے خود بخود انھیں محفل کی جان بنا دیتے۔ باتیں کیا ہوتیں منھ سے پھول جھڑتے۔

لاکھ مضمون و اس کا ایک ٹھٹول

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں کھبتی تھی وہ اگر بہ مثل

دن کو کہتا تھا دن، و رات کو رات

ان کی بے پناہ ظرافت کا نشانہ زیادہ تر وہ لوگ بنتے جو خود ستائی اور خود پرستی کے مریض ہوتے ہیں اور اپنی شان میں خود قصیدے پڑھا کرتے ہیں۔ جہاں کسی نے ڈون کی لی اور سید ین صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی۔ پہلے ان کے گداز ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیلنا شروع ہوتی، پھر آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک پیدا ہوتی۔ اور پھر نہایت ہی سنجیدگی کے انداز میں وہ اس پر فقرے کستے۔ مگر ان میں طنز یا تلخی نہ ہوتی۔ ان کا مقصد دوسرے کو شرمندہ یا خفیف کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ صرف یہ احساس دلانا کہ ایسی باتیں کرنا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اکثر تو وہ غریب جو اس ظرافت کا نشانہ بنتا سمجھ بھی نہ پاتا کہ یہ فقرہ اس پر چپت ہوا۔ اور دوسروں کے ساتھ خود بھی ہنسنے لگتا۔ غرض ان کی باتوں سے عملِ مزاح کا عامل، معمول اور تماشائی سبھی محظوظ ہوتے تھے۔

ان کی لطیف ظرافت کا ایک نمونہ یہاں پیش کروں گی۔ برسوں پہلے کا ذکر ہے، ایک بار احمد ندیم قاسمی نے کچھ ادیبوں کے نام ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ مجھے بھی یہ سوال نامہ بھیجا گیا۔ میں نے سیدین صاحب کو دکھایا اور ان سے کہا بھلا میں اس کا کیا جواب لکھوں؟ پھر از راہِ چھیڑ خانی کہا جواب آپ لکھ دیجئے نا! انھوں نے حسب دستور میرا، میرے ادبی ذوق کا اور سوالنامہ بھیجنے والے کا سب کا مذاق اڑایا، فقرے کسے جس سے ہم

دونوں لطف اٹھاتے رہے ۔ سوال نامہ میں ان کے پاس چھوڑ آئی تھی ۔ اس سوال نامہ پر، مجھے چھیڑنے کے لئے، نمبر ڈال کر جو جواب انھوں نے لکھے وہ پڑھنے کے قابل ہیں ۔ پرچہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے ۔ جس میں قلم برداشتہ انھوں نے دلچسپ جواب لکھ کر، اپنا، میرا، ادب کا، سوالنامے کا سب کا مذاق اڑایا ہے ۔

سوال نمبر ۱:۔ آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی ؟

جواب :۔ ادب برائے آمدنی کی ۔

سوال نمبر ۲:۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں ؟

جواب :۔ فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

سوال نمبر ۳:۔ اپنے فن کا موجودہ اسلوب اپنانے میں آپ نے ارادتاً کیا کوششیں کیں ؟

جواب :۔ ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

سوال نمبر ۴:۔ آپ افسانہ میں پلاٹ کو ضروری سمجھتی ہیں یا کہ دازنگاری کو یا دونوں کو ؟

جواب :۔ ایک کو بھی نہیں!

سوال نمبر ۵:۔ اپنے فن کے بارے میں آپ نے اپنے مستقبل کے

لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے ؟

جواب :- آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں !

سوال نمبر ۶ :- جدید اردو افسانہ نگاروں میں جنسی تجزیہ کی رَو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب :- ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بےچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

سوال نمبر ۷ :- کیا آپ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں ؟

جواب :- ستائش گر ہے "احمد" اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاق نسیاں کا

سوال نمبر ۸ :- آپ کے فن پر غیر ارادتاً کس افسانہ نگار کی زبان و بیان اثر انداز ہوئے ہیں ؟

جواب :- اپنے شوہر کی ظرافت اور بھائی کی سنجیدگی !

جب وہ کشمیر ڈائریکٹر تعلیمات ہو کر جا رہے تھے تو عمر چونتیس ۳۴ سال کی تھی۔ دیکھنے میں اس سے بھی کم لگتے تھے۔ راستے میں لوگ اس نوجوان شگفتہ رو افسر کو دیکھتے تو انھیں یقین نہ آتا کہ یہی ڈائریکٹر صاحب ہیں۔ کسی صاحب نے تعریفاً کہا کہ اس قدر کم عمر کا ڈائریکٹر آج تک نہ آیا ہوگا۔ سیدین صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "یہ وہ عیب ہے جو روز بروز کم ہوتا جاتا ہے !"

ان کے دوستوں اور شاگردوں کو جانے ان کے کتنے لطیفے

اور دل چسپ فقرے یاد ہوں گے ۔ ان میں یہ نایاب صفت بھی تھی کہ وہ خود اپنے پر فقرے کسنے، اپنا مذاق اڑانے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے ۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو شخص دوسروں کی خبر لے مگر اپنے کو بخش دے وہ سچا ظریف نہیں ۔ سیدین صاحب کبھی اپنے کو نہیں بخشتے تھے ۔

دلِ دردمند

سیدین صاحب کا دل بچپن ہی سے بڑا دردمند تھا۔ دل کیا تھا ایک اتھاہ ساگر تھا محبت اور سوز گداز کا۔ یہ دل چیونٹی کی تکلیف پر بھی دکھ جاتا تھا اور انسانوں کے درد ودکھ سے تڑپ اٹھتا تھا۔ مگر جہاں انصاف، اصول اور عقیدے کا سوال آجاتا، وہاں اس میں فولاد کی سی سختی پیدا ہوجاتی تھی!

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

ان کے مزاج کی شیرینی اور دردمندی کا سب سے دلنشیں منظر کسی بیمار کے سرہانے نظر آتا تھا۔ زندگی بھر انھوں نے قریب ترین عزیزوں کی سخت سے سخت بیماریاں دیکھیں اور تیمارداریاں کیں۔ مگر کبھی تیوری پر بل نہیں آیا۔ ان کا مریض کے پاس آنا ایک مسیحا نفس کا آنا ہوتا تھا۔ سخت سے سخت تکلیفیں بھی اس مسکراتے چہرے کو دیکھ کر جس کی آنکھیں درد و محبت کے نور سے روشن ہوتی تھیں، مریض کا دکھ خود بخود کم ہوجاتا تھا۔ وہ کبھی لفظوں میں مریض سے زیادہ

ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے تھے اور نہ اپنی پریشانی کو ظاہر ہونے دیتے۔ بس مسکرا مسکرا کر اس سے مزے مزے کی باتیں کرتے، اس کی بیماری کی شدّت کو گھٹا کر دکھاتے، اگر وہ رنجیدہ یا مایوس ہوتا تو بڑے پیارے انداز میں اس کا مذاق اڑاتے۔ کہتے "بیماری کو سر پر کبھی نہ چڑھاؤ، پیروں تلے کچل کر رکھو۔ تم نے اس کی خاطر تواضع کی تو چمٹ جائے گی۔ اور رکھائی سے پیش آئے تو رفوچکر ہو جائے گی"۔ غرض ایسی دل چسپ اور امید افزا باتیں کرتے کہ کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا دکھ درد بھول کر زندگی کے روشن رُخ کو دیکھنے لگتا! مگر ان کا انداز ایسا بھی نہیں تھا کہ بیمار یا تیمار دار کو شکایت ہو سکے کہ انھیں ہماری پریشانی یا بیماری کی شدّت کا احساس نہیں ہے۔ دونوں کو یہ محسوس ہوتا کہ نسیم سحر کا جھونکا شفا کا پیام لے کر آیا ہے۔

ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کا درد بھی وہ خوب سمجھتے تھے اور اکثر ان کو اپنے دل نشین انداز میں زندگی سے پیار کرنے کے گُر سمجھاتے تھے۔ اس میں وہ مذہبی قصص و حکایات، بزرگوں کے اقوال، خصوصاً اقبال کے اشعار سے مدد لیتے۔ جو لوگ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ اور خود پسندی کے تنگ دائرے میں چکّر کاٹتے رہتے ہیں ان کو بتاتے کہ دنیا میں سچی خوشی اور سکون دوسروں سے محبت اور ان کی خدمت کرنے ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ ایک بار کسی کو انھوں نے سینٹ فرانسس آف اسیسی کی مشہور دعا کا یہ ترجمہ کر کے دیا تھا اور اصرار کیا تھا۔

کہ تم روز صبح اس کو پڑھ لیا کروگے تو خود رحمی اور بیزاری کی بیماری سے نجات پا جاؤگے :۔

"اے پروردگار، مجھے اپنی دنیا میں امن اور شانتی کو پھیلانے کا ایک ذریعہ بنا کہ جہاں نفرت ہے وہاں میں محبت کا، جہاں شک ہے وہاں ایمان کا چراغ جلاؤں، جہاں نراس ہے وہاں امید، جہاں اندھیرا ہے وہاں روشنی، جہاں رنج ہے وہاں خوشی پھیلاؤں۔

اے مالک مجھے ایسی توفیق دے کہ میں خود تسلی حاصل کرنے سے زیادہ دوسروں کو تسلی دینے کی، خود سمجھے جانے سے زیادہ دوسروں سے محبت کرنے کی کوشش کروں۔ کیوں کہ ہم دوسروں کو دے کر ہی کچھ پاتے ہیں۔ دوسروں کو معاف کرنے سے خود معافی حاصل کرتے ہیں اور اپنی جان دے کر ہی حیات ابدی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں......"

اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس دعا کی ایک ایک بات کے وہ خود قائل اور اس پر عامل تھے۔

ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جس شخص کی بدمزاجی یا بددماغی سے عام طور پر لوگ ناراض یا نالاں ہوتے اور اسے ملامت کا نشانہ بناتے اس سے انھیں اور زیادہ ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔ اخلاق کے اس بیش بہا اصول پر ان کا عقیدہ تھا کہ "نفرت برے سے نہیں برائی سے کرنا چاہیئے۔"

جب کوئی عزیز ہستی ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتی تو اس حساس دردمند دل پر کیا گذر جاتی، اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں برستیں لب خاموش رہتے۔ دوسروں کو سہارا دینے اور دلاسا دینے کی کوشش کرتے اور کام میں اپنے کو کھپا کر، غم کے دریا پر بند باندھنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ یوں تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں صدموں سے دوچار رہنا پڑا تھا اور ساری عمر ہی داغ پر داغ جھیلنے میں کٹی۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں اپنی رفیق حیات عزیز جہاں بیگم کی جدائی ان کے لئے قیامت سے کم نہ تھی جس نے دل کی دنیا ویران کر دی۔ پھر زندگی کے آخری چار سال میں تو اس بیمار اور زخمی دل پر پے در پے حادثات کے ایسے وار ہوئے جن کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہئے تھا۔ ۶۷ء میں ان کے اکلوتے پیارے بھائی کو دل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً وہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ سیدین صاحب بھائی کو آخری بار رخصت کرنے ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچے۔ اندر اور باہر سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم تھا جو اپنے اس خاموش، ہر دل عزیز دوست کو وداع کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ سیدین صاحب نے بھائی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور بس اتنا کہا "اظہر خدا حافظ" تو سب لوگ چیخ چیخ کر رو رہے تھے مگر ان کے صبر جمیل میں فرق نہ آیا تھا۔ میں اس وقت حج کے لئے گئی ہوئی تھی۔ واپس پہنچی تو اس خبر کے سننے کے بعد نیم جان بمبئی سے دہلی آئی۔ سب منع کرتے رہے کہ سیدین صاحب مجھے اور عابد صاحب کو لینے اسٹیشن نہ جائیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کیسے اس بد نصیب بہن کا سامنا کریں گے! مگر

انھوں نے نہ مانا "میں اس وقت اپنی بہن کو لینے نہ جاؤں؟؟"
حیرت سے پوچھا ـــــ اور کس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے
کا سامنا کیا یہ بیان کرنا ممکن نہیں۔

ڈیڑھ سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ان کی عزیز ترین بھانجی
صابرہ زیدی نے اسی دل کی بیماری میں، روس میں آپریشن ٹیبل
پر داعی اجل کو لبیک کہا ـــــ یہ صدمہ اس وجہ سے اور زیادہ
سخت تھا کہ بڑی بہن زندہ تھیں جنہیں مرحوم بیٹی سے بے اندازہ
عشق تھا۔ خود سیدین صاحب کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل
تھا۔ مگر اس حالت میں بھی بہن بھانجیوں اور سب کو تسلی دینے کا
فرض ادا کرتے رہے۔ کچھ ہی دن بعد ان کے محبوب دوست ذاکر صاحب
خدا کو پیارے ہوئے۔ ابھی یہ زخم ہرا تھا، ۷ اکتوبر ۷۰ئ کو باجی بھی
ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ دو دن پہلے سیدین صاحب کو دل کی تکلیف کا
سخت حملہ ہوا تھا۔ یہ خبر ان سے چھپائی گئی۔ مگر وہ بار بار مجھے اور
عابد صاحب کو پوچھتے تھے کہ یہ دونوں یک بارگی کیوں اور کہاں
چلے گئے؟ آخر بتانا پڑا۔ میں دوسرے روز علی گڑھ سے واپس آئی
تو کانپ رہی تھی کہ کیسے بھائی جان کا سامنا کروں گی، وہ دونوں
باہیں پھیلائے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے سینے سے لگا کر اشکوں
کے دریا بہاتے ہوئے بس ایک جملہ ان کے منھ سے نکلا:-

"NOW I HAVE NO ONE BAUT YOU"

اور اب بار بار میں اپنے آپ سے پوچھتی رہتی ہوں کہ ان کی جدائی
کے بعد میں کس سے کہوں کہ "اب تیرے سوا میرا کوئی نہیں"۔

ان کی ایک عادت یہ تھی کہ محبوب عزیز گزر جاتا، کچھ عرصے تک تو اس کی باتیں کرتے، دوسروں کو اس کی خوبیاں بتاتے۔ اور اس طرح ڈھارس بندھاتے۔ مگر غم کی پہلی رَو گذرنے کے بعد اسے سینے کے گنجینے میں محفوظ کر لیتے۔ میں جب بھی اظہر، صابرہ، بھابی جان یا باجی کا ذکر چھیڑتی (کہ مجھ کم نصیب کو جانے والوں کی یاد کے ساتھ ان کے ذکر سے بھی ڈھارس ہوتی ہے) تو ان کے ہونٹ مضبوطی سے بند ہو جاتے آنکھیں غم کی خاموش جھیلیں بن جاتیں۔ اگر ذکر کرنا ہی پڑ جائے تو نہ آواز کانپتی، نہ آنسو گرتے۔ مگر ان کے چہرے سے اور سارے انداز سے یہ معلوم ہوتا کہ جی جان کی ساری قوت سے اشک کے سیلاب کو روکے ہوئے ہیں۔ مگر ذاکر صاحب کا ذکر بہت کرتے تھے۔ کوئی دن نہ جاتا کہ درد، محبت اور احترام کے ساتھ اپنے اس محبوب دوست کو یاد نہ کرتے ہوں۔ اکثر کہتے "میں نے تو یہ گھر ان کے گھر کے سامنے اسی لئے بنایا تھا کہ ان سے رفاقت کی دولت حاصل رہے گی ..."

غم کی شدت کے ساتھ برداشت کی یہ انتہا میں نے انھیں میں دیکھی۔ کیا اسی کو صبرِ جمیل نہیں کہا جاتا؟

مگر اس دلِ درد مند پر صرف خاندانی مصیبتوں اور پریشانیوں ہی کا اثر نہ پڑتا تھا۔ بلکہ ہر دوست اور جاننے والے کا غم ان کا اپنا غم تھا۔ کسی بھی ان کے دوست یا دور دراز کے عزیز کے انتقال کی خبر آتی تو ہم سب اس پریشانی میں مبتلا ہو جاتے کہ سیدین صاحب کو کیسے بتایا جائے؟ اور سن کر ان پر کیا اثر ہوگا؟ کافی دنوں وہ اس صدمے سے نڈھال رہتے۔ اور یہی کیوں۔؟

قوم اور ملک کے آلام و مصائب سے بھی اتنا ہی متاثر ہوتے تھے۔
بلکہ دنیائے انسانیت کے ہر حصے کے دکھ پر تڑپ اٹھتے تھے۔
صحیح معنی میں یہ شعر ان کی حالت کا ترجمان ہے!

چیست انسانی طپیدن از غمِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمان شدن

نفس سادہ اور منضبط زندگی

سیدین صاحب بچپن ہی سے دبلے پتلے اور کم خوراک تھے۔ صحت عام طور پر اچھی رہتی تھی۔ انھوں نے شروع سے ضبط و نظم کی زندگی اختیار کی تھی۔ کم کھاتے تھے، وقت پر سوتے تھے۔ ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ پان، تمباکو، سگریٹ حد یہ کہ چھالیہ یا الائچی تک سخت ناپسند تھی۔ چائے کا البتہ شوق تھا۔ مگر بھابی جان کے ہاتھ کی بنائی چائے کے سوا کوئی چائے پسند نہ آتی تھی۔ ان کے بعد زندگی کی بڑی خوشیوں کے ساتھ ساتھ ایسی چھوٹی راحتیں بھی ان سے چھن گئی تھیں۔ مگر حرف شکایت شاذ و نادر ہی ان کی زبان پر آتا تھا۔ کافی بہت بعد میں، کبھی کبھار پینے لگے تھے۔ اور کچھ پینے پلانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ لہو و لعب سے عام طور پر پرہیز کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار اچھا فلم یا اچھا ڈراما دیکھ لیتے تھے کبھی کسی میوزک فنکشن میں بھی چلے جاتے۔ موسیقی، مصوری وغیرہ کا ذوق تھا۔ مگر اتنا شوق نہ تھا کہ لکھنے پڑھنے کے شغل کو تج کر ان چیزوں پر وقت صرف کریں۔ البتہ بھابی کی خاطر چلے جاتے تھے۔ مشاعرہ اگر بہت اچھا ہو تو شوق سے شرکت کرتے تھے۔ بعد میں ریڈیو پر ہی سننے پر اکتفا

کرنے لگے تھے۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرتے تھے۔ چھوٹے بھائی اظہر عباس جب ان کے ساتھ رہتے اور بھابی جان جب تک زندہ رہیں، چپکے چپکے ان کے سب کام کرتے رہتے۔ مگر بھائی جان کو یہ پسند نہ آتا۔ کہتے تھے کہ تم لوگ میری عادت خراب نہ کرو۔ سحر خیزی کی عادت تھی۔ دیر سے بھی سوتے تو سویرے اٹھتے، نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر کبھی کبھی ٹہلنے جاتے تھے۔ بعد میں جب دل کے مرض کی وجہ سے اور سب ورزشیں منع ہو گئی تھیں تو صبح کو کم، مگر شام کو اکثر گھنٹے آدھ گھنٹے ضرور ٹہلتے تھے۔ کھانے کے اوقات کی بھی پابندی کرتے تھے۔ جو لڑکیاں دیر سے اٹھتیں اور ان کی وجہ سے ناشتہ دیر سے ہوتا اس سے الجھتے تھے۔ مگر ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ سارا خاندان اکٹھا ناشتہ کرے۔ ہمیشہ سے ناشتہ کی میز پر ان کی طبیعت بڑی حاضر رہا کرتی تھی علی گڑھ میں ہم سب کی یہ کوشش رہا کرتی کہ ناشتہ اس وقت تک نہ کریں جب تک بھائی جان موجود نہ ہوں۔ بعد میں یہی حال کشمیر، رام پور، بمبئی اور پھر دہلی میں رہا۔ ناشتہ کی میز پر ان کی ذات ایک بے بہا نعمت تھی۔ ان کی دل چسپ گفتگو، لطیفے، دوسروں پر فقرے، مخصوص انداز کی خاطر داری۔ اپنے توس، انڈے، عرق یا پھل میں سے بچوں اور دوسرے لوگوں کو اصرار کر کے ذرا ذرا سا کھلانا پلانا (ذرا سا اس لئے کہ وہ کھاتے ہی ذرا سا تھے) اس صحبت کو بڑا دلکش بنا دیتا تھا۔ بڑے اطمینان اور سکون سے تھوڑا تھوڑا کھاتے اور کافی وقت ناشتہ کی میز پر صرف ہوتا۔

خدا نے انھیں شگفتہ مزاجی اور اطمینانِ قلب کی نعمتیں بخشی تھیں۔

مگر دو کمزوریاں ایسی تھیں جن کی وجہ سے پینتالیس کی عمر میں دل کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ایک تو حد سے زیادہ حساس تھے۔ دوسرے بے حد کام کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے روح فرسا حادثات کا انھوں نے بہت اثر لیا تھا۔ اپنے وطن پانی پت کی تباہی کا، دہلی میں جو حادثات پیش آئے، ان کا، اور پھر ان کے خاندان پر جو پریشانیاں گذریں، ان سب کا بہت صدمہ تھا۔ اس زمانے میں جو افرادِ خاندان پانی پت سے پاکستان نہیں گئے تھے وہ سب ان کے گھر پونا آگئے تھے۔ اور وہ ہر وقت ان کی دل داری، دل جوئی کرتے اور ان سے دلچسپ باتیں کر کے غم کو بھلانے میں مدد دیتے۔ پھر گاندھی جی کی شہادت ہوئی تو یوں تو ہمارے خاندان کے سبھی لوگوں پر گہرا اثر تھا اور سیدین صاحب کے تو مہاتما جی سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ اور ان کے حکم پر بہت کام کیا تھا، اکثر ان کے ہاں گئے تھے۔ کئی کئی دن ان کے ساتھ رہے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کا صدمہ بہت سخت تھا۔ پھر اسی زمانے میں کئی سال تک ان کی بیوی برابر بیمار رہیں۔ اور خود انھیں بھی بمبئی کی آب و ہوا موافق نہ تھی۔ ادھر خاندان میں کچھ ایسے واقعات و حادثات ہوئے جن کا ان کو بڑا قلق تھا۔ اور عادت یہ تھی کہ جتنا پریشان ہوتے اپنے کام میں محو ہو کر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جتنی فکریں اور پریشانیاں بڑھیں اتنا ہی ان کا کام بڑھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں ان پر قلب کا شدید دورہ پڑ گیا۔ اس وقت ان کا دفتر بمبئی میں چوتھی یا پانچویں منزل پر تھا، اور

سیدین صاحب روزانہ وقت سے پہلے دفتر چلے جاتے اور لفٹ مین نہ ہوتا، یاگپ شپ کر رہا ہوتا تو بغیر اس" بچارے" کو زحمت دیے بلاتکلف سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ جاتے۔ دو دن سے انھیں تکلیف تھی۔ مگر کچھ سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہے اور اس حال میں بھی چار چار زینے چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ دل میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر آئے، نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ رام پور، دہلی اور علی گڑھ سے خاندان کے بہت سے لوگ پہنچ گئے۔ بچنے کی اس وقت بہت کم امید تھی۔ بہت سے دوست اور عزیز مضطر و پریشان صبح سے شام تک نرسنگ ہوم میں آتے رہتے تھے۔ بیگم سیدین، اظہر عباس اور احمد عباس دن رات تیمارداری کر رہے تھے۔ مگر چاہنے والے خیرخواہوں کی ہر وقت آمد و رفت کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ دو چار روز بعد ہم لوگ پہنچے۔ عابد صاحب نے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق سختی سے لوگوں کے آنے جانے پر بندش لگائی۔

دل کے مرض پر اس وقت بھی بہت خرچ ہوتا تھا اور بہترین نرسنگ ہوم میں ان کا علاج ہو رہا تھا۔ اس وقت سیدین صاحب کے پاس اندوختہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کے دو تین دوستوں نے پیسہ کی پیش کش کی۔ مگر شکریہ ادا کر کے انکار کر دیا گیا۔ البتہ اظہر، مجی، اور میرے پاس جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ بھابی جان کو پیش کر دیا۔ سیدین صاحب کا یہ حال تھا کہ جو ان کے پاس جاتا ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دلاسا دیتے اور آنکھوں سے کچھ آنسو، چپکے سے لڑھک کر تکیہ میں جذب

ہو جاتے۔ انہیں اپنی جان کی پروا نہ تھی۔ مگر جانتے تھے کہ عزیز بہنیں، بھائی اور بچیاں، یہ سب ان پر جان دیتے ہیں ان کی فکر ضرور تھی۔ میں اور باجی جب پہنچے تو سینے سے لگا کر بے اختیار رو پڑے۔ باجی کی خود حالت تباہ تھی۔ مگر میں نے کلیجہ پتھر کا کر لیا اور مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کیں لیکن عابد صاحب نے ہم کو بھی زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیا۔ جب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی اور فوری خطرہ ٹل گیا تو فطری خوش طبعی عود کر آئی۔ بولنے کی اجازت نہ تھی مگر پنسل کاغذ پاس رکھا رہتا تھا لکھ لکھ کر باتیں کرتے لوگوں کے بارے میں ان کی طبیعت، مزاج، کام وغیرہ کی مناسبت سے اقبال، غالب یا حالی کا کوئی شعر لکھتے اور شعر کی زبان میں ان کا شکریہ ادا کرتے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں سے وہ پورا تعاون کرتے رہتے۔ ڈاکٹروں سے تو ہمیشہ ہی گہری دوستی ہو جاتی تھی۔ نرسوں کی خدمت کی، باتوں کی، صورت کی، آواز کی، اپنے مخصوص انداز میں اس طرح تعریف کرتے کہ ہر نرس ان کا کلمہ پڑھنے لگتی تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کرنا اور سخت سے سخت پرہیز کرنا، ان کو کیسا ہی کھلتا، مگر صبر کے ساتھ اس کی پابندی کرتے تھے۔ آخر میں دو سال میں کھانے میں نمک تقریباً بند رہا۔ بے نمک کا کھانا انہیں پھُس لگتا تھا اور اپنے کھلنڈرے انداز میں اُسے کہتے بھی "پھُس" تھے۔ اکثر کہتے "جب نمک کی نمکینی جاتی رہے تو دنیا میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔" مگر بد پرہیزی کبھی نہیں کرتے تھے۔ آخر میں ان کے لئے روزانہ دو تین گلاس عرق پینا بہت ضروری بتایا گیا تھا۔ مگر اپنی ذات پر یوں خرچ ہونا، اور خاص اہتمام ان کو کھلتا تھا۔ "بس یہ تُزک نہ لگایا کرو!۔"

اکثر کہتے اور جب پیتے بھی تو جو بھی پاس ہوتا دو چار گھونٹ زبردستی اس کو بھی پلا دیئے جاتے۔ پہلے دورے کے بعد چار مہینے تک ڈاکٹر کرم علی نے پلنگ پر لٹائے رکھا تھا کہ اس وقت تھرمبوسس کی وہ زود اثر دوائیں نہ نکلی تھیں جو بعد میں دریافت ہوئیں۔ نرسنگ ہوم میں کوئی دو مہینے رہنے کے بعد انھوں نے اپنے دفتر ہی میں ایک کمرے کا انتظام کرا لیا تھا۔ اور لیٹے لیٹے ہی اپنا سب کام انجام دیتے رہے۔ بھابی جان وہاں ان کے پاس رہتیں اور نرسنگ کرتیں۔ کچھ عرصہ پرائیویٹ نرس رہی۔ مگر سیدین صاحب کو جو آرام بیگم سیدین کے کام سے ملتا تھا وہ اور کسی سے نہیں اس لئے نرس ہٹا دی گئی۔ ایک فکر جس کو وہ کہتے نہ تھے یہ تھی کہ "اتنا خرچ ہو رہا ہے"۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب قرض لے کر کیا جا رہا ہے۔ تندرست ہونے کے بعد انھوں نے سب کے قرضے پائی پائی ادا کر دیے۔

میں نے بہت سے دل کے مریضوں کو دیکھا ہے جو زندگی سے، دنیا سے، لوگوں سے، اپنی ذات سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ صحت سے مایوس ہو کر، ہر وقت جیسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یا تو بد پرہیزیاں کرتے ہیں کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ یا حد سے زیادہ پرہیز اور احتیاط کرتے ہیں جو اور زیادہ مضر چیز ہے۔ ہر کام سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور ہر دم اپنی بیماری کا رونا روتے رہتے ہیں۔ بہت کم — بہت ہی کم ان میں ایسے ہوتے ہیں جو نارمل یا قریب قریب نارمل زندگی بسر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ لیکن سیدین صاحب نہ کبھی بیماری میں مایوس ہوئے، نہ ان کی قوت عمل میں کوئی فرق آیا۔ ۵۰ء کے بعد بائیس سال انھوں نے زندگی کے ہر لمحہ کو خدا کی بخشی نعمت

سمجھا جو انہیں اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش اور اس کے بندوں کی خدمت کرنے کے لئے عطا کی گئی ہے۔ اور یہ فرض وہ آخری دم تک صحت مند، اولوالعزم جوانوں کی سی ہمت سے ادا کرتے رہے۔ مزاج میں کبھی تلخی نہیں آئی موت کا خوف تو جیسے انہیں تھا ہی نہیں۔ اس بائیس سال میں سیدین صاحب نے ادبی، علمی، تعلیمی دنیا میں جو عظیم کام انجام دیے ہیں اس کو ابھی ہماری ہندوستانی قوم پہچان نہیں پائی ہے!

سنہ ۵۰ء کی بیماری کی اگرچہ خود سیدین صاحب نے پروا نہیں کی مگر ان کے عزیزوں، خاص کر ان کی بیوی نے، اپنی بقیہ زندگی اس کوشش کے لئے صرف کر دی کہ وہ صحت مند رہیں۔ خود سیدین صاحب ان "بے جا تکلفات" سے بہت الجھتے تھے۔ مگر بھابی جان کی خاطر اکثر باتیں مان لیتے تھے۔ اب وہ حد سے زیادہ کام اور بہت زیادہ سفر نہ کرتے تھے۔ دوپہر کو تھوڑا آرام بھی ضرور کرتے۔ مگر سنہ ۶۳ء میں بھابی جان کے انتقال کے بعد انھوں نے صحت کی اتنی پروا کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ ان کی بیٹیاں، عابد صاحب اور دوسرے عزیز ان کے دوا علاج کی، ان کو آرام پہنچانے کی اور خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے مگر ان کے دل کی دنیا اجڑ چکی تھی اور سکون اور راحت انہیں بس کام ہی میں ملتی تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ گوشہ نشین یا مردم بیزار ہو گئے تھے۔ نہیں عزیزوں سے محبت اور اس کا عملی اظہار کچھ اور زیادہ بڑھ گیا تھا کہ وہ "عزیز" کی کمی بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں کی خاطر مدارات میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا، لین دین، تحفے، تحائف، شادی بیاہ اور غمی میں شرکت بڑی وضع داری سے نبھاتے تھے اور ان

"فرائض" سے اگر کوئی انھیں روکتا کہ آپ پر "اسٹرین" پڑے گا تو انھیں ناگوار ہوتا اور یہ بات مانتے نہ تھے۔

دل کے اس دورے کے بعد کئی سال وہ ٹھیک رہے۔ پھر کافی عرصے کے وقفے سے کئی ہلکے دورے پڑے۔ ایک خاصہ سخت حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ میں ہوا جب وہ کانوکیشن میں شرکت کرنے کے لئے گئے ہوئے ہوئے تھے۔ یا تو حسب عادت پہچان نہ سکے کہ دل کی تکلیف ہے یا دوسروں کو پریشان نہ کرنا چاہا۔ آخر تک جلسے میں بیٹھے رہے۔ باجی کے گھر آئے تو تکلیف بڑھ گئی۔ سات ہفتے علی گڑھ میں صاحب فراش رہے۔ اور اس دوران ان کی بہن، بھانجیوں، دوسرے عزیزوں اور علی گڑھ کے دوستوں، ساتھیوں، ڈاکٹروں، شاگردوں نے جس خلوص و محبت کا سلوک کیا جس طرح ان کے دوا علاج، تیمارداری اور خدمت میں جان لڑادی اس کا ان کے دل پر بڑا اثر تھا اور وہ سبھی کے بے حد ممنون تھے۔ چھ ہفتے بعد ان کو کسی طرح دہلی لایا گیا۔ وہاں چند ہفتے گھر پر آرام کیا۔ اور ڈھائی تین مہینے کے بعد پھر اپنا کام سنبھال لیا۔ پھر اسی لگن سے کام میں جٹ گئے۔ ان کی بیماری کا تذکرہ اسی ضمن میں ذرا تفصیل سے میں نے کیا ہے کہ اس سے ان کے ضبط و توازن طبیعت کا زیادہ اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ضبط و توازن سیدین کی شخصیت کا جوہر تھا۔ جس طرح دکھ تکلیف، غم و الم میں صبر و ضبط سے کام لیتے تھے، اس طرح خوشی میں بھی وہ آپے سے باہر نہ ہوتے تھے۔ قہقہہ لگاتے شاید ہی کبھی کسی نے انھیں سنا ہو۔ جوش و خروش کے ساتھ اظہار مسرت یا ناراضگی وہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غصے میں آواز ذرا بلند ہو جائے مگر کوئی ناشائستہ

لفظ منھ سے کبھی نہیں نکلا۔ خوش ہوتے تو چہرہ ایک دل نشیں تبسم سے پھول کی طرح کھل جاتا اور ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگتی۔ کسی بات سے محظوظ ہوتے تو آنکھوں میں چمک پہلے، ہونٹوں پر مسکراہٹ بعد میں۔ دراصل کسی بھی جذبے کے اظہار میں شدت ان کی فطرت کے منافی تھی۔ وہ متانت اور وقار کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

سیدین کا گھر

سیدین صاحب کا گھر جیسا میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے، دوستوں عزیزوں، جانے ان جانے مہمانوں، سب کا گھر تھا۔ ان کے دل اور گھر کے دروازے سب کے لئے وا رہتے تھے۔ یہ گھر علی گڑھ، سری نگر، رامپور پونا، بمبئی اور آخر میں برسوں دلّی میں مہمان خانہ رہا۔ مہمان نوازی میں سیدین صاحب سے بھی زیادہ بیگم سیدین کا ہاتھ تھا یہ ان کے خاص شوق کی چیز تھی۔ سیدین صاحب کے مہمانوں میں دیسی بدیسی حیثیت والے، صاحبانِ علم اور اہلِ دل بھی ہوتے تھے اور سیدھے سادے غریب بھی۔ نوکروں اور مصاحب قسم کے لوگ اور ان کے گھر والے بھی مستقل مہمان بھی اور عارضی بھی۔ پہلے کئی برس علی گڑھ میں وہ کرایہ کی کوٹھیوں میں رہے۔ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ میں انھوں نے ایک مکان بنوایا تھا "عزیز جہاں منزل" سستا زمانہ تھا اور چودہ پندرہ چھوٹے بڑے کمروں اور تین چار برآمدوں اور وسیع صحن اور چبوترے دباغ والا یہ خوب صورت مکان تقریباً بیس ہزار میں تیار ہوگیا تھا۔ مگر سیدین صاحب کے پاس اس وقت روپیہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ قرض لیا، کچھ اور انتظام ہوا،

اور سید تجمل حسین مرحوم نے جوان کے بڑے بھائی کی طرح تھے، دن رات ایک کر کے مکان مکمل کرایا۔ اور میری شادی سے آٹھ دن پہلے سب اس مکان میں اُٹھ آئے۔ بعد میں اس میں اور اضافہ ہوتا رہا۔ مکان جتنا وسیع تھا اتنا ہی آرام دہ بھی تھا اگرچہ سیدین صاحب کے وسیع تعلقات اور بیگم سیدین کی مہمان نوازی کی بدولت کبھی کبھی یہ بھی چھوٹا پڑ جاتا۔ لیکن اس مکان میں وہ زیادہ عرصے نہ رہ سکے۔ ۱۹۳۸ء میں جب وہ کشمیر چلے گئے تو اس کو کرایہ پر اٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد سے تقریباً وہ ساری عمر، ہر جگہ، کرایہ کے مکانوں میں رہے۔ وسیع خوبصورت آرام دہ کوٹھیوں میں جس میں ان دونوں میاں بیوی کے حصّے میں بس ایک بڑا روم آتا تھا۔ باقی سب کمرے، ڈرائنگ روم اور کبھی کبھی ڈریسنگ روم اور ڈائننگ روم تک، عزیزوں اور دوسرے مہمانوں سے بھرے رہتے تھے۔ پانی پت میں ہمارے کئی مکان تھے۔ ان میں سے ایک باجی کے، ایک میرے، اور ایک چھوٹے بھائی کے حصّے میں لگا دیا گیا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان سیدین صاحب نے اپنے لئے رکھا تھا اور سارے خاندان کی خواہش کے مطابق اس کو نئے سرے سے بنوا کر اپنے وطن میں ایک ایسا گھر بنوانا چاہتے تھے جہاں کبھی کبھی آ کر ٹھہر سکیں اور ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مستقل قیام کریں لیکن ۱۹۴۷ء میں "ہمارا" پانی پت ہی ختم ہو گیا اور ہم وطن ہی میں بے وطن ہو کر رہ گئے۔

سیدین صاحب کے دہلی آنے کے بعد بھابی جان کی بڑی خواہش تھی کہ جامعہ نگر میں مصداق کے گھر کے برابر مکان بنے۔ سیدین صاحب نے بھی اس خیال کو پسند کیا اور کئی سال کی کوشش کے بعد، میرے گھر کے برابر

اور ذاکر صاحب کے گھر کے سامنے، ان کو زمین مل سکی۔ اس وقت بھی ان کے پاس نقد روپیہ نہ تھا۔ بھابھی جان کے اصرار پر انھوں نے علی گڑھ کا مکان فروخت کر دیا۔ یہ مکان اب ستر پچھتر ہزار سے زیادہ کا ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ بہت سی زمین اور باغ بھی تھا۔ مگر یونیورسٹی نے اسے بتیس ہزار میں خریدا۔ اور سیدین صاحب نے چپ چاپ وہ رقم منظور کر لی۔ اور حاسد بدگمان لوگوں نے اس پر الزام لگایا کہ انھوں نے اپنے اثر سے کام لے کر یونیورسٹی کے ہاتھ زیادہ قیمت پر بیچا ہے۔ اور کچھ عرصے بعد بھابی جان نے اپنی نینی تال کی کوٹھی بھی فروخت کر دی تاکہ دہلی میں مکان بن سکے۔ کاش کہ اس وقت دہلی میں مکان بن جاتا تو روپیہ بھی کم صرف ہوتا، بیگم سیدین کی آرزو بھی پوری ہوتی اور بعد میں سیدین صاحب نے جو تکلیفیں اپنا ذاتی مکان نہ ہونے کی وجہ سے اٹھائیں، وہ نہ اٹھاتے۔ مگر وقت گزرتا رہا اور مکان نہ بنا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو اس ذمہ داری کو پوری طرح اپنے سر لے۔ بیگم سیدین کا انتقال ہوگیا، کئی سال سیدین صاحب باہر کے ملکوں میں آتے جاتے رہے اور مکان کا بننا ملتوی ہوتا رہا۔ جب ۱۹۶۶ء میں وہ دہلی میں ایشین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے تو مکان بنوانے کی پھر سے کوشش شروع ہوئی۔ ایک بڑے آرکیٹکٹ سے نقشہ بنوایا گیا۔ ایک ٹھیکیدار کو ٹھیکہ دیا گیا۔ ان دونوں کاموں میں بھی برس لگ گئے۔ اور جب مکان بننا شروع ہوا تو اول تو ان کی بیٹی نے بارہا نقشہ میں ترمیم و تنسیخ کی۔ پھر ان کے ایک دوست اور کاروباری مشیر نے جو خود

ان کاموں کا تجربہ رکھتے تھے۔ مکان کے نقشے میں کچھ نقص نکالے اور تبدیلی کا مشورہ دیا۔ اس پر آرکی ٹکٹ بگڑ گئے اور ان کے دوست سے تیز تیز باتیں کیں۔ سیدین صاحب کو بھلا یہ کہاں گوارا تھا۔ انھوں نے بڑی شائستگی سے ایک سخت خط آرکی ٹکٹ کو لکھا کہ آپ اس سلسلے میں زحمت نہ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھیکیدار پر کوئی بندش اور دباؤ نہ رہا اور ان کے مکان کی تعمیر میں ہر ممکن تاخیر، پریشانی اور گڑبڑ ہوتی رہی۔ اس سے بنوانے والوں کی ناتجربہ کاری، صاحبِ مکان کی ناواقفیت اور بنانے والے کی "عنایت" سبھی کا دخل تھا۔ تاخیر ہونے کی وجہ سے قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ اور خرچ اسٹی میٹ سے زیادہ ہوا۔ ٹھیکیدار کیوں نقصان اٹھاتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ سیدین صاحب کو کئی برس پریشان رہنا پڑا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی تکلیفیں اٹھائیں۔ مکان پر خرچہ بھی بہت زیادہ ہوا اور جیسا مکان وہ چاہتے تھے ویسا بن بھی نہ سکا۔ میں نے زندگی میں کسی شخص کی طرف سے ان کے دل میں غصہ، شکایت اور تلخی دیکھی تو اس مکان کے سلسلے میں ستانے والے کی طرف سے۔ جتنا اس کا قصور تھا وہ اس سے بھی زیادہ اس کو ملزم سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ خود تو کاروباری معاملات کو سمجھتے نہیں تھے۔ جو کچھ کوئی کہہ دیتا اسے صحیح مان لیتے۔ اور جو لوگ واقعی صورتِ حال بتاتے، ان سے کچھ کہتے تو نہ تھے۔ مگر انھیں ناگوار ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے ان سے یہ کہا کہ آپ مقدمہ دائر کر دیجئے اور وہ اس پر تیار بھی ہو گئے۔ حالانکہ مقدمہ بازی اور سیدین میں بُعدالمشرقین تھا۔ شکر ہے کہ وہ ہم لوگوں کے سمجھانے کی وجہ سے اس چکر میں نہیں پھنسے۔

جولائی ۱۹۶۹ء میں وہ امریکہ سے واپس آئے تو ان کا مکان بن چکا تھا اور وہ چند دن میرے ہاں رہ کر اپنے گھر میں بس گئے۔ ان کی منجھلی لڑکی بلقیس اور اس کے بال بچے بھی ان کے پاس آگئے۔ پھر دوسری لڑکی زہرا بھی آگئی۔ سیدین صاحب جب کہیں جاتے اپنے گھر کے لئے خوبصورت آرٹسٹک چیزیں لایا کرتے تھے۔ چینی کے برتن، لیمپ، بجلی کے شیڈ، چھوٹی بڑی خوبصورت میزیں، شیشے اور چینی کے گلدان اور دوسری چیزیں، تصویروں کا بھی شوق تھا۔ اس میں مشہور مصوروں کے شاہکار کم تھے اور دوست آرٹسٹوں کی محبت کی نشانیاں زیادہ۔ پہلی بار اپنے ذاتی گھر کو انھوں نے آراستہ پیراستہ دیکھا۔ لڑکیوں نے جی جان سے اسے سجایا بنایا۔ باغ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ وہ خود باغبانی یا گھر کی آرائش کا کام کرنا نہیں جانتے تھے۔ مگر ان میں ذوق جمال تھا۔ کیسے کیسے وہ ایک ایک پودے، ایک ایک پھول، ایک ایک بیل کو پنپتے دیکھ کر خوش ہوتے، دوسروں کو دکھلاتے۔ زیدی صاحب جو اس فن کے عاشق ہیں ان سے مدد لیتے، مشورہ مانگتے۔ ان کی صحت خراب ہوگئی۔ تب بھی اس گھر کو بنانے سجانے اور باغ لگانے اور بڑھانے کی لگن میں فرق نہیں آیا۔ عزیزوں اور دوستوں کو بلا کر مہمان رکھتے رہے، دعوتیں ہوتی رہیں۔ وہ اس گھر کو اپنے ہی لئے نہیں اپنے خاندان اور دوستوں کے لئے بھی امن و راحت کا مسکن بنانا چاہتے تھے مگر جب بلبل نے چمن سے آشیانہ اٹھا لیا تو اب یہ گھر ان کے چاہنے والوں کے لئے حسرت کدہ بن کر رہ گیا ہے۔

بیرونی ملکوں کے سفر

سیدین صاحب نے یورپ کا پہلا سفر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انیس بیس سال کی عمر میں کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایشیا، یورپ، آسٹریلیا، امریکہ، افریقہ سبھی براعظموں کے کئی درجن سفر کئے مگر ان میں سے ایک کے سوا کوئی سفر بھی محض سیر و سیاحت کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ یا تو دوسرے ملکوں کی حکومتیں انھیں اپنے ہاں تعلیم کی تنظیم نو کے لئے بلاتی تھیں یا یونیورسٹیاں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ یونسکو کی کئی کمیٹیوں کے وہ ممبر تھے۔ اور اس میں شرکت کے لئے بھی جاتے تھے۔ ہندوستان کا تو کوئی صوبہ بلکہ کوئی قابل ذکر شہر نہ ہوگا جہاں وہ سرکاری دورے یا توسیعی خطبات وغیرہ کے لئے نہ گئے ہوں۔

جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، ہندوستان سے باہر کا پہلا سفر انھوں نے ۱۹۲۳ء میں انگلستان کا کیا تھا۔ وہاں لیڈز یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔ ایڈ کی ڈگری دو سال میں حاصل کی۔ اس عرصے میں وظیفے میں سے پیسے بچا بچا کر چھٹیوں میں یورپ کے کئی ملکوں کی سیر بھی کی۔ اس کے بعد ۲۹ء میں اپنے

بچا اور اپنے دوست زیدی صاحب کے ساتھ ایران و عراق گئے۔ یہ سفر سیر و سیاحت اور مقامات مقدسہ کی زیارات کی خاطر کیا گیا تھا۔ پہلا سفر سمندر کے راستے اور دوسرا خشکی کے راستے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جتنے سفر کئے وہ سب ہوائی جہاز سے۔ ایک بار اسٹریلیا گئے۔ متعدد بار یورپ، امریکہ اور کنیڈا گئے۔ اسلامی ملکوں میں مصر، سوڈان، عراق، ایران، لبنان، دمشق سعودی عرب۔ اور مشرقی ایشیا میں چین، جاپان، فلپین، تھائی لینڈ، ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور وغیرہ کا سفر کیا۔ یورپ میں جرمنی، فرانس، ہالینڈ، اسپین، ناروے، سوئیڈن، ڈنمارک، بلجیم اٹلی وغیرہ۔ روس اور کئی اور کمیونسٹ ملکوں کا سفر بھی کیا۔ امریکہ، کنیڈا اور انگلستان کئی بار گئے۔ انھیں قدرتی مناظر اور تاریخی آثار کے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ جہاں بھی جاتے کام سے فرصت پاکر قابل دید مقامات اور مناظر کی سیر سے لطف اٹھاتے۔ مگر ان کی دل چسپی صرف بے جان مناظر، عمارات اور عجائبات تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ہر جگہ کے لوگوں سے ملنے جلنے، ان کے مزاج، خیالات اور رہن سہن کو دیکھنے اور سمجھنے کا بھی خاص اہتمام کرتے تھے۔ جہاں بھی جاتے وہاں کے باشندوں میں جلد گھل مل جاتے تھے۔ ہر جگہ لوگ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ان میں کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ بہت جلد اجنبیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ہر مقام سے وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خطوط بھیجتے تھے، چھوٹے بڑے تحفے ان کے لئے لاتے تھے۔ جس میں اس جگہ کی خصوصیات اور وہاں کے لوگوں کے سبھاؤ اور برتاؤ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اکثر روزنامچہ یا یادداشتیں بھی لکھتے تھے۔ ان کی ایسی متعدد ڈائریاں ان کے کاغذات میں ملی ہیں جس میں انھوں نے کسی نہ کسی سفر کے حالات لکھے ہیں بعض مکمل ہیں لیکن اکثر نامکمل۔

انھوں نے اپنی خود نوشت میں ایک باب کا عنوان رکھا تھا "دنیا میرا گاؤں ہے"۔ یہ حقیقت ہے کہ ساری دنیا ہی کو وہ اپنا وطن سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہر ملک کی اچھائیوں اور برائیوں کو غیر جانب داری سے دیکھا، پرکھا اور ان کا تجزیہ کرکے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ساری نوعِ انسانی ایک برادری ہے۔ اور انسانیت کے اس وسیع نظریہ پر ان کا ایمان تھا کہ ملک، رنگ، نسل، مذہب اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں۔ اسلام نے سیر و سیاحت کی بڑی تاکید کی ہے کہ انسان اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ سیدین صاحب کے دل میں جو وسعت، دماغ میں جو روشنی اور خیالات میں جو گہرائی تھی اس میں دنیا کی اس سیر و سیاحت کا بھی بڑا حصہ ہے۔

سیدین کا مذہب

سیدین صاحب ایک دین دار مسلمان تھے۔ اسلام کی محبت ان کو ورثے میں ملی تھی لیکن ان کا مذہب صرف ورثہ نہ تھا۔ انھوں نے خود اسلام کا گہرا مطالعہ اور اس پر غور و خوض کیا تھا۔ قرآن پاک کو انھوں نے عربی میں بھی پڑھا تھا اور ساتھ ہی اس کے ترجمے انگریزی اور اردو میں بار بار پڑھے تھے۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن خصوصاً تفسیر سورۂ فاتحہ کے وہ بہت دلدادہ اور معترف تھے اور یہ دونوں ہمیشہ ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ تفسیر سورۂ فاتحہ کے ایک بڑے حصّے کا انھوں نے انگلش میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عبدالطیف صاحب نے پوری تفسیر کا ترجمہ کر لیا ہے تو پھر اُسے مکمل نہیں کیا۔ انھوں نے پیغمبر اسلام اور ائمہ معصومین کی سیرت اور تعلیم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ عمر بھر اسلام کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ علامہ اقبال کے والد کا یہ قول وہ اکثر دہرایا کرتے تھے کہ بیٹا قرآن کو اس طرح پڑھو گویا وہ تم پر نازل ہو رہا ہے، کلام الٰہی کو طوطے کی طرح رٹ لینا یا محض برکت کے لئے پڑھ لینا وہ کافی نہیں سمجھتے تھے صوم و صلوٰت اور دوسرے شعائر دین کی پوری طرح پابندی کرتے تھے۔

نوجوانی میں پہلی بار انگلینڈ گئے تو پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے رہے، جب کہ اس زمانہ میں لامذہب ہونا، دینی اعمال اور عقائد کو قدامت پرستی اور تنگ نظری سمجھنا، انگریزی تعلیم کا جزو سمجھا جانے لگا تھا۔ اس زمانے میں رمضان کا مہینہ گرمی میں آتا تھا جب دن تقریباً بیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ سیدین صاحب نے دو سال تک وہاں پابندی کے ساتھ بیس گھنٹے کے روزے رکھے۔ ان کی فرمائش پر لینڈ لیڈی رات کو، صبح کا ناشتہ ان کے کمرے میں رکھ دیا کرتی تھی اور وہ پچھلے پہر ٹھنڈا ناشتہ کر کے روزے کی نیت کر لیتے اور دن بھر سارے کام اسی طرح انجام دیتے رہتے۔ وہاں کے لوگ عام طور پر اس نوجوان کے مذہبی احساس کی گہرائی اور شخصیت کی مضبوطی کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے ہندوستانی اور مسلمان ساتھی مذاق اڑانے کی ہمت تو نہ کر سکتے مگر حیران ضرور ہوتے کہ نہ مولوی نہ ملّا۔ پھر یہ روشن خیال نوجوان اپنے مذہب کا اتنا پابند کیسے ہے؟ ۵۰ء میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں کے منع کرنے پر مجبوراً انہیں روزہ ترک کرنا پڑا تھا۔ مگر نماز کے آخر دم تک وہ اسی طرح پابند رہے اور کلام پاک کی تلاوت ان کا روزمرہ کا معمول رہا۔

انھوں نے مقامات مقدسہ کی زیارات بھی کی تھیں۔ حج تو نہیں کر سکے ہاں عمرہ کیا تھا۔ وہ سیرتِ رسول اور مجالسِ عزا کے جلسوں میں التزام کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ان کو اہل بیت سے بے انتہا عقیدت تھی۔ ہمارے ہاں پانی پت میں ۱۱ محرم کو ایک مردانی مجلس ہوا کرتی تھی جس کی دو خصوصیتیں تھیں۔ وہ ٹھیک وقت پر صبح آٹھ بجے شروع ہو جاتی تھی۔ جس میں سُنی

شیعہ، ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ پانچ چھ سو کا مجمع ہوتا۔ پہلے میرے والدان کے بعد خواجہ غلام الحسنین مرحوم اور سیدین صاحب تقریر کیا کرتے تھے۔ ان کی تقریریں تمام تر قرآن پاک کی تعلیم اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس مدرسہ ہی میں سب سے پہلے سیدین صاحب نے وسیع النظری کی تربیت پائی تھی۔ بعد میں انھوں نے سیرتِ رسولؐ اور امام حسینؑ پر مختلف جلسوں اور مجالس میں اور ریڈیو پر پچاسوں تقریریں کیں۔ ہر مکتبۂ خیال اور ہر مذہب کے لوگ ان تقریروں کو سراہتے تھے۔ اور ان سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ مگر مذہب سے شغف نے انہیں تنگ نظر نہیں بنایا تھا۔ وہ دوسرے مذاہب کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا نے ہر قوم، ہر ملک، ہر دور میں اپنے پیغامبر بھیجے ہیں۔ جنھوں نے لوگوں کو خدا پرستی، انسان دوستی، خدمت خلق اور نیکی اور سچّائی کی تعلیم دی ہے۔ بنیادی طور پر ہر مذہب میں حقیقت کا پرتو موجود ہے۔ اور یہ بھی فیض تنہا اسلام کی تعلیم اور قرآن پاک کے گہرے مطالعہ کا جس نے انہیں یہ سکھایا تھا کہ ہر دین میں سچائی موجود ہے گو اس کے پیرو اس سے ہٹ گئے ہوں۔ مسلمانوں کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ دوسرے مذاہب کو برا کہیں یا ان کے ماننے والوں سے عناد رکھیں یوں بھی ان کی زندگی میں ان کے تعلقات ہر مذہب کے لوگوں سے رہے۔ ان کے دوستوں کے وسیع حلقے میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی سبھی داخل تھے، بلکہ بعض دہریوں اور کمیونسٹوں سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ ایمان اور عقیدے کو دل کے اندر سے ابھرنے والی چیز سمجھتے تھے۔ اگر کوئی مذہب کو نہیں مانتا تو یہ اس کا اور

اس کے خالق کا معاملہ ہے۔ ہم باز پرس کرنے والے کون؟ وہ ایسے شخص پر رحم کھا سکتے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں اس کی غیر محسوس رہنمائی کر سکتے تھے لیکن اس سے بحث و مباحثہ کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ آج ان کے سوگواروں میں ہر ملک اور ہر مذہب اور ہر عقیدے اور خیال کے لوگ شامل ہیں۔

حبِ وطن اور انسان دوستی

سیدین صاحب کو اپنے وطن ہندوستان سے بڑی محبت تھی۔ اسلام سے عشق اور ہندوستان سے پریم، ان کے ہاں یہ دونوں جذبے آپس میں ٹکرانے والے نہ تھے۔ انھیں اپنے وطن کی زمین اور آسمان، پہاڑ و دریا، شہر اور گاؤں، اس کے قدرتی مناظر، موسم، پھول، پتے، پیڑ پودے... اس کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا۔ وہ علم و فن کی ان روایات پر نازاں تھے جن کا ہندوستان امین ہے۔ ان کے دل میں ان عارفوں کا بڑا احترام تھا جو اس خاک پاک سے پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنے ملک کو اور عالم انسانیت کو اپنی تعلیم اور مثال سے فیض پہنچایا۔ وہ رام چندر جی اور کرشن جی، مہاتما بدھ، گورو نانک، کبیر، حضرت خواجۂ اجمیر، حضرت نظام الدین اولیاء سبھی بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے دل میں مہاتما گاندھی، گورو دیو ٹیگور، مولانا آزاد، جواہر لال نہرو اور ذاکر حسین سے محبت اور ان کا احترام تھا۔ انہیں اس مشترک تہذیبی سرمایہ پر فخر تھا جس نے اس دیس کے باہمی تعاون اور محبت سے جنم لیا تھا اور جسے پہلے، بدیسی حاکموں کی پالیسی نے مٹانے کی کوشش کی اور اب دیش دشمن عناصر کر رہے ہیں۔

سیدین صاحب ابتدا ہی سے نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مقابلے میں نیشنلسٹ لیڈروں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی اسی وقت اپنے بعض ساتھیوں کی طرح سیدین صاحب کی بھی دلی خواہش تھی کہ وہ اس قومی ادارے میں آجائیں مگر ان کے بزرگوں نے اس بنا پر کہ سیدین صاحب اپنے خاندان کی کفالت کے ذمہ دار تھے اس کی مخالفت کی۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کو کسی یونیورسٹی میں داخلے کی امید نہ تھی اور نہ کہیں ایسی نوکری مل سکتی تھی کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کر سکتے۔ اس لئے ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ہمارے بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ہونہار نوجوان سول سروس میں جائے تو بہت ترقی کرے گا۔ سیدین صاحب کو بزرگوں کا حکم ماننے کی عادت بھی تھی اور اپنے خاندان کی ضرورتوں کا احساس بھی، اس لئے اس وقت خاموش ہو گئے۔ لیکن سول سروس کے مقابلے کے لئے امتحان میں نہیں بیٹھے۔ ان کا یہ عزم تھا کہ انگریز سرکار کی نوکری کسی حالت میں نہیں کریں گے۔ اور اس عزم پر خدا کے فضل سے وہ قائم رہے وہ دل سے قومی تحریک کے ساتھ تھے۔ ملازمت کا وقت آیا تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں کام شروع کیا۔ اور جب تک وہاں رہے۔ خاموشی کے ساتھ تعلیم کے میدان میں قومی خدمت انجام دیتے رہے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور ذاکر حسین ان کے ہیرو بھی تھے اور ذہنی طور پر سیاسی رہنما بھی۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کے لئے ذہن میں جو نقشہ بنایا تھا اس کو عمل میں لانے کے لئے سب سے زیادہ اور سب سے

خاموشی سے جس شخص نے کام کیا اسی کا نام تھا غلام السیدین۔ انھوں نے بنیادی تعلیم کی اسکیم بنائی اور پھر اس کو جموں اور کشمیر میں اور بعد میں اور ریاستوں میں مروج کیا اور کامیابی سے چلایا۔ آزادی کے بعد ان کو اور زیادہ وسیع میدان میں خدمت کا موقع ملا۔ وہ کبھی کانگرس کے ممبر نہیں رہے، مگر ان کی ہمدردیاں اور خدمات ہمیشہ تحریکِ آزادی کے لئے وقف رہیں۔ ان کو جمہوری سوشلزم پر عقیدہ تھا اور اسے ہندوستان کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہاں اس کا ان کو پورا احساس تھا کہ ابھی ہم اس راہ میں چیونٹی کی چال سے بڑھ رہے ہیں ــــ منزلِ مقصود بہت آگے ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہر سچے محبِ وطن کا فرض ہے۔ جوں جوں علم کی روشنی پھیلے گی اور ہندوستان کے کونے کونے میں ہر شخص اس سے فیض اٹھائے گا۔ یہ منزل قریب آتی جائے گی۔

مگر ان کے حُبِ وطن میں شدت پسندی اور تنگ نظری نہ تھی وہ ہندوستان کی کمزوریوں اور غلطیوں کو بھی محسوس کرتے تھے۔ اس پر تنقید اور نکتہ چینی بھی کرتے تھے لیکن اس میں غصہ یا نفرت، بیزاری یا مایوسی نہیں ہوتی تھی۔

ہندوستان سے پریم کے ساتھ انھیں ساری دنیا سے لگاؤ تھا۔ اور ساری نوعِ انسانی سے محبت۔ جیسا کہ میں نے گذشتہ باب میں لکھا ہے، انھوں نے سارے عالم کی سیر کی تھی، دنیا بھر کے لوگوں سے ملے تھے اور اس سے ان کا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا تھا کہ کل نوعِ انسانی ایک ہے۔ اور دنیا کو کبھی نہ کبھی حالی کے اس قول پر جو دراصل کلامِ الٰہی پر

ہمیں ہے ایمان لانا ہوگا ؎

کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

اس لئے بھی کہ سائینس کے معجزات نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ اور اب دنیا کے کسی کونے میں جنگ ہو یا سیلاب آئے، زلزلہ آئے یا کوئی اور حادثہ پیش ہو اس کا اثر ہر جگہ پڑتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں زیادہ تر اچھے اور انسان دوست لوگ ہیں۔ مگر طاقت اکثر جگہ خود غرض، بے اصول لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے جو دنیا میں جنگ کی آگ بھڑکا کر، یا دوسرے طریقوں سے کمزور قوموں کا اور کبھی خود اپنے ہی لوگوں کا استحصال کرتے اور ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

دنیا کے کسی حصے میں جنگ ہو رہی ہو سیدین صاحب کے دل کو اس سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ خواہ وہ ویٹ نام ہو یا فلسطین یا کوئی اور ملک۔ اسی طرح اپنے ملک کے اندر ہونے والے فسادات پر ان کا دل خون روتا تھا۔ مگر سب سے زیادہ جس جنگ کا ان کی روح پر صدمہ گذرا وہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی لڑائی اور اس سلسلے میں ہونے والے مظالم تھے۔ اس لئے کہ پاکستان سے جو کل تک ہندوستان ہی کا ایک حصہ تھا، انہیں کچھ کم لگاؤ نہ تھا۔ اگرچہ وہ ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ لیکن جب یہ تاریخی واقعہ ظہور میں آگیا تو انھوں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ حالانکہ اس کی وجہ سے ان کا وطن پانی پت ہمیشہ کے لئے ان سے چھوٹ گیا۔ ان کا وسیع خاندان بچھڑ گیا۔ سارے ہم وطن مسلمان سینکڑوں دوست پاکستان جانے پر مجبور ہوئے۔ ہندوستان میں صرف وہ اور ان کے بھائی بہن، دو چچا زاد بھائی

بہن اور دو خالہ زاد بہنیں رہ گئیں۔ ان لوگوں نے ہر قسم کی کٹھنائیاں جھیلیں، اُن کے گھر لُٹے جائیدادیں گئیں۔ مگر ہندوستان کو چھوڑنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ پانی پت ان سے چھُٹ گیا، مگر اب سارا ہندوستان ان کا وطن تھا۔

پاکستان کے عزیز اور دوست برسوں ان کو اور ان کے بھائیوں کو بہت اصرار سے بلاتے اور وہاں کی آسائشوں اور نعمتوں کا لالچ دیتے رہے۔ سب سے زیادہ اس معاملے میں اصرار سیدین صاحب ہی سے تھا۔ ان کے دوست احباب، عزیز، شاگرد، عقیدت مند سبھی چاہتے تھے کہ وہ پاکستان آجائیں۔ اس وقت کے ارباب اقتدار میں بھی ان کے قدرداں موجود تھے اور ان کو کوئی بڑا منصب ملنے کا اشارہ ان کی طرف سے بھی کیا گیا۔ یہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالا گیا کہ اس ابھرتے ہوئے اسلامی ملک کی تعلیمی خدمت کر کے وہ بڑا اہم دینی فرض ادا کریں گے۔ اس ضمن میں ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ ہماری منجھلی پھوپھی اپنے بھائیوں کی طرح اسلام کی عاشق تھیں بڑی ہی مذہبی دین دار بی بی۔ وہ اس دھوکے میں آگئی تھیں کہ اسلام کی اور مسلمانوں کی خدمت کے معنی پاکستان کی خدمت ہے اور ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کا دین و ایمان خطرے میں ہے۔ ان کو طعنے دیئے جاتے تھے کہ تمھارے بھتیجے "کافر ملک" میں (نقلِ کفر کفر نہ باشد) رہ گئے ہیں اور "ہندوؤں کی غلامی" کر رہے ہیں۔ شاید ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ انھوں نے سیدین صاحب کو ایک بڑا مفصل جذباتی خط لکھا جس میں یہ حوالے دیئے کہ تمھارے باپ اور چچا نے کس طرح

زندگی بھر اسلام کی اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے۔ تم بھی یہاں آجاؤ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کرو ـــــ وغیرہ وغیرہ۔ سیدین صاحب نے بڑے ادب اور محبت سے اس خط کا جواب دیا اور انہیں بہت کچھ سمجھایا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ پھوپھی اماں میرا مسلک تو انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔ اور اگر صرف مسلمانوں ہی کی خدمت کا سوال ہو تب بھی آپ ذرا سوچئے تو، وہاں تو بہت سے لوگ یہ نیک کام کرنے والے نکل آئیں گے، لیکن میں اور میرے جیسے دوسرے مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے آئیں تو یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کی خدمت کون کرے گا؟ کیا ان کی خدمت کرنا میرا فرض نہیں ہے؟ ان مرحومہ کی سمجھ میں فوراً یہ بات آگئی۔ اس کے بعد وہ بڑے فخر سے لوگوں سے کہا کرتیں۔ دیکھو میرے بھتیجے اپنا مفاد چھوڑ کر، دکھ اٹھا کر اپنے بھائیوں کی خدمت کا عزم رکھتے ہیں۔

سیدین صاحب پاکستان جا کر نہیں بسے۔ مگر بار بار اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے جاتے رہے۔ انھیں کبھی اس کی ذرا سی بھی فکر نہیں ہوئی کہ وہ حکومت ہند کے ملازم ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ان پر شبہ کیا جائے جس شخص کا ضمیر صاف، نیت پاک اور کیرکٹر آئینہ کی طرح روشن ہو اسے ایسی بات کا خیال نہیں آتا۔ وہ جب بھی پاکستان جاتے (یا کسی باہر کے ملک جاتے ہوئے یا آتے ہوئے چند گھنٹے یا چند دن کے لئے ٹھہرتے) وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ پاکستان میں ان کے وسیع خاندان کے افراد کے علاوہ بہت سے دوست، شاگرد عقیدت مند اور مداح تھے جو ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ کتنے خوش ہوتے تھے یہ دور افتادہ عزیز اور دوست

اپنے محبوب سیدین کو دیکھ کر یہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خیالات اور سیاسی نظریوں کے اختلافات کم سے کم ان کے سامنے جیسے غائب ہو جاتے تھے۔ وہ جب پاکستان جاتے پہلے سے لوگوں کو خط لکھ دیتے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقات ہو سکے۔ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ ان غریب ہم وطنوں یا پرانے جاننے والوں کو بھی نہیں بھولتے تھے جن سے ان کو لگاؤ تھا۔ مثلاً جب بھی کراچی جاتے اپنی بیوی کی دودھ شریک بہن سے (جو ایک عرصے تک ان کے ہاں ملازم بھی رہی تھیں) بلا کر ضرور ملتے اور اس کے ہاں جا کر دعوت بھی کھاتے۔ چند دن کے اندر اتنے ملنے والے آتے، اتنی دعوتیں ملتیں، اتنے فنکشن کئے جاتے کہ ان کے چاہنے والوں کو ان کی صحت کے لئے خطرہ لاحق ہو جاتا۔ مگر سیدین صاحب کسی کی دل شکنی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ہر جگہ جاتے چاہے چند منٹ ہی کے لئے جائیں۔

ان کے دل میں پاکستان کے لئے خیر سگالی کا گہرا جذبہ موجود تھا۔ وہ اس کی ترقی سے خوش، اس کی بدحالی سے رنجیدہ ہوتے تھے۔ جب مشرقی بنگال میں قیامت کا ہنگامہ برپا ہوا اور بنگالی پناہ گزین لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان آنے لگے۔ جو آگ وہاں لگی تھی اس کی لپٹیں ہندوستان تک پہنچنے لگیں تو سیدین صاحب کی دکھ اور صدمے سے عجیب حالت تھی راتوں کی نیند اور دن کا چین اڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں اور سب کچھ بھول کر بس وہ اس فکر میں لگے رہتے تھے۔ اخبار پڑھتے، دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے اس سے متعلق خبریں سنتے، عابد صاحب سے تبادلۂ خیالات کرتے اور اس سوچ میں رہتے کہ اس ظلم

کے خلاف کیسے آواز بلند کی جائے اس کے لئے انھوں نے جلسوں میں تقریریں کیں مضمون لکھے ریڈیو سے متعدد تقریریں نشر کرتے رہے اور پاکستانیوں کو سمجھاتے رہے کہ ان کے مسائل، بہیمانہ خوں ریزی کے بغیر بھی حل ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے ایک نام نہاد "دانشور" نے جو کسی زمانے میں ان کا مداح اور دوست ہونے کا دعوے دار بھی تھا، اپنے پر قیاس کرکے، ریڈیو پاکستان سے ان کی تقریروں کے جواب میں ان پر خوب کیچڑ اچھالی اور کچھ اس قسم کی باتیں کہیں کہ یہ خریدے ہوئے کرایہ کے دانشور ہیں۔ اور کبھی ہندوستان میں ہونے والے ظلم و ستم پر صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے لوگوں نے یہ تقریریں سنی اور سبط صاحب سے کہا فلاں شخص نے آپ کے بارے میں یہ سب کہا تھا۔ انھوں نے اس کا ذرا بھی اثر نہیں لیا۔ بلکہ اور کئی تقریریں کیں۔ ان پر یہ کرب تھا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلام کی خدمت اور جہاد کا مقدس نام لے کر ہو رہا ہے اور خود وہاں کے عوام کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔ اسلام کے روشن چہرے کو داغ دار کرنے کی یہ کوشش ان کا دل خون کرتی رہی۔ اور وہ لوگوں کو بتاتے رہے کہ اسلام کی تعلیم میں خون خرابے اور ظلم و ستم کی کہیں گنجائش نہیں۔

انتقال سے تین یا چار دن پہلے انھوں نے اے۔ آئی۔ آر۔ کی اردو سروس کے لئے اپنی آخری تقریر ریکارڈ کرائی تھی جو ان کے انتقال سے چند گھنٹے پہلے یا بعد نشر ہوئی۔ بڑی پر اثر تقریر ہے۔ لگتا ہے دل کے خون سے لکھی گئی ہے۔ اسی تقریر میں سے جو بیس منٹ سے زیادہ کی تھی، دو تین اقتباس یہاں درج کرنا چاہتی ہوں۔ تقریر کی تمہید میں

انھوں نے کہا:۔

"میں اپنی تقریر سے پہلے چند باتیں بطور تمہید کے کہنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ ۲۳ سال میں یعنی جب سے پاکستان قائم ہوا ہے، میرے دل میں اس کی خیر خواہی کے سوا کوئی جذبہ نہیں آیا۔ وہاں میرے دوست ہیں، عزیز ہیں، شاگرد ہیں، جاننے والے ہیں جن سے میرے مخلصانہ مراسم ہیں۔ جب کبھی مجھے وہاں جانے کا موقع ملا ہے انھوں نے ہمیشہ مجھ سے محبت اور گرمجوشی کا سلوک کیا ہے۔ میں نے اپنی عمر میں پچیس سے زیادہ کتابیں اور سینکڑوں مضمون لکھے ہیں اور شاید ہزاروں تقریریں کی ہیں۔ میں خدا کو حاضر اور ناظر جان کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی، نہیں کہی، نہیں لکھی، جس میں پاکستان کی بدخواہی کا شائبہ بھی ہو۔ میں چاہتا ہوں پاکستان پھولے اور پھلے۔ ہندوستان پھولے اور پھلے اور دنیا کے سارے ملک پھولیں اور پھلیں، لیکن شرافت اور انسانیت کی فضا میں۔ عمر کی اس منزل میں آ کر میری نظر میں ان دیواروں کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی جو ہم اپنے گرد کھینچ کر اپنی انسانیت کو تنگ اور محدود کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جین، بودھ، پارسی سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ ان میں مذہب کے نام پر سیاسی اغراض کی وجہ سے جو جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں وہ سب نامبارک

ہیں۔ میں تو آپ کے اور اپنے مشترک شاعر اقبال کے اس جذبے کا معترف ہوں:۔

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل
دل اگر بگریزد از دل، وائے دل

اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ تقریر میں حکومت کے ایماء پر نہیں کر رہا ہوں۔ ریڈیو والوں کی درخواست پر نہیں کر رہا ہوں بلکہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا موقع آتا ہے اگر وہ جرأت کے ساتھ اس بات کا اظہار نہ کرے جس کو وہ سچ سمجھتا ہے تو گویا خود کے ساتھ، زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے .... میری ایسی تقریروں کا محرک، آپ کی خیر خواہی ہے۔ آپ نہ مانیں تو خدا جانتا ہے۔....."

اسی تقریر میں انھوں نے کہا:۔

"جب کبھی موقع ہوا ہے، جب کبھی میرے خیال میں ملکی حکومت نے یا کسی فرقے نے انصاف اور شرافت کی راہ ترک کی ہے۔ میں نے اس پر بڑی تنقید

کی ہے۔"

آل انڈیا ریڈیو ہی سے انھوں نے قومی پروگرام میں تین لکچر "مہاتما گاندھی بحیثیت ایک انسان اور مفکر" کے عنوان سے دیے تھے۔ اس میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے جو انھوں نے کہا تھا اس کا اقتباس بھی اس تقریر میں دے کر یہ ثبوت دیا کہ ہم ہندوستان میں حق گوئی کے لئے آزاد ہیں:۔

"گاندھی جی کو تشدد اور جنگ سے سخت نفرت تھی کیوں کہ وہ انسانوں کو درندہ بنا دیتی ہے۔ شریف آدمی بھی جب اس جہنم سے زندہ بچ جاتے ہیں تو اکثر شریفانہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہتے۔.......... خود ہمارے ملک والوں نے جو بربریت مثلاً احمد آباد میں دکھائی کیا وہ بھی اس قدر قابل نفریں نہیں ہے۔؟ لیکن میں نے نہیں دیکھا کہ ہمارے ہاں پبلک نے اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ آواز اٹھائی ہو...... ہم اپنے خدا اور اپنے ضمیر کو اس گناہ کا کیا جواب دیں گے؟ اکثر جب میں رات کو سونے کو لیٹا ہوں تو خود سے پوچھتا ہوں کیا واقعی گاندھی ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے؟ کیا ہم دراصل ان کے سپوتوں کے دیس میں رہتے ہیں؟ انھوں نے ساری عمر اہنسا اور انسانیت کے لئے جہاد کیا تھا۔ لیکن میں آج کل کی زندگی کے ہر شعبہ میں تشدد کی کارفرمائیوں کو بڑھتا ہوا

دیکھتا ہوں ذرا ذرا سی باتوں پر..... وہ وحشی درندے جنھوں نے اپنے ہم جنسوں، اپنے ہم وطنوں کو احمد آباد میں زخمی کیا، قتل کیا اور جلایا اور سابرمتی آشرم کی حرمت تک کا احترام نہ کیا..... کیا وہ ہمارے ہی بدبخت ہم وطن تھے؟ کیا وہ شیعہ اور سنی، ایک ہی خدا اور قرآن اور رسول کو ماننے والے، جو لکھنؤ میں وحشی جانوروں کی طرح لڑے اور اپنی مسجدوں تک کا احترام نہ کیا ذرا بھی اپنے مذہب کی سچی تعلیم سے یا گاندھی جی کی انسان دوستی سے متاثر ہوئے تھے؟....... تعصب کا بازار چڑھا ہوا ہے۔ رواداری، رحم اور ہمدردی کی جنس مندی پڑ گئی ہے........ اور یہ بات صرف ہندوستان پر صادق نہیں آتی بلکہ دوسرے ملکوں پر بھی اور زیادہ شدّت کے ساتھ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے......"

مشرقی پاکستان میں فوجی حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے بڑے دکھ کے ساتھ انھوں نے اپنے پاکستانی بھائیوں سے کہا:-

"مجھے آپ کی فوجی حکومت سے یہ شکایت ہے کہ اس نے جبر و ظلم کی یہ پالیسی اپنے ملک کی اکثریت کے لئے استعمال کی جو آپ کی اور میری طرح انسان ہیں، جو پاکستان ہی کے باشندے ہیں، جو مسلمان ہیں اور غالباً اسی نیت سے پاکستان میں شریک ہوئے تھے کہ وہ ایک

اسلامی ملک کے آزاد شہری ہوں گے۔ ان کے کبھی خواب میں بھی نہ آیا ہوگا کہ ان کی متفقہ طور پر اپنے جائز حقوق مانگنے کی سزا ہیں توپوں اور بندوقوں کا شکار بنایا جائیگا۔ اس قسم کی حرکت دنیا میں کہیں بھی ہو قابلِ شرم ہے۔ لیکن جب ایک اسلامی حکومت میں ایسا کیا جائے تو ہم اسلام کی ایک غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسلام جو دینِ امن ہے جو پیغام رحمت ہے، جو اخوت اور مساوات کا مبلغ ہے، جو زندگی کا اس درجہ احترام کرتا ہے کہ قرآن شریف میں صاف کہا گیا ہے کہ..... جو کسی مسلمان کو دیدہ و دانستہ قتل کرتا ہے وہ اصحاب جہنم میں سے ہے۔ جس نے امن کا پیغام اس بلندی پر پہنچایا کہ..... جو شخص ایک آدمی کو قتل کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوع انسان کو قتل کرتا ہے اور جو ایک کو بچاتا ہے وہ تمام بنی نوع انسان کو بچاتا ہے... دوستو! یہ ہزاروں لاکھوں انسانوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟ جواب دہی قیامت کے روز صرف فوجی حکومت کے اراکین کو کرنی ہوگی۔ یا ہم آپ سب بھی اس کے لئے جواب دہ ہوں گے؟ قرآن میں لکھا ہے کہ اس فتنہ سے ڈرو کہ جب وہ آئے گا تو اس کی لپیٹ میں صرف وہی نہ آئیں گے جنھوں نے خاص کر کے ظلم کیا ہے بلکہ سبھی اس کی زد میں آجائیں گے۔ آپ کے دانشوروں سے، آپ کے علما سے، آپ کے سیاست دانوں سے، آپ کے ارباب اقتدار سے سب سے روزِ قیامت یہ سوال کیا

جائے گا۔ اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ ...."

اور پھر تقریر یوں ختم کی :۔

"دوستو! میں دوبارہ معافی چاہتا ہوں اگر میرا بیان آپ میں سے کسی کو ناگوار رہا ہو۔ اربابِ سیاست کی تو مجھے پروا نہیں۔ میرا خطاب تو کروڑوں شریف پاکستانیوں سے ہے ..... یقیناً دکھ پہنچانا بری بات ہے۔ لیکن سچ کو چھپانا اور دبانا اس سے کہیں زیادہ قابل اعتراض ہے۔ جناب علیؑ مرتضیٰ نے کہا تھا کہ یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ آپ کو ایک اسلامی حکومت ہونے کا دعویٰ یا آرزو ہے اور مجھے یہ کہ ؎

لرزم از شرم تو، چوں روز شمار

پرسدت آں آبروے روزگار

حرف حق از حضرتِ ما بردۂ

پس چرا با دیگراں بسپردۂ

اور یہاں دوسروں کو نہیں بلکہ خود کو، اپنے لیڈروں کو، اپنے دانشوروں کو یہ پیغام پہنچانے کا سوال ہے کہ اسلام ظلم کا حامی نہیں، قتل و غارت کا حامی نہیں، ناانصافی کا حامی نہیں۔ دوسروں کی آزادی سلب کرنے کا حامی نہیں، وہ جغرافی یک جہتی کا حامی نہیں بلکہ فکر و نظر اور جذباتی یک جہتی کا حامی ہے۔ خدارا چھلکے کو خوشہ گندم کی جگہ نہ دیجئے ...."

یہ خواجہ غلام السیدین کا جن کی ساری عمر اسلام اور انسانیت کی خدمت میں گذری، آخری پیغام تھا—صرف پاکستان کے نام نہیں صرف ہندوستان کے لئے نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے انسانیت کے لئے!

سیدین صاحب ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود تقریریں کرتے رہے، مضمون لکھتے رہے۔ ریڈیو پر بولتے رہے۔ ان کا بیمار دل غم والم کے اس ریلے کو برداشت نہ کر سکا.... مگر انہیں اس کی پروا نہ تھی کہ دل پر کیا گزرے گی جیسا کہ آپ نے خود ان کی تقریریں پڑھا ان کا مقصد حق و انصاف کی خاطر، ظلم و ستم کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی تھی اور وہ کرتے رہے، یہ دل کی آواز تھی، ضمیر کی پکار تھی، حق کی لگن تھی، اسلام کی محبت تھی، انسانیت کا درد تھا، پاکستان کی خیرخواہی تھی جو ان سے یہ سب کہلواتی رہی۔

جنگ بندی کی خبر آنے سے ایک دن قبل انہیں دل کا آخری دورہ پڑا۔ اسپتال میں عابد صاحب نے اگلے دن یہ خبر سنائی تو چہرے پر سکون کی ایک ذرا سی لہر آئی—مگر صلح کی خبر ملنے سے پہلے ہی وہ ان سب واقعات کا گہرا صدمہ دل اور روح پر لئے سدھار گئے!

یوں تو موت وحیات کا رشتہ خالق کل کے ہاتھ میں ہے مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش کے کشتوں میں سے ایک میرا بھائی بھی تھا۔

مطالعہ اور تصنیف و تالیف

مطالعے سے سیدین صاحب کو جو شغف تھا اس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت میں کیا ہے کہ انہیں بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ اور جب نو یا دس سال کی عمر میں والد نے اپنے کتب خانے کی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی خدمت بیٹے کے سپرد کی تو ان کے اس شوق کو اور مہمیز ہوئی۔ خواجہ غلام الثقلین نے بیش بہا کتابوں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا جس میں اردو، فارسی، عربی، انگلش، فرانسیسی وغیرہ کئی زبانوں کی کتابیں شامل تھیں بہت سی نایاب قیمتی کتابیں اور قلمی نسخے بھی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد رام پور کے نواب حامد علی خاں نے یہ کتب خانہ رضا لائبریری کے لئے خریدنا چاہا۔ غالباً آٹھ یا دس ہزار روپے کی رقم اس کے معاوضہ میں پیش کی۔ جو اس وقت اس بے سہارا خاندان کے لئے بہت غنیمت تھی۔ مگر اس علم دوست گھرانے کو اپنے مرحوم عزیز کا یہ ورثہ جان سے زیادہ پیارا تھا اور وہ کسی قیمت پر اسے الگ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی خواجہ غلام الحسنین نے بھی اس کتب خانے میں بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا تھا۔ جو زیادہ تر اسلامی تعلیم اور علوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہماری منجھلی پھوپی اگرچہ بہت معمولی پڑھی لکھی تھیں۔ مگر بڑی

ذہین اور علم دوست تھیں۔ انھوں نے اپنے گھر میں اس کتب خانے کے لئے نئے کمرے تعمیر کرائے۔ نئی الماریاں بنوائیں اور ایک باقاعدہ کتب خانہ بنالیا۔ وہ اپنے بھائیوں کی ان کتابوں پر جان دیتی تھیں۔ اور ہم لڑکیوں تک کو اجازت نہیں تھی کہ انہیں ہاتھ لگائیں۔ انہیں ڈر لگتا تھا کہ کتاب خراب نہ کردیں۔ ہم یہ تو نہ جانتے تھے کہ وہ اونچے درجے کی علمی و ادبی کتابیں ہم کیا سمجھیں گے مگر کڑھتے بہت تھے کہ ہمارے ابا میاں کی کتابیں ہم ہی نہیں چھوسکتے۔ سیدین صاحب نے بھی ان کی خاطر اس کتب خانہ کو اپنے پاس منتقل نہیں کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پانی پت لٹا اور پھوپھی مرحومہ کو مجبوراً ترک وطن کرکے پاکستان جانا پڑا تو اس حالت میں گئیں کہ گھر کا کل سامان جس میں یہ سرمایہ عزیز بھی شامل تھا، چھوڑنا پڑا۔ اور اس طرح خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ غلام الحسنین کا عمر بھر کا حاصل، یہ بے بہا خزانہ ردّی میں بک گیا۔ جب حالات کچھ سنبھلے اور پانی پت جاکر اس کتب خانہ کی تلاش کی گئی تو ایک کتاب اور ایک ورق بھی نہ مل سکا! کاش! اس وقت ہمارے بزرگوں نے جذبات سے کام نہ لیا ہوتا اور اسے رضا لائبریری کو سونپ دیا ہوتا تو وہ کتابیں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتیں۔

غرض کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق سیدین صاحب کو بھی ورثہ میں ملا تھا۔ اگرچہ ان کا خاص مضمون فن تعلیم تھا۔ اور سب سے زیادہ گہرا مطالعہ انھوں نے تعلیمی کتابوں کا کیا تھا، مگر انہیں ہر قسم کی کتابیں پڑھنے سے شغف تھا۔ علمی ادبی تصانیف تو بہت غور و فکر سے پڑھتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ ہلکا پھلکا افسانوی لٹریچر اور کبھی کبھی

انگریزی میں جاسوسی قصے کہانیاں بھی پڑھ لیتے تھے ۔ دنیا بھر سے ان کے پاس اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے ۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ تو وہ ضرور ہی پڑھتے تھے ۔ بہت سی کتابیں لوگ تحفے میں پیش کرتے تھے ۔ انہیں اچھی کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا بہت شوق تھا جب ان کے پاس پیسہ بہت کم تھا اس وقت سے انھوں نے کتابیں خریدنا اور جمع کرنا شروع کر دی تھیں اور زندگی بھر یہ شوق باقی رہا ۔ قیمتی اور خوب صورت کتابوں کے پورے سٹ ان کے پاس موجود تھے ۔ ان میں عام معلومات کی کتابیں بھی ہیں ۔ علمی بھی تعلیمی بھی ، آرٹ اور کلچر سے تعلق رکھنے والا لٹریچر بھی ۔ اردو کے افسانوی ادب کا شوق بیگم سیدین کو تھا اور وہ ہر نئی کتاب منگا لیتی تھیں ۔ اس طرح ان کے گھر میں متعدد الماریاں اور کتنے ہی صندوق کتابوں سے بھرے رہتے تھے ۔ گھر میں جگہ جگہ الماریوں پر ، میزوں پر سلیقے سے رسالے اور اخبار رکھے نظر آتے تھے جن میں سے بہت سے ، پڑھنے کے بعد ، وہ کسی کتب خانے کو بھیج دیتے تھے ۔ شعری ادب میں محض جمالیاتی شاعری ، یا گل و بلبل ، حسن و عشق کے افسانے ، زبان و بیان کے کرتب والی شاعری سیدین صاحب پسند نہ کرتے تھے ۔ غزلیں بھی وہ پسند کرتے تھے مگر غالب ، میر ، حالی ، فیض جیسے شاعروں کا منتخب کلام جس میں دل سے نکلی بات سیدھی دل میں اتر جائے ۔ اچھی نظمیں انہیں زیادہ پسند آتی تھیں ۔ ان کو وہ شاعری پسند تھی جس میں خلوص ہو ، جذبہ ہو ، جوش ہو ، کوئی پیام ہو ، مقصد ہو اور ساتھ ہی دل میں گھر کرنے والا انداز بھی ہو ۔ اردو شاعروں میں وہ اقبال کے تو وہ حد سے زیادہ قائل اور کلام اقبال کے مفسر تھے ۔ حالی کی مسدس اور بیوہ کی مناجات بہت پسند تھیں ۔ کلام انیس

کے بہت دلدادہ تھے ۔ نئے شاعروں میں سردار جعفری، فیض ، جذبی کو پسند کرتے تھے کسی اور شاعر کی کوئی نظم یا غزل پسند آتی تو سب سے تعریف کرتے اکثر اسے خود خط لکھ کر اپنی پسند کا اظہار کرتے ۔ اقبال کا کلام پڑھتے وقت ان پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ جب ذرا سے ترنم کے ساتھ اپنی دلکش پرسوز آواز میں وہ اقبال کا کلام سناتے تو سامع مسحور ہو کر رہ جاتے تھے ۔ انیس کا مرثیہ پڑھنے کا ان کا ایک مخصوص انداز تھا ۔ عام تحت اللفظ پڑھنے والوں سے الگ ۔ نرم لہجے میں بڑے درد ، کے ساتھ کلام کے تاثر میں ڈوب کر اس سادگی اور پرکاری سے پڑھتے تھے اس کا اثر اور حسن دونا ہو جاتا تھا ۔

انگریزی ادب کا شاید ہی کوئی اچھا لکھنے والا ہو جس کا انھوں نے گہرا مطالعہ نہ کیا ہو ۔ اس میں قدیم لکھنے والے بھی تھے اور جدید بھی ۔ لیکن سب سے زیادہ وہ برٹنڈ رسل سے متاثر تھے ۔ وہ رسل کی ہر کتاب منگاتے تھے ۔ خود پڑھتے ، دوسروں کو پڑھنے کی دعوت دیتے ۔ جو ٹکڑا کسی کتاب کا پسند آتا وہ مجھے ، بھابی جان ، اور لڑکیوں کو سناتے ۔ وہ ہر اچھی کتاب سے خود لطف لیتے اور دوسروں کو اس لطف میں شریک کرتے تھے اس کے علاوہ مختلف لائبریریوں سے کتابیں لاتے اور منگاتے رہتے تھے ۔ دوپہر کو اور رات گئے تک ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے ۔

سید صاحب کئی زبانیں جانتے تھے ۔ انگریزی پر تو انہیں مادری زبان کی سی قدرت تھی ۔ فرانسیسی بھی اچھی خاصی جانتے تھے ۔ فارسی اور عربی پر انہیں عبور تھا ۔ فارسی تو بڑی بے تکلفی سے بولتے بھی تھے ۔ جرمن سے بھی تھوڑی بہت واقفیت تھی اور آخر میں تھوڑی ہندی بھی سیکھ لی تھی ۔ انگلش زبان کے وہ بہت دلدادہ اور مداح تھے ۔ اور سب سے

زیادہ وہ اس کی کتابیں خریدتے اور پڑھتے تھے۔ وہ اس لئے بھی انگلش زبان کی بہت قدر کرتے تھے کہ اس میں ہر زبان کی کتاب کا ترجمہ مل جاتا ہے۔ اس کے بعد اردو کی کتابوں کا نمبر آتا تھا۔ وہ بیمار رہوں، کمزور رہوں، حد سے زیادہ مصروف ہوں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ مطالعہ نہ کریں۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام کو وہ آنکھ کے ڈاکٹر کے ہاں اپنی آنکھیں دکھانے کے لئے گئے تو واپسی پر دہلی پبلک لائبریری سے آٹھ سات کتابیں بھی نکلوا کر لائے۔ آٹھ بجے کے قریب میں ان کے پاس پہنچی تو ان کی طبیعت بگڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اپنی پریشانی چھپانے کے لئے میں کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ مسکرائے ــ" تیرے پڑھنے کی نہیں ہیں ــ سب انگلش کی سنجیدہ کتابیں ہیں!" یہی وہ بدنصیب کتابیں تھیں جو سیدین کے مطالعے سے محروم رہیں۔ اسی رات انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اور تیسرے دن وہ اپنے خالق اور پروردگار سے جا ملے۔

پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا شوق بھی ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ والد نے بیالیس سال کی عمر میں کتنی ہی کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مضامین لکھ ڈالے۔ عصرِ جدید کی ادارت کی۔ اور خدا جانے کتنی تقریریں۔ ان کے بیٹے کو ان کے مقابلے میں پچیس قیمتی سال اس عبادت کے لئے اور ملے۔ اس لئے نہ صرف ان کی تصنیف کی ہوئی کتابوں اور مضامین کی تعداد والد کی کتابوں سے زیادہ ہے بلکہ ان کا علمی ادبی معیار بھی زیادہ بلند ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اسکول کے زمانے میں انھوں نے کیا لکھا، مگر یہ جانتی ہوں کہ کالج میں جا کر، فرسٹ ایر سے ہی ان کے مضامین، علی گڑھ میگزین میں چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ بعد میں علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی منتخب

ہوئے جس کو انھوں نے اپنے زمانے میں معیاری رسالہ بنا دیا تھا۔ اسی زمانے سے ان کی تحریری قابلیت کی دھاک بیٹھنی شروع ہو گئی تھی۔ انگلستان میں جب وہ لیڈز کی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے تھے تو وہاں کے بڑے بڑے عالموں اور پروفیسروں نے اس ہونہار ہندوستانی طالب علم کی قابلیت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ اس کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔ شروع میں انھوں نے علی گڑھ میگزین اور بعض اور اردو رسالوں میں ہلکے پھلکے مضامین اور کہانیاں بھی لکھیں مگر آگے چل کر سنجیدہ چیزوں کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ ان کی انگریزی کی قابلیت غیر معمولی تھی۔ تقریر کرتے تو لوگ مسحور ہو کر سنتے اور انگریزی لکھنے پر تو انھیں ایسی قدرت تھی جو شاذ و نادر کسی شخص کو غیر زبان لکھنے پر ہوتی ہے۔ ان کی اٹھائیس انگلش کی کتابیں شائع ہوئی ہیں بعض کی فہرست کتاب کے آخر میں دی جا رہی ہے) اور انتیسویں "اسلام ـــ مذہبِ امن" اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائیٹی کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔

اپنے زمانے کے انگریزی داں لوگوں کے برخلاف، سیدین صاحب کو اپنی مادری زبان سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ نہ انھوں نے کبھی اس سے بے نیازی برتی نہ کمتر سمجھا۔ اس کے برعکس انھیں اس پر ناز تھا۔ وہ شروع ہی سے اردو میں بھی لکھتے رہے۔ ان کی تقریروں کے بارے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ سیدین صاحب زیادہ خوبصورت تقریر اردو میں کرتے ہیں یا انگلش میں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کی تقریر کچھ زیادہ ہی دلکش ہوتی تھی۔ بولتے تو لگتا منھ سے پھول

جھڑ رہے ہیں اور دل سے نکلی بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آورد نہیں ہوتی تھی۔ بے تکلفی اور سادگی سے نہایت رواں اور دلنشیں زبان میں بولتے چلے جاتے تھے جس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی اور ہلکے سے طنز کی ترشی بھی۔ کلام پاک کے حوالے بھی ہوتے اور اقبال کے اشعار بھی۔ موقع محل سے دوسرے شاعروں کے شعر بھی وہ اردو کے ہوں یا فارسی کے بے تکان پڑھ جاتے تھے۔

یہی خلوص، سادگی، شگفتگی، روانی اور اثر ان کی اردو تحریر کی جان ہے۔ ان کی سب سے اہم اور ضخیم تصنیف "اصول تعلیم" اردو ہی میں لکھی گئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب "روح تہذیب" برسوں سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اخلاقی اور تہذیبی تربیت کے لئے پڑھائی جاتی رہی ہے۔ ایک بار انھوں نے ایک طویل افسانہ "شہید وفا" لکھا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا اور ان کے ایک عقیدت مند نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں اور ہیں "قومی سیرت کی تشکیل"، "علی گڑھ کی تعلیمی تحریک"، "زبان، زندگی اور تعلیم" اور داستانِ اشک دخوں جس میں بنگلہ دیش اور پاکستان کی جنگ کے زمانے میں کی ہوئی تقریریں اور مضامین ہیں۔ یہ کتاب ان کے بعد شائع ہوئی ہے۔ ان کی سب سے اہم اور خوبصورت تصنیف "آندھی میں چراغ" ہے۔ جو ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ آخری تصنیف ان کی یہ خود نوشت ہے۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں ریڈیو کی تقریریں بہت سے مضامین اور بے گنتی خطوط ہیں۔ ان کے خطوط کے بیان کا حسن اور انداز کی دلکشی انہیں اردو کے بہترین خطوط نویسوں کی صف میں

بہت اونچا مقام دلا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ کئی اور کتابیں لکھنے کا ان کا ارادہ تھا۔ ان کے مسودوں میں بہت سی تقریریں، مضامین اور نوٹس ملے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کتاب آنحضرتؐ کی سیرت پر اور ایک کتاب امام حسینؑ پر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

لیکن خود سیدین صاحب نے اپنے کو اردو کا بڑا ادیب کبھی نہیں سمجھا۔ آندھی میں چراغ پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا تو ان کو کچھ حیرت ہی ہوئی۔ وہ اس وقت ہوائی میں مقیم تھے۔ اور یہ ایوارڈ ان کی بیٹی زہرہ نے وصول کیا تھا۔

اردو لکھتے وقت کسی جملہ کا مطلب، کسی محاورے کا استعمال، یا انگریزی لفظوں کا صحیح بدل معلوم کرنا ہو تو بے تکلف عابد صاحب یا مجھ سے یا کسی اور سے پوچھ لیتے، اس میں ان کو ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ ابتدا میں ان کا انداز تحریر علمی اور کسی قدر مشکل تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی تحریر زیادہ منجھ گئی۔ زبان سلیس اور بے تکلف ہو گئی۔ بات اتنی ہی کہتے جتنی کہنا چاہیئے۔ زور بیان کے لئے بقول خود "لفظوں کے اسراف" کو ناپسند کرتے تھے، مجھے ہمیشہ ٹوکتے اور مشورہ دیتے کہ لفظوں کے اسراف سے بچو۔ جہاں ایک یا دو لفظوں سے کام چل سکتا ہو وہاں چار یا چھ لفظ کیوں استعمال کئے جائیں؟

اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں میں وہ مولانا ابوالکلام کی تحریروں، خاص کر تفسیر سورۂ فاتحہ کی زبان اور انداز بیان کو بہت پسند کرتے تھے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کی ظرافت اور طرز ادا

کے دلدادہ تھے ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اردو تحریروں اور طرز بیان کو بے حد پسند کرتے تھے ۔ اور ڈاکٹر عابد حسین کی طرز تحریر کو وہ سہل ممتنع کہا کرتے تھے۔

سیدین صاحب کو زندگی سے پیار تھا ۔ انسانوں سے پیار تھا۔ زندگی کی بہت سی چیزوں سے وہ لطف اٹھاتے تھے ۔ مگر ان سب سے زیادہ مسرت انہیں لکھنے اور پڑھنے سے حاصل ہوتی تھی ۔ ۱۹۲۶ء سے میں ان کے پاس جا کر علی گڑھ رہی تھی ۔ اس وقت سے ۱۹۷۱ء تک میں نے کوئی دن ایسا نہیں دیکھا جب انھوں نے کچھ نہ کچھ لکھا نہ ہو۔ لکھتے وقت ان کے چہرے پر غور و فکر، انہماک، سکون اور دلی مسرّت کی ایک عجیب کیفیت ہوتی تھی ۔ وہ لکھنے کے لئے کسی فضا کا اہتمام نہیں کرتے تھے ۔ عموماً اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ کر لکھتے ۔ مگر حالت یہ ہوتی کہ نوکر صفائی کر رہا ہے ۔ لڑکیاں آجا رہی ہیں، باتیں کر رہی ہیں، بھابی جان سوالات کر رہی ہیں، بچے آکر شرارتیں کر رہے ہیں، یا ان سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں، ان سے طرح طرح کے سوالات پوچھ رہے ہیں ۔ ملنے جلنے والے بھی آتے جاتے رہتے، وہ ان سے بھی مخاطب ہو جاتے ۔ بچوں سے کھیل بھی لیتے اور لکھتے بھی رہتے۔ آخر زمانہ میں جب اس طرح کام کرنا مشکل ہو گیا تھا، بچوں کی اور دوسرے لوگوں کی خلل اندازی سے ذرا الجھنے لگے تھے ۔ لوگوں کے بے وقت آنے پر کڑھتے بھی تھے ۔ مگر آنے والا ان کو کام کرتے دیکھ کر واپس جانے لگے، یہ وہ گوارا نہ کرتے تھے ۔

محبت سے روک لیتے اور اخلاق سے باتیں کرتے۔ لکھنے کا کام ان کے لئے عبادت سے کم نہ تھا۔ اس سے انہیں وہ روحانی کیف حاصل ہوتا تھا جس کا مقابلہ دنیا کی کسی خوشی سے نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کے دو سال میں صحت بہت گر چکی تھی۔ اور ان کے پاس نہ کوئی سکریٹری تھا نہ ٹائپسٹ نہ کوئی اور مددگار۔ مگر لکھنے کے کاموں کی یورش اب بھی ویسی ہی تھی۔ خطوط کا انبار اب بھی لگا رہتا تھا۔ بعض وقت زچ ہو جاتے، الجھتے کہ یہ سب کام کیسے ہو؟ لیکن کام بہر حال ہوتا رہتا۔ کبھی کبھی میں اصرار کر کے ان کے کچھ خطوط کا جواب لکھ دیتی۔ مگر یہ وہ گوارا نہ کرتے کہ کسی دوست، شاگرد اور عزیز کے خط کا جواب وہ خود اپنے ہاتھ سے نہ لکھیں۔ خطوط کے جواب جاتے رہے، کانوکیشن اڈریس لکھے اور پڑھے جاتے رہے۔ صدارتی تقریریں اور ریڈیو کی تقریریں تحریر اور نشر کی جاتی رہیں ساتھ ہی دو مستقل کتابیں زیر تصنیف رہیں۔

جولائی ۱۹۷۱ء میں وہ کشمیر گئے، سات ہفتے کے قریب وہاں قیام کیا۔ وہاں اسلام، مذہب امن کا بہت سا کام کیا واپس آنے کے بعد اگرچہ طبیعت برابر کچھ نہ کچھ خراب رہی مگر تصنیف کا کام جاری رہا۔ مجھے اور زہرا کو اس کی فکر تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے ملیں جلیں نہیں کہ اس کا اثر ان کی صحت پر پڑتا ہے۔ کام بھی اِدھر اُدھر کا بہت زیادہ نہ کریں۔ بلکہ ان دونوں کتابوں کو مکمل کریں۔ سیدین صاحب سن لیتے

مگر مانتے نہ تھے ۔ وہ ایک طرف تو بہت ہی نرم مزاج تھے ..... عام طور پر اپنے چاہنے والوں کی باتیں مان لیتے تھے ۔ مگر اُن چیزوں کے معاملے میں جنہیں وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کسی کی بات کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ دوسرے انھوں نے اپنے دل میں یہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ معذور اور اپاہج ہو کر زندہ نہ رہیں گے ۔ ان کے نزدیک زندگی اور عمل دو ہم معنی لفظ تھے ۔ عمل کی قوت نہ رہے تو زندگی بے معنی چیز رہ جاتی ہے ۔ کبھی کبھی میں یا عابد صاحب پوچھتے تھے کہ کتاب کا کام کیسا چل رہا ہے تو صاف نہ بتاتے ۔ دھیرے سے کچھ مایوسی کے لہجے میں کہتے "ہو ہی رہا ہے ۔ مگر بہت کم، دیکھو پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں " ۱۶ر دسمبر کی دوپہر کو میں ان کے پاس گئی تو وہ باغ میں جاڑے کی دھوپ میں میز بچھائے کرسی پر بیٹھے لکھ رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر حسب معمول اپنا قلم رکھ دیا، کچھ دیر باتیں کرتے رہے ۔ میں جب اٹھی تو روکنے لگے "امت جا ——— کیا جلدی ہے " میں نے عذر کیا کہ میں بھی تو لکھ رہی تھی ——— بس ایک دم جی چاہا آپ کو دیکھنے چلی آئی ۔ یہ بات تو بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ اُسی دن انھوں نے اپنی آخری کتاب "اسلام مذہبِ امن" کو مکمل کیا تھا ۔

آخر کے چند مہینوں میں انھیں ایک لگن یہ تھی کہ وہ اپنے ان خطوط کے ذخیرے کو جو ہزاروں کی تعداد میں ان کے پاس ہیں ترتیب سے رکھیں ۔ ان کے پاس بلا مبالغہ

بچاسوں ہی فائل خطوط کے تھے ۔ جس میں دنیا بھر کے مشاہیر کے خطوط ہیں ۔ کتنے ہی فائیل انگریزی کے اور یورپین امریکن اور دوسرے ملکوں کے دوستوں اور قدر دانوں کے ہیں ۔ اردو کے خطوط تو ہزاروں ہی ہوں گے ۔ بزرگوں کے، عزیزوں کے، بھائی بہنوں کے، بیوی کے، بچیوں کے خطوط ۔ دوستوں کے خطوط۔ محترم استادوں کے خطوط۔ عقیدت مندوں کے خطوط۔ مجید[1] کی مدد سے کبھی کبھی ان کو نکالتے اور ترتیب دینے کی کوشش کرتے ۔ دو چار بار میں نے ان کے ساتھ مل کر کئی فائل ان کے صاحب قلم اور صاحب فکر دوستوں، اور عزیزوں وغیرہ کے بنوائے ۔ مگر خطوں کا انبار اتنا تھا۔ کہ اس کے لئے اچھے خاصے اسٹاف کی ضرورت تھی اور سیدین صاحب کی صحت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ زیادہ وقت اس کام کو نہ دے سکتے تھے!

خطوط کا یہ بے بہا خزانہ اب بھی ان کے کاغذات میں موجود ہے!

یوں تو سیدین صاحب نے اپنی لڑکیوں کے لئے کچھ روپیہ بھی چھوڑا ہے اور ایک گھر بھی ۔ مگر ان کا اصل خزانہ ان کا کتب خانہ ہے، ان کی بے بہا تصانیف ہیں، ان کے

---

[1] کشمیری نوکر عبدالمجید

وہ لاتعداد غیر شائع شدہ مضامین اور تقریروں وغیرہ کے مسودے ہیں۔ اور بےگنتی ان کے لکھے ہوئے خطوط ہیں جو ان کے چاہنے والوں کے، ان کے دوستوں، عزیزوں، ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے پاس محفوظ رہ گئے ہوں گے۔ خدا کرے ان کے وارث اس دولت کی سچی قدر کر سکیں۔

خدمات و اعزازات

سیدین صاحب اتنے اداروں سے منسلک رہے اور انھوں نے اتنے کام انجام دیے خصوصاً تعلیم کے میدان میں، جن کا احاطہ کرنا، کم سے کم میرے لئے ممکن نہیں۔ علاوہ ان منصبی کاموں کے جو انھوں نے پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ یونیورسٹی، ڈائرکٹر تعلیم اور مشیر تعلیم کشمیر، مشیر تعلیم ریاست رام پور اور مشیر تعلیم بمبئی، پھر ایجوکیشنل سیکریٹری حکومت ہند اور ڈائرکٹر ایشین انسٹی ٹیوٹ کی حیثیت سے تقریباً پینتالیس سال انجام دیے دوسرے بہت سے تعلیمی اور تہذیبی اداروں کی دیس اور پردیس میں خدمت کرتے رہے۔ یونسکو کی تعلیمی اور تہذیبی تحریکوں سے ان کا گہرا تعلق تھا اور کتنی ہی بار وہ اس کی کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوئے آسٹریلیا میں اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلائے گئے۔ انگلستان اور مشرقی اور مغربی ملکوں کی بہت سی یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچرز دیے اور دوسری بیسیوں ہندوستانی اور بدیسی تعلیمی، تہذیبی، علمی، ادبی اور سماجی بہبود کے اداروں کی ممبری صدارت وغیرہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں کتنی ریاستوں

کتنے شہروں اور شہر دہلی کے کتنے تعلیمی اداروں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان میں سے اکثر کام نہایت خاموشی اور لگن سے آخر تک کرتے رہے

جب گاندھی جی نے بیسک ایجوکیشن کو ملک میں رائج کرنا چاہا اور اس کے لئے ذاکر حسین کمیٹی بنائی گئی تو بیسک ایجوکیشن کی سکیم بنانے کا تقریباً سارا کام سیدین صاحب نے کیا یا اپنی نگرانی میں ٹریننگ کالج علی گڑھ کے اساتذہ سے کرایا تھا۔ ایک بار ذاکر صاحب، عابد صاحب اور سیدین صاحب گاندھی جی کے پاس اس سلسلے میں گئے ہوئے تھے گاندھی جی سے اس کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ انھوں نے سیدین صاحب سے مخاطب ہو کر اسکیم کی بڑی تعریف کی۔ سیدین نے انکسار کے ساتھ کہا۔ "مہاتما جی اس کا سہرا تو ذاکر صاحب کے سر ہے" گاندھی جی کے چہرے پر شفقت بھری پوپلی دلکش مسکراہٹ بکھر گئی "مگر جاکر صاحب تو کہتے ہیں اسکیم کے پیچھے شکتی تمھاری ہے۔"

یہ ذاکر صاحب کی بڑائی تھی کہ دوسرے کے کاموں کا اعتراف کرتے تھے اور سیدین صاحب کا یہ کردار تھا کہ کبھی اپنے کاموں کا بکھان نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا سہرا دوسروں کے سر باندھتے تھے۔

جن لوگوں نے ایجوکیشن منسٹری میں ان کی سیکریٹری شپ کے زمانے میں، ان کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں جتنے کام تعلیمی اصلاح اور ملک میں تعلیم کو پھیلانے کے ہوئے ہیں ان میں بہت بڑا حصہ سیدین صاحب کا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے یوتھ فیسٹول شروع کیا۔ جس میں سارے ہندوستان کے کالجوں سے نوجوان طالب علم جمع ہوتے تھے، کیمپ لگتا تھا رنگا رنگ کلچرل اور

تعلیمی پروگرام ہوتے تھے اور ہر مذہب، ذات، ہر صوبے، ہر زبان بولنے والے طالب علموں کو ایک دوسرے سے ملنے، سمجھنے اور دوستی کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس کے روح رواں سیدین ہی تھے۔ مگر یہاں بھی نام دوسروں کا ہوتا رہا کام وہ کرتے رہے۔ افسوس کہ یہ فیسٹول ان کے ریٹائر ہونے کے بعد ختم کر دیے گئے۔

سیدین صاحب جیسے منکسر المزاج اور شہرت و ناموری سے بھاگنے والے انسان کو ہمارے ملک میں ذرا کم اور بہت دیر میں پہچانا جاتا ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ایسے آدمی کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف کیا ہی جاتا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں سیدین صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر ان کے دوستوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کی طرف سے انہیں انگریزی اور اردو میں COM MO RATION VOLUME ——— پیش کیا گیا تھا۔ جسے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے راشٹرپتی بھون میں ایک فنکشن میں انہیں پیش کیا۔ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے سیدین صاحب کا تعارف کرایا تھا۔ ان دونوں کی تقریروں میں جس طرح سیدین صاحب کے کاموں کو سراہا گیا تھا۔ اور ان کی دل کش شخصیت کا جس خلوص و محبت سے ذکر کیا گیا، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

۱۹۶۲ء میں ان کی مادر علمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انہیں کانوکیشن اڈریس دینے کے لئے مدعو کیا۔ اور اس موقع پر ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری انھیں پیش کی گئی۔ سیدین صاحب نے اس موقع پر جو ایڈریس دیا اس کو چھ سات ہزار کے مجمع نے جس شوق اور محویت

کے ساتھ سنا وہ علی گڑھ کی تاریخ میں شاید کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ان کو ڈگری دی گئی تو ہزاروں طالب علموں نے جس قدر جوش اور مسرت کا اظہار کیا وہ بھی دیکھنے کے قابل سین تھا۔

۱۹۶۳ء میں ان کے اردو مضامین کے مجموعے "آندھی میں چراغ" پر ساہتیہ اکیڈمی نے ایوارڈ دیا۔ عام طور پر مضامین کے مجموعہ کو تخلیقی کارنامہ نہیں مانا جاتا، مگر اس کتاب کا ادبی پایہ اتنا بلند تھا کہ اکیڈمی کو اسے "تخلیق" تسلیم کرنا پڑا۔

۱۹۶۶ء میں حکومت ہند کی طرف سے ان کی تعلیمی خدمات پر انہیں پدم بھوشن کا اعزاز پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۷۰ء میں کولمبیا یونیورسٹی نے اپنی جوبلی منائی تھی۔ اس موقع پر وہاں کے ٹرینگ کالج نے دنیا کے چند ممتاز ترین ماہرین تعلیم کو مدعو کر کے انہیں ایک طلائی تمغہ پیش کیا تھا۔ دنیا کے ان سات ماہرینِ تعلیم میں ایک خواجہ غلام السیدین بھی تھے۔ اس عظیم الشان جلسے میں سینکڑوں ماہرین تعلیم اور صاحبان علم کا مجمع تھا۔ وہاں کے اخباروں کے جو تراشے سیدین صاحب کے ساتھ آئے تھے، (یا جو دوسرے لوگ اس میں شریک ہوئے ان کی زبانی) ان سے معلوم ہوا کہ جس ماہر تعلیم کی خدمات کو سب سے زیادہ سراہا گیا اور جس کی شان میں گویا قصیدے پڑھے گئے وہ سیدین صاحب تھے۔ لیکن خود انھوں نے اس کا ذکر ذرا تمسخر کے ساتھ اپنا اور دوسرے لوگوں کا مذاق سا اڑا کر اس طرح کیا جس سے کوئی یہ اندازہ لگا ہی نہ سکتا

تھا کہ انہیں باہر کی تعلیمی دنیا میں کس قدر اونچا مقام دیا جاتا ہے اور خود سیدین صاحب نے ان باتوں کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی۔

ان اعزازات کو، تمغوں کو، ڈگریوں کو بس وہ اتنی اہمیت دیتے تھے کہ کام کی لگن اور خدمت کا جذبہ کچھ اور زیادہ بڑھ جاتا تھا۔

غنی فقیر

سیدین صاحب کے مزاج میں غضب کی سادگی اور جفاکشی تھی بے شک بچپن سے بڑھاپے تک ہمیشہ ان کے چاہنے والوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے لئے ہر راحت اور آسائش فراہم کرنے کی کوشش کی دور سے دیکھنے والے بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ فراغت و راحت حاصل رہی ہے۔ بچپن میں جب تک باپ کا سایہ سر پر رہا گھر میں فراغت کا دور دورہ تھا، پھر ان کے بعد چاہنے والی ماں نے ہر مشکل اپنے پر جھیلی مگر بیٹے کی خوشی اور آرام کو مدنظر رکھا۔ وہ علی گڑھ گئے تو اس وقت اگرچہ بے حد ارزانی کا زمانہ تھا۔ مگر تیس چالیس روپے مہینہ بھی گھر سے ملنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی اماں ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتیں۔

جب انھیں بی۔اے۔ کرنے کے بعد انگلستان جاکر اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے وظیفہ ملا۔ تو جانے کی تیاریوں اور کپڑے وغیرہ بنانے کے لئے روپے کی ضرورت پیش آئی۔ میرٹھ میں ہماری ایک زمین تھی اماں نے بلا تامل وہ زمین اٹھارہ سو میں فروخت کردی۔ اگرچہ

وہ خوب جانتی تھیں زمین کی قیمت بڑھتی رہتی ہے اور آگے چل کر ان کے کم سن بچوں کے لئے وہ سہارا بن سکتی ہے۔ مگر ان کو اپنے ہونہار بیٹے کی سعادت مندی اور اس کی اپنے بھائی بہنوں سے محبت پر پورا اعتماد تھا اور اسی کو وہ ان کا سہارا سمجھتی تھیں! (اور بیٹے نے زندگی بھر ماں کے اس اعتماد کا بھرم رکھا) ولایت سے واپس آکر بھائی جان فوراً ہی ٹرینِنگ کالج میں ریڈر اور پھر پروفیسر ہو گئے۔ اور اتنی تنخواہ ملنے لگی کہ اپنے خاندان کا بار اٹھا لیا۔ اس چار سو روپے میں سے وہ اپنی ذات پر برائے نام خرچ کرتے تھے۔ اور اماں کے قرضے ادا کرنے اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لئے سب روپے انہیں دیدیتے تھے۔ ماں اور بہن اپنی حد بھر ان کا خیال رکھتیں۔ ان کے دوستوں کی خاطر مدارات کرتی تھیں۔ شادی بھی خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ اگرچہ ان کی بیوی بڑی فراخ دل اور خرّاچ تھیں، مگر ان کی قسمت سے سیدین صاحب کو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے ملتے رہے۔ آمدنی بڑھتی رہی۔ اگرچہ بھابی جان کی شاہ خرچیوں کے لئے وہ بھی اکثر کم پڑ جاتی تھی۔ مگر سیدین صاحب جُز رس صرف اپنی ذات کے لئے تھے۔ ان پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی۔ وہ جب بھی باہر کے کسی ملک میں جاتے اپنے پر تکلیف اٹھا کر سب کے لئے چھوٹے موٹے تحفے لاتے اور تھوڑے سے پیسے بچا بھی لیتے اور بھابی جان کے حوالے کر دیتے۔ پھر آخر کے چند سال میں وہ کئی بار باہر کے ملکوں میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلائے گئے جہاں بہت اچھی رقم تنخواہ کے طور پر ملتی تھی۔ اور انھوں نے جو کچھ بھی پس انداز کیا وہ دراصل

اسی زمانے میں۔ اس لئے کہ عام طور پر تو آمدنی اور خرچ برابر برابر ہو جاتے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے خاندان کے سب سے خوشحال فرد تھے۔ لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ خاندان میں جس شخص پر سب سے کم خرچ ہوتا تھا وہ سیدین صاحب تھے۔ اور خود تو اپنی ذات پر ایک پیسہ خرچ کرنے میں ان کو تامل ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں ایک درویش کا استغنا اور مزدور کی سی سادگی اور محنت کشی کی عادت تھی اور ہمیشہ رہی۔ ان کے بچپن کی بات تو نہیں جانتی، مگر جب وہ علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے تو گھر سے پندرہ یا کبھی بیس روپے سے زیادہ خرچ کے لئے نہیں جاتے تھے۔ فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے کچھ وظیفہ ملتا تھا۔ اور اس قلیل رقم میں وہ نہ صرف خود گزارا کرتے تھے بلکہ اپنے اور بہنوں کے لئے کتابیں بھی خریدتے، اور چھوٹے موٹے تحفے بھی لاتے رہتے۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ سستا زمانہ تھا اس لئے یہ سب ہو سکتا تھا۔ لیکن سیدین صاحب کے ساتھ پڑھنے والوں میں اگرچہ ان سے زیادہ غریب طالب علم بھی تھے۔ مگر ایسے دوست بھی تھے جو گھر سے آتے تو اشرفی امام ضامن کی ان کے بازو پر بندھی ہوتی اور جتنا چاہتے روپیہ منگا کر خرچ کر سکتے تھے۔ خود پانی پت میں ایک دو لڑکے ایسے تھے جو اس وقت سو سوا سو روپے مہینہ باپ سے منگا کر اڑا دیتے تھے۔ سیدین صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بے حد کفایت سے خرچ کرتے۔ اور اس پر ذرا بھی انہیں شرم نہ آتی۔ غریبی ان کے لئے شرم کی نہیں فخر کی چیز تھی کہ ان کا ہاتھ خالی مگر دل غنی تھا۔ اپنی ذہنی، دماغی صلاحیتوں اور خاندانی

شرافت کے سرمایہ پر انہیں اتنا بھروسہ تھا کہ احساس کمتری کبھی ان کو چھو کر بھی نہیں نکلا۔ اور خود یونیورسٹی میں پروفیسروں سے لے کر طالب علموں اور ادنیٰ ملازموں تک، وہ سب میں ہردلعزیز اور سربلند رہے۔

انگلستان کے دو سالہ قیام میں اپنے وظیفہ کی رقم میں انھوں نے کل اخراجات پورے کئے، کتابیں خریدیں اور پیسہ بچا کر یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کی۔ اور واپسی پر عزیزوں کے لئے تحفے لائے۔

واپس آتے ہی انہیں نوکری مل گئی۔ اور سارے خاندان کو اپنے پاس علی گڑھ بلا لیا۔ اپنے بھائی بہنوں کے علاوہ رشتے کے بھائی بہنوں اور بعض دوستوں کے بھائیوں کا بار اٹھایا۔ مہمان داری، لین دین، نادار طالب علموں کی مدد سب کچھ اسی میں ہوتا رہا۔ پہلے امّاں اور پھر بہن کی مہینوں کی بیماری میں مسلسل دوا علاج میں خرچ کرتے رہے۔ تنگی جو اٹھائی وہ اپنی ذات پر اٹھائی۔ دوسروں کی ضرورتیں ہمیشہ پوری ہوتی رہیں۔ اپنی شادی کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کئے۔ یہ فکر رہتی کہ عزیز کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ان کی ہر خواہش اور خوشی پوری کرنا وہ صرف اپنا فرض ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ بیوی کا بھی یہ حال تھا کہ روپیہ زیادہ تر دوسروں پر خرچ کرتیں۔ اپنی ذات پر نہیں چھوٹے بھائی اور بہن کی شادیاں بڑے حوصلے سے کیں اور اپنی حیثیت سے زیادہ ان کو دیا لیا۔ بعد میں بھی ان کی مشکلوں اور پریشانیوں

میں کام آتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۷ء میں جب میں سخت بیمار ہوئی تو بھابی جان نے اپنا کوئی بہت قیمتی زیور فروخت کر دیا تھا۔ وہ بھائی جان کے لئے موٹر لینا چاہتی تھیں۔ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدنے کے لئے بھابی جان نے اپنے پیروں کی بھاری طلائی پازیب ایک ہزار میں فروخت کر دی اور موٹر خرید لی تھی۔

کشمیر کے سات سالہ قیام میں ان کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ مگر ان کا گھر مسلسل عزیزوں دوستوں اور جانے ان جانے لوگوں کا گسٹ ہاؤس بنا رہا۔ لوگ بیگم سیدین کی مہمان نوازی اور کشمیر کی سیر سے لطف اٹھاتے رہتے۔ اور سیدین صاحب تنگی اور تکلیف اپنی ذات پر جھیلتے۔ وہ شاید ہی کبھی اپنے لئے کچھ خریدتے ہوں۔ اگر بیگم سیدین اور اظہر عباس (اور بعد میں لڑکیاں) اس کا خیال نہ کرتے تو شاید ڈھنگ کے کپڑے کبھی ان کے پاس نہ نکلتے۔ مگر یہ دونوں دیور بھاوج ہر چیز کے شوقین تھے۔ گھر کا فرنیچر اور سامان وہی خریدتے۔ خود سیدین صاحب کے لئے کپڑے جوتے اور دوسری ضرورت کی چیزیں لاتے۔ جب سیدین صاحب دام پوچھتے تو بہت کم کرکے بتائے جاتے۔ جس پر وہ اپنی ناواقفیت اور سادگی کی وجہ سے یقین کر لیتے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی بھابی جان ہی خیال کرتی تھیں۔ مگر وہ اتنا کم کھاتے تھے اور اتنا سادہ کھانا پسند کرتے تھے کہ بجٹ پر اس کا کم ہی اثر پڑتا تھا۔ دل کے مرض کے بعد ان کے کھانے پر خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ یہ بھی ان کو ناگوار ہوتا تھا اور اپنے پرہیزی کھانے میں سے بھی دوسروں کو کھلاتے رہتے تھے۔

ان کو اپنی ہر پرانی چیز سے ایک لگاؤ ہو جاتا تھا۔ پرانے کپڑوں، جوتوں، پرانی گھڑی، قلم ہر پرانی چیز وہ سنبھال کر رکھتے اور کسی طرح الگ کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ یہاں تک پرانے کپڑے اور جوتے ہم میں سے کوئی چھپا دیتا، غائب کر دیتا، یا ان سے مانگ لیتا، کہ ہمیں ضرورت ہے۔ اور اس کی جگہ چپکے سے نئے رکھ دیے جاتے۔ پھر بھی ان کی پیار بھری ڈانٹ کئی دن تک کھانی پڑتی تھی۔

پرانی ڈائریاں جو ان کے پاس جمع ہو جاتی تھیں، بے کار کاغذ جو ایک طرف لکھے اور دوسری طرف سادہ ہوں، نہایت احتیاط سے رکھتے اور ان پر اپنی تقریریں مضمون اور ڈائریوں پر کتابیں لکھتے۔ ٹوتھ پیسٹ، برش، شیونگ کریم، بلیڈز وغیرہ بہت احتیاط سے استعمال کرتے اور بہت دن چلاتے۔ چیزوں کو کفایت اور سلیقے سے استعمال کرنا ان کی فطرت کا ایک جزو تھا۔ یوں جب وہ کسی سفر سے خصوصاً باہر کے ملکوں کے سفر سے واپس آتے تو بہت سی چیزیں خرید کر لاتے۔ بجلی کا سامان، آرائش کی اور آرٹسٹک چیزیں کاسٹیوم جیولری، سینٹ کپڑے، قلم، گھڑیاں وغیرہ، سب کو تحفے دیے جاتے۔ کچھ بچا کر رکھ لیتے اور موقع محل سے کسی کی سالگرہ، شادی یا کسی اور تقریب پر اپنے اسٹاک سے کچھ نکال کر تحفہ دیتے اور خوش ہوتے۔ جب تک بھابی جان زندہ رہیں یہ لین دین سب ان کے ہاتھ سے ہوتا۔ اس کے بعد بھائی جان اس خیال سے اور زیادہ چیزیں لانے لگے تھے کہ کسی کو ان کی کمی محسوس نہ ہو۔ دوستوں اور عزیزوں کے

بچوں کے شادی بیاہ پر مناسب تحفہ دینے کا بھی خیال رکھتے۔ مگر اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہیں۔ اپنے گھر کے لئے خوبصورت برتن، بجلی کے لیمپ اور بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں جہاں بھی سستی اور اچھی ملتیں لایا کرتے تھے۔ تصویروں کا بھی شوق تھا۔ ان میں بہت سی تصویریں تو ان کے دوست سجّاد حسین آرٹسٹ کی محبت کی نشانیاں تھیں۔ کئی سال تک یہ سب سامان بکسوں میں بند پڑا رہا۔ پھر جب نیا گھر سیدین منزل (جس کا نام وہ کسی طرح اپنے نام پر رکھے جانے کے لئے تیار نہ تھے۔ مگر لڑکیوں کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئے) تیار ہوا تو لڑکیوں نے بڑے چاؤ اور سلیقے سے اس گھر کو سجایا اور سیدین صاحب کی گھر کے لئے خریدی ہوئی چیزوں کو بڑے حسن سے ترتیب دیا۔ اس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے اور داد دیتے تھے۔

انہیں دعوتیں کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ دوستوں، عزیزوں، ملاقاتیوں کو بڑے اصرار سے ناشتے، سہ پہر کی چائے، دوپہر یا رات کے کھانے پر بلاتے تھے۔ جب تک بیگم سیدین تھیں انہیں بس اتنا کہہ دینا ہوتا کہ فلاں روز، فلاں وقت اتنے آدمیوں کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ پھر اور سب کچھ وہ کر لیتی تھیں۔ مہمان اکثر جتنے بلانے کا ذکر کرتے اس سے دُگنے ہو جاتے۔ مگر بیگم سیدین کے حُسنِ انتظام اور اولوالعزمی کی وجہ سے کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ سیدین صاحب کا یہ شوق بیوی کے انتقال کے بعد بھی باقی رہا۔ ایک ہی دعوت میں وہ ہر قسم کے لوگوں کو بلا لیتے تھے خواہ ان میں آپس میں میل ہو یا نہ ہو۔ انہیں اپنے خلوص اور محبت اور اپنے مجلسی سلیقے پر پورا

اعتماد تھا کہ ان کی دعوت سے کوئی ناراض یا بد دل ہو کر نہ جائے گا
اور ہوتا بھی یہی۔ وہ ہر مہمان کی خواہ وہ کسی عمر، کسی طبقے، کسی ملک
کا ہو یکساں خاطرداری اور دلداری کرتے۔ ہر ایک سے اس کے
مذاق کی باتیں کرتے۔ مناسب تعریف کے ساتھ اسے دوسروں سے
ملاتے۔ گفتگو میں ہر ایک کو شریک کرنے کا فن انھیں ایسا آتا تھا
کہ سبھی ان کی دعوت سے لطف اٹھاتے۔ خاطر تواضع کا ان کا
ایک خاص انداز تھا۔ وہ اپنے حسن تقریر اور لطف مدارات سے
ایسی بے تکلفی کی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ مہمانوں سے اصرار کرنے
کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لوگ خود ہی اپنی پسند کی چیزیں
ذوق شوق سے کھاتے تھے۔ اپنے بھائی بہن اور قریبی عزیزوں
اور ان مہمانوں سے جن سے بہت پیار اور بے تکلفی ہوتی ان کا
خاطرداری کا انداز بالکل ہی نرالا تھا۔ مثلاً وہ ان سے یہ نہیں
کہتے تھے کہ فلاں چیز لو یا تم نے تو کچھ بھی نہیں کھایا اور کھاؤ۔ بلکہ
ان کی "پرخوری" کا مذاق اڑاتے۔ ان کی "حد سے زیادہ بے تکلفی" پر
فقرے کستے اور کھانے ناشتہ کے وقت وہ پہنچ جاتے تو کہتے "مانوگے
تو ہو نہیں، ناشتہ تو کرو گے ہی" وغیرہ وغیرہ۔ ان کے چاہنے والے
ان کی محبت کے یہ سب انداز پہچانتے تھے اور ان کا ہتھیار خود ان پر
الٹ کر اپنی خاطر خود کر لیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو
اپنے کھانے پینے کے معاملے میں ذرا سی چہل بھی برداشت نہیں کر سکتے
کہ یہ ہنسی مذاق کی باتیں ہیں۔ وہ ان کی باتوں کا برا مان جاتے۔ مگر
سیدین صاحب کے ذہن میں یہ بات مشکل سے آتی کہ کسی شخص میں

حسِ ظرافت کا اس قدر فقدان ہو سکتا ہے کہ وہ اس صریحی مذاق کو نہ سمجھ سکے۔ جب پتہ چلتا تو انہیں اس پر حیرت بھی ہوتی اور تکلیف بھی۔ ایک دائمی مہمان اسی قسم کی ٹھہری ہوئی تھیں اور لڑکیاں ان کو منع کرتی رہتی تھیں کہ وہ ان سے اس معاملے میں مذاق نہ کریں۔ ایک دن میں پہنچی۔ بھائی جان نے اپنے "دستور" کے مطابق میری "خاطرداری" کرنی شروع کی۔ کسی لڑکی نے کہا پاپا آپ کیوں پھوپھی جان سے ایسا کہتے ہیں۔" ناراض ہو کر بولے۔ "میرے اور میری بہن کے معاملے میں مہربانی کرکے کوئی دخل نہ دے!" ان کی خاطرداری کی یہ ادا ان کے چاہنے والوں کو اتنی عزیز تھی کہ اس کے بغیر بھی زندگی میں بڑی محرومی محسوس ہوتی ہے۔

بیگم سیدین کے انتقال کے بعد سیدین صاحب اپنی ذات کی طرف سے اور بے پروا ہو گئے تھے۔ دوا علاج سے مجبور تھے کہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ ہم لوگ اس کی طرف سے بے پروائی کرنے نہ دیتے تھے۔ مگر دکھ رہتا کہ اتنے روپے دواؤں اور معائنے پر خرچ ہو گئے۔ آخر کے دو سال میں اس پر میری اور لڑکیوں کی کئی بار ان سے بحث ہوئی۔ ایک بار میں نے کہا "بھائی جان آخر آپ کے پاس جو کچھ روپیہ ہے وہ آپ کی ذات پر کیوں خرچ نہ ہو۔" کچھ ناگوار ہوا "نہیں وہ سب لڑکیوں کی امانت ہے۔" میں نے کہا کہ آپ کی لڑکیاں سب برسرِکار اور صاحبِ حیثیت ہیں اور آپ کی جان کے مقابلے میں ان کو اس پیسے کی ذرہ بھر پروا نہیں۔ یہی بات لڑکیاں کہتی تھیں۔ مگر وہ ہماری باتوں پر اس طرح تیوری پر دو ایک بل ڈال کر خاموش ہو جاتے

جیسے کہہ رہے ہوں کہ جواب جاہلاں باشد خموشی!

وہ نہ اپنے سکھ چین کی فکر کرتے اور نہ اپنی ذات پر خرچ کرنا پسند کرتے۔ مجید خاص ان کے کام کے لئے ملازم تھا اور وہ بہت خوشی سے ان کا کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ گھر کا ہر کام اور دوسرے گھر والوں کی ہر خدمت وہ کرتا اور خود سیدین صاحب برائے نام اس سے کوئی خدمت لیتے۔ جہاں تک ہو سکتا وہ اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے بستر کرنا، میز صاف کرنا، کتابیں ٹھیک سے رکھنا، باتھ روم کی صفائی وغیرہ۔ بلکہ دوسروں کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے اور زیادہ خوش ہوتے۔ اس جسمانی تکلیف میں بھی انہیں لطف آتا تھا۔ لوگ "ہیں ہیں" کرتے رہ جائیں اور وہ کرسی اٹھا لیں گے۔ میز گھسیٹ لیں گے۔ اور جانے کتنے ایسے کام وہ آخر تک کرتے رہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ کام کوئی مرد نہیں کرتا ہے بلکہ یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ اس حیثیت کا انسان جس کے لئے گھر کے افراد اور نوکر ہر وقت خدمت لئے مستعد رہتے تھے اسے دوسروں سے کام لے کر بہت کوفت ہوتی تھی۔ اور جو بھی ان کا کوئی کام کرے اس کا بار بار شکریہ ادا کرنا، کام کی تعریف کرنا اور دل سے احسان مند ہونا ان کی عادت تھی۔

گذشتہ کئی سال سے کھانا رفتہ رفتہ بہت کم رہ گیا تھا۔ چائے کا ان کو ہمیشہ سے شوق تھا۔ اور بھابی جان سے چائے بنوا کر اکثر بے وقت بھی پی لیتے تھے۔ مگر اب محض دو وقت کی چائے کی عادت رہ گئی تھی۔ اس سے جو لطف اٹھاتے تھے وہ ختم ہو چکا تھا

صبح کی چائے مدّت سے چھوڑ دی تھی۔ کسی نوکر کو یہ تکلیف دینا کہ وہ سویرے سویرے اٹھ کر ان کو گرم گرم چائے بستر پر دے انہیں گوارا نہ تھا۔ بہانہ یہ بنا دیا تھا کہ مجھے صبح کو چائے اچھی نہیں لگتی۔ اپنے پر سختی اُٹھانا، دوسروں کو آرام پہنچانا ان کا شعار تھا۔ بیوی سے تو مجبور تھے کہ جب تک وہ زندہ رہیں انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی ان کی خدمت کو بنا لیا تھا۔ اور سیدین صاحب جانتے تھے کہ اگر انھوں نے "عزیزہ" سے یہ مسرت چھین لی تو انہیں بہت دکھ اور شکایت ہوگی۔ مگر کسی اور سے کام کرانا ان پر گراں گزرتا تھا۔ گھنٹوں میز پر بیٹھے لکھتے رہتے۔ پانی تک کے لئے کسی کو آواز نہ دیتے۔ اکثر یہ ہوتا کہ میں ان کے پاس جاتی تو پانی پیتی، اور ایک گلاس ان کو بھی پلا دیتی — "کیوں آخر؟" ۔ "پی لیجئے" میں کہتی۔ "COMPULSORY ہے؟" "جی ہاں!" وہ پانی پی لیتے میرے لئے کچھ چائے کافی بنوانا چاہتے تو بجائے نوکر کو بلانے کے مجھ سے کہتے تم جا کر کچن میں خود بنا لو یا وہاں جا کر مقبول سے کہہ دو۔

نیا جوتا نہ خریدتے، نئے کپڑے نہ بنواتے۔ کبھی میں ان کو بہت پرانا کرتا پہنے دیکھتی تو چپکے سے کسی سوراخ میں انگلی ڈال کر اسے اور پھاڑ ڈالتی اور ان کی ڈانٹ کھاتی۔ کبھی میں کہتی بھائی جان یہ پاجامہ تو بہت پرانا اور پھٹا ہوا ہے۔ کہتے "ہمیشہ تیری نظر برائی پر پڑتی ہے۔ یہ کیوں نہیں دیکھتی کہ کرتا ثابت اور نیا ہے!" میں یا لڑکیاں چپکے سے ان کے لئے کرتے سلوا دیتے یا جوتا وغیرہ خرید لاتے تو کئی دن تک ان کی پیار بھری خفگی سہارنی پڑتی تھی

کیا کیا باتیں اس درویش صفت انسان کی سناؤں؟ اس کو تو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا اور زندگی ساتھ گذارنے کی سعادت پائی ہے۔

میں نے ان کی کفایت شعاری کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے لیکن جیسا کہ شاید میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے، یہ ساری کفایت شعاری اور جزرسی اپنی ذات کے لئے تھی۔ دوسروں کے لئے بہت فیاض تھے۔ پہلے خاندان کا بار بڑی سیر چشمی سے اٹھایا پھر دوسری طرح لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بزرگوں کے پیسے اور جائیداد پر بڑے بڑے حیثیت والوں اور ایک دوسرے کو چاہنے والے بھائیوں اور بہنوں میں بدمزگی ہوتے میں نے بارہا دیکھی ہے۔ اور ایک ایک پیسہ کے لئے، ایک ایک چیز پر، اکثر لوگ جان دیتے ہیں۔ مگر ہمارے والد مرحوم نے بھی اپنے والد کے انتقال کے بعد باپ کی چھوڑی جائداد بھائی بہنوں کو دے دی تھی۔ لیکن خود اپنے قوت بازو سے پیدا کی ہوئی تھوڑی جائیداد اپنے کم سن بچوں کے لئے وہ چھوڑ گئے تھے۔ جب تک والدہ زندہ رہیں وہ تمام تر مختار تھیں جو چاہتیں کرتیں۔ ان کے انتقال کے بعد بہت مشکل سے غیر دیانت دار کارندوں سے، جو مختار عام تھے، جو تھوڑا بہت وصول ہوتا اس سے کبھی کپڑے بن جاتے، کبھی محرم کا خرچ چل جاتا۔ سید ین صاحب کاروباری سوجھ بوجھ رکھتے ہی نہ تھے اس لئے یہ قصہ یوں ہی چلتا رہا۔ غالباً ۴۰ء کا ذکر ہے جب چچا ابا مرحوم کے اصرار پر یہ طے ہوا کہ جائیداد

کی تقسیم (قانونی نہیں صرف زبانی) بھائی بہنوں میں کردی جائے اس وقت میرے فیاض بھائیوں نے یہ طے کیا کہ ان کی دونوں بہنوں کو شرعی حصہ سے زیادہ دیا جائے۔ یعنی چاروں کو برابر حصے ملے۔ اتنا ہی نہیں ہم دونوں بہنوں کو وہ مکان دیے گئے جن کے ساتھ دوکانیں بھی تھیں۔ اور گھر بھی اچھی حالت میں تھے۔ چھوٹے بھائی کو جو مکان ملا وہ ہمارے مکانوں سے کم قیمت کا تھا۔ اور خود سیدین صاحب نے ایک ایسا مکان اپنے حصے میں لگایا جو بالکل شکستہ تھا۔ صرف زمین کام آسکتی تھی۔ باغ اور کھیت میں چاروں حصہ دار رہے۔

مگر سیدین صاحب پیسہ کو ناقدری کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور زندگی میں اس کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اپنی قوت بازو سے کمائے ہوئے پیسے میں سے جہاں تک ہوسکے پس انداز کرکے اپنے بیوی بچوں کے لئے کچھ اثاثہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ وہ ان کے بعد مشکلات میں نہ مبتلا ہوں۔ بھابی جان کی زندگی تک بہت کم پس انداز ہوسکا اور جو تھوڑا بہت روپیہ، گھر، حصے وغیرہ تھے بھی سب انھوں نے بھابی جان کے نام کردیے تھے مگر یہ کس کو خبر تھی کہ وہ ان سے پہلے ہی سدھار جائیں گی۔ بھابی جان کے بعد انھوں نے نسبتاً زیادہ پیسہ بچایا جو مکان میں لگایا، کچھ حصے وغیرہ خریدے۔ ان میں کئی بار ان کو نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اور بعض وقت فائدہ بھی ہوا۔ بہرحال وہ اپنی جفاکشی اور کفایت شعاری کی بدولت اپنے بچوں کے لئے کچھ سرمایہ چھوڑ گئے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کا گھر ان کے بعد

بھی خاندان کا مرکز رہے ۔ اور جس طرح ان کی زندگی میں سب عزیز اور دوست یہاں آکر راحت و مسرت پاتے تھے وہ روایت باقی رکھی جائے ۔

لیکن ان کا اصل سرمایہ کیا تھا ۔ وہ خود اپنی وراثت کیا سمجھتے تھے ؟ اس بات کا اندازہ اس نامکمل وصیت نامہ سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۲ء میں لکھنا شروع کیا تھا ۔ مگر اس کی تکمیل نہ ہوسکی ۔ ان کے کاغذات میں ایک کاپی پر لکھی مجھے یہ عبارت ملی ہے جو میں نیچے درج کر رہی ہوں ۔

"۱۶ / مارچ ۱۹۶۲ء

اگر انسان کے پاس بہت سی دنیوی دولت اور جائیداد ہوتی ہے تو وہ اپنے وصیت نامے میں اس کی تقسیم اور انتظام کا ذکر کرتا ہے اور اپنے وارثوں کو اُن کا حق پہنچانے کی کوشش کرتا ہے ۔ خدا نے اپنی مہربانی اور مصلحت سے مجھے اس بار سے محفوظ رکھا ہے ۔ "محفوظ" اس لئے کہتا ہوں کہ دولت ایک "مشکوک نعمت" ہے ۔ یقیناً اس سے دنیا کے بہت سے کام نکلتے ہیں ۔ اور جب تک کسی فرد یا جماعت کے پاس مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ایک معقول حد تک نہ ہو ، اس کے لئے ایک "اچھی زندگی" کی بنیاد ڈالنا مشکل ہوتا ہے ۔ لیکن اس میں بہت سے خطرے بھی ہیں کیونکہ دولت میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ذریعہ بننے

کے بجائے مقصد بن جاتی ہے۔ اور انسان کی تمام توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ لیکن منتھے کی مشہور کتاب STORY OF SANMICHALE میں لکھا ہے کہ روپیہ کو دیر تک ہاتھ میں نہ رکھو ورنہ وہ تمھارے ہاتھ کی ہتھیلی میں سے تمھاری رگوں میں داخل ہوگا۔ تمھارے خون میں زہر کو پھیلائے گا اور وہ زہر تمھارے جسم اور دل و دماغ میں سرایت کر جائے گا اور تمھاری شرافت، محبت اور ہمدردی کو گھن کی طرح کھا جائے گا...... بہر حال میری ناقابلیت ہو یا روپیہ کی محبت کا نہ ہونا، زندگی میں کافی کمایا لیکن اس سے شاید زیادہ ہی خرچ کر دیا اور خدا کا شکر ہے کہ اس میں سے اپنی ذات پر ضرورت سے کم خرچ کیا زیادہ نہیں کیا۔ اس لئے میرے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ اپنے خاندان والوں، بالخصوص اپنی بیوی بچیوں کو، کوئی باضابطہ قانونی وصیت نامہ لکھ کر دوں۔ جانتا ہوں کہ جو کچھ بھی چھوڑ سکوں گا اس کو وہ شرافت اور دیانت داری سے بانٹ لیں گی....

لیکن ایک دوسری دولت خواہ وہ کتنی ہی کم اور ناکافی مقدار میں ہو، میرے پاس ضرور ہے جس میں اپنے پیاروں کو شریک کرنا میرا فرض ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا ہے زندگی میں بھی کوشش کی کہ وہ اس میں آزادی کے ساتھ شریک ہوں اور آرزو یہ ہے کہ جس حد تک

زمانے اور عمر کے اختلافات کا احترام کرتے ہوئے یہ بات ممکن ہو) وہ میرے بعد بھی اس میں حصہ دار رہیں اور وہ دولت ہے (اگر میں بہت عاجزی اور انکساری کے ساتھ کہہ سکوں) میرے خیالات اور جذبات، میرے زندگی کے آدرش، میری قدریں، میری آرزوئیں اور امنگیں جن میں سے بہت کم پر عمل کر سکا۔ بہت کم کی خدمت کر سکا لیکن جو ایک حد تک ہمیشہ زندگی پر اپنا سایہ رحمت ڈالتی رہیں..."

اس کے بعد انھوں نے اقبال کے کچھ اشعار کو اپنے دل کا ترجمان بنایا ہے۔ یہ اشعار ہم پچھلے کسی باب میں ان کی زبان سے نقل کر چکے ہیں۔

آگے چل کر انھوں نے لکھا:۔

"۱۷، مارچ ۶۲ء

اکثر اس سوچ میں رہا ہوں کہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کس چیز کی ہے۔ اور مختلف موقعوں پر اور مختلف ذہنی کیفیتوں میں مختلف جواب ذہن میں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے دو ایسے ہیں جن کا ایک طرح میرے فکر پر تسلط ہے۔ ایک تو یہ کہ دنیا میں سب سے اہم چیز کام ہے۔ یہی زندگی کی قیمت ہے جو ہر شریف انسان کو ادا کرنی چاہیئے۔ کام جو محنت اور دیانت داری کے ساتھ کیا جائے۔ جس میں کرنے والا اپنی صلاحیتوں کی

بازی لگادے، کام جس کا مقصد محض اپنی ذات کے لئے نفع کمانا نہ ہو بلکہ وہ کسی بڑے مقصد کی خاطر کیا جائے، جس میں کرنے والا خود کو کھو سکے۔ جو لوگ پوری دیانت کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے خواہ وہ "چھوٹا" کام ہو یا بڑا، وہ خود کو اور دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس لئے میرا خود سے اور دوسروں سے ہمیشہ یہ تقاضا رہا ہے کہ کام کو اسی شان اور انداز سے کرنا چاہیے (گو خود کو اس پر پوری طرح عمل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی) میں نے تعلیم کے میدان میں بھی اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ بچے اور نوجوان کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ کام کی عظمت کو پہچانے، اس میں اظہارِ خودی کی مسرت حاصل کرے اور ہر قسم کے چالو اور گھٹیا کام کرنے کو، یعنی خانہ پُری کرنے کو شرافت انسانی کی توہین سمجھے.....

لیکن اس کے ساتھ دوسرا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کام زیادہ اہم ہے یا انسان؟ شاید اس سوال کو واضح کرنا مشکل ہے۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر چیز کا پیمانہ ہے۔ اور اس کو سمجھنا، اس سے محبت اور ہمدردی کرنا، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، رفاقت کی قدریں کھوجنا، کھوٹ کھپٹ اور تعصب..... کی دیواروں کو توڑنا، حیات بہتر کا مرکزی مقصد ہے۔ ان دونوں چیزوں

میں جو اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت رکھتی ہیں، کبھی کبھی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ کام کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے، ایک روشن دماغ سائنس داں کے لئے، ایک صاحب دل آرٹسٹ کے لئے، ایک علم کے سیوک کے لئے کہ وہ خود کو اس میں ضم کر دے۔ اور اپنے انسانی رشتوں کو اس میں حائل نہ ہونے دے۔ چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے انفرادیت پسند پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے سماج کے بندھنوں کے ساتھ سمجھوتا نہیں کیا بلکہ اپنے کام کی خاطر، جس کی ایک مثالی تصویر ان کے ذہن میں تھی انھوں نے انسانی رشتوں کو قربان کر دیا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ کیا انسان سے انسان کا رشتہ اٹوٹ نہیں ہے۔ جس کی خاطر ضرورت کے وقت ہر دوسری قدر کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب میرے بس کی بات نہیں کیوں کہ اس میں فرد اور سماج کی اضافی حیثیت کی تمام تاریخی بحث مضمر ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض غیر معمولی افراد کو چھوڑ کر، بالعموم انسانی تعلقات کی اہمیت اس درجہ زیادہ ہے کہ ان کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔"

"۱۸ مارچ ۶۲ء"

جب سے انسان نے غور و فکر کی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ خوشی

کا سرچشمہ کہاں ہے، اس کے اندر یا باہر؟ بہت سوں نے خوشی کو اپنے سے باہر تلاش کیا ہے۔ دولت اور قوت کی تلاش میں، اسبابِ دنیا کے جمع کرنے میں، دوستوں اور عزیزوں کی صحبت اور محبت میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہیں۔ اور اگر انسان کو مادّی زندگی کی ضرورتیں تک میسر نہ ہوں تو اس کے لئے خوش رہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ بہت سے لوگ ہیں، جن کو خدا نے (یا خوبیٔ تقدیر نے) دولت دی ہے قوت دی ہے، مال و اولاد کی نعمت دی ہے۔ لیکن سچی خوشی محروم ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اندر کچھ نہیں۔ ان کے من کھوکھلے ہیں۔ وہ مفلس ہیں، ان میں شوق، دلچسپیاں، آرزوئیں، امنگیں، کچھ کرنے کی خواہش، کچھ بننے کی تڑپ نہیں۔ ان کو اگر بیرونی محرکات نہ ملیں تو وہ اس طرح سوکھ کر رہ جائیں جیسے پودا ہوا اور پانی کے بغیر مرجھا جاتا ہے۔ وہ خود کو ENTERTAIN نہیں کر سکتے، اپنے ساتھ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ مانتا ہوں کہ مادّی حالات اور ماحول سازگار ہونا ضروری ہے اور ہر شخص کسی یوگی یا راہب کی طرح نہ نفس کشی کر سکتا ہے نہ اپنی قدرتی

خواہشوں کو دبا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ محض عارضی خوشیوں کے پیچھے بھاگے تو وہ ایک چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔ حقیقی مسرت (جو محض لذت پسندی سے بہت مختلف چیز ہے) من کی دولت پر منحصر ہے۔ میں نے زندگی میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنھوں نے غلط قسم کی خوشی تلاش کی ہے اور انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ منزل تک پہنچے ہی نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو بظاہر سب کچھ مل جاتا ہے لیکن دل کی دنیا ویران ہی رہتی ہے۔ برخلاف اس کے جن لوگوں کو قناعت اور خود اعتمادی کی دولت میسر ہوتی ہے۔ وہ بیرونی سہاروں پر بھروسا نہیں کرتے.....“

”۲۲ مارچ ۶۲ء

بڑے بڑے کام کرنے کی فکر بہت لوگوں کو ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی سچی بڑائی کا اندازہ ان کاموں سے نہیں ہوتا جو بعض اوقات وہ جوش اور جذبات کی شدت اور تحسین عوام سے متاثر ہو کر کرتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان روزمرہ کے

چھوٹے چھوٹے کاموں میں شرافت، دیانت داری، انسان دوستی اور خدا ترسی کا ثبوت دیتا ہے۔ ایسے کاموں میں جو اسٹیج پر نہیں کئے جاتے بلکہ گھر کی چار دیواری میں یا بالکل تنہائی میں جہاں نہ کوئی سراہنے والا ہوتا ہے نہ لوٹنے والا، بس اپنا ضمیر ہے یا خدا پر ایمان، جو نگرانی کرتا ہے۔ اچھے آدمی کی پہچان یہی ہے کہ وہ روزمرّہ کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں اور باہمی تعلقات میں، مثلاً بیوی اور بچوں سے سلوک، نوکروں سے برتاؤ، دوستوں اور دست نگراں کے ساتھ مراسم میں، اپنی شخصیت کی خوبیاں ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ انسان چھوٹی چھوٹی باتوں کو محنت، دیانت داری اور شرافت کے ساتھ کرے تو بڑے —— مقاصد گویا خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ پیسوں کی فکر کرو، روپے اپنی فکر خود ہی کر لیں گے۔ یہ اسی اصول کی ایک مختلف توضیح ہے....."

ان کے انتقال کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار کو میں نے ان کا یہ وصیت نامہ اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ عرصے کے بعد مجھے جواب ملا کہ "وصیت نامہ صرف ورثا کے لئے ہوتا ہے

.... ہر کسی کے لئے نہیں "۔ لیکن خدارا مجھے کوئی بتائے کہ سیدین کا یہ (نامکمل) وصیت نامہ کیا صرف ان کی اولاد کی وراثت ہونا چاہئے؟ کیا ہر وہ نوجوان جو سیدین صاحب سے کسی نہ کسی صورت میں بلا واسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوا ہے، یا ان قدروں کی عزت کرتا ہے جوان کو عزیز تھیں .... اس کا حقدار نہیں کہ سیدین صاحب کی اس "دولت" کا وارث بنے جو انھوں نے ان چند اوراق کی صورت میں چھوڑی ہے؟

سوا سال بعد اس وصیت نامہ میں یہ آخری صفحہ بڑھایا گیا...

"۱۴ / مئی ۶۳ء

ان چند صفحوں کو لکھے ایک سال سے زیادہ ہوگیا اور میرے سر سے قیامت گزر گئی کہ میری بیوی کو خدا نے اپنے حضور میں طلب کر لیا اور یہ امید جاتی رہی کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میری بیوی اور بچوں دونوں کے لئے ہوگا۔ انسان کیا سوچتا ہے اور خدا کیا کرتا ہے اس حادثے کے بعد بار بار یہ خیال آتا ہے کہ موت کا ایک اہم سبق یہ ہے کہ انسان کو جس کسی سے نیکی کرنی ہے وہ اس کی زندگی میں کر لینی چاہئے۔ چراغ بجھ گیا تو اس وقت آرزو اور حسرت کی خلش رہ جاتی ہے اور بس۔ اور نیکی میں محبت، خدمت، دل سوزی، رفاقت وہ سب چیزیں شامل ہیں جو انسانوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ کس قدر کوتاہ نظر ہیں وہ لوگ جن کو اپنے دوستوں،

عزیزوں، محبوبوں کی زندگی کی نعمت حاصل ہے اور وہ اس انمول وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مخالفتوں، بدگمانیوں، دل آزاریوں، خودغرضیوں، نفسانیتوں میں۔ انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ محبت اور ہمدردی کرنے کا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور یہ احساس توشاذ ہی ہے کہ اصل چیز یہ نہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں بلکہ ہم انکے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ نیکی اور شرافت اور خوش سلوکی تو بیشتر لوگوں کو جیت سکتی ہے اور ان کی دل تنگیوں اور مخالفتوں کو اس طرح پگھلا سکتی ہے جس طرح گرمی موم کو۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا تو یہ کیا کم ہے کہ ہم خود دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کریں .... اس مرحومہ نے اپنی ساری عمر دوسروں کے ساتھ نیکی کی اور ہمیشہ یہی کہا کہ میرا کام یہ نہیں کہ اپنے ساتھ دوسروں کا سلوک دیکھوں۔ بلکہ جو باتیں میرے نزدیک اچھی ہوں، انھیں انجام دوں۔ نتیجہ اس کے ہاتھ ہے جو نتیجہ نکالتا ہے میرے ہاتھ نہیں ...."

اور یہاں اچانک وصیت نامہ ختم ہوجاتا ہے ....

ان چند صفحات سے سیدین صاحب کی سیرت اور ان کے خیالات اور طرز فکر پر کس خوبی سے روشنی پڑتی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

بچو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

سیدین صاحب بائیس برس دل کے مریض رہے۔ مگر چند لوگوں کے سوا کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ ایسے سخت مرض میں مبتلا ہیں۔ کس قدر مختلف تھا ان کا انداز دل کے دوسرے مریضوں سے جو زندگی سے مایوس ہو کر ہاتھ پیر چھوڑ دیتے ہیں، وہم کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے اور اپنے کو کام، کم سے کم بڑے اور اہم کام کرنے کے ناقابل سمجھ لیتے ہیں۔ ابھی حال میں، مجھ سے ایک بڑے شاعر نے کہا، اب نئی چیز کیسے فلاں شاعر، یا فلاں ادیب لکھ سکتا ہے۔ دل کی بیماری کے بعد کوئی تخلیقی کام کیا ہی کیسے جا سکتا ہے، جس سے دل پر اثر پڑتا ہے دماغ پر زور اور بار پڑتا ہے۔ اور میں سوچتی رہ گئی کہ میرے بھائی جان کے پاس وہ کون سی قوت تھی جو بائیس سال تک ان سے ایک سے ایک اہم، سنجیدہ، کٹھن تخلیقی کام کراتی رہی۔ اور کبھی ان کو اس کی فکر نہیں ہوئی کہ اس کا بار ان کے دل یا دماغ پر پڑے گا؟ اس طویل عرصے کے ایک ایک پل کو انھوں نے عطیہ الٰہی سمجھا اور اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر دنیا کو فیض پہنچانے کی کوشش کی۔ میں نے

سنا اور پڑھا ہے کہ میرے والد خواجہ غلام الثقلین کہا کرتے تھے "کام کرنا، کوشش کرنا ہمارا کام ہے ـــــ نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہم نہ ہوں گے تو کیا ہے، دنیا کے کام بند تو نہیں ہوں گے" زندگی کی طرف سے یہی رویہ ان کے بیٹے کا تھا کہ میرا کام آخری دم تک اپنے فرائض ادا کرنا اور اپنے مقصد کے لئے کام کرنا ہے۔ نتیجہ کی میں کیوں فکر کروں۔؟ اسی لئے وہ موت و زیست کی فکروں سے آزاد رہ کر اپنے کاموں کو سکون اور طمانیت سے انجام دیتے رہے۔

جو لوگ واقف نہ ہوتے وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ یہ ہنس مکھ، زندہ دل، محنتی انسان، جس کے سامنے ـــــ ایک وقت میں کئی کئی تخلیقی کام ہیں۔ جو یونیورسٹیوں میں جا کر کانوکیشن اڈریس پڑھتا ہے، توسیعی لکچرز دیتا ہے، ریڈیو پر بولتا رہتا ہے۔ دیس بدیس کی کمیٹیوں میں شریک ہوتا ہے۔ مقامی اسکولوں و کالجوں اور تعلیمی اداروں سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ اور ان کا بہترین مشیر ہے، دل کے ایسے شدید مرض میں مبتلا ہے؟ شاید کبھی کسی نے بھی ان کے منھ سے حرفِ شکایت نہیں سنا۔ سخت سے سخت بیماری کی حالت میں بھی جب دوست اور عزیز مزاج پرسی کو آتے تو وہ "شکر ہے خدا کا، ٹھیک ہوں!" کہتے یا زیادہ سے زیادہ ذرا سا منھ بنا کر اتنا کہہ کر "چل رہا ہے جیسا بھی ہے" بات کا رخ پلٹ دیتے، اپنی بیماریوں کا تذکرہ، بکھان، تفصیل، جو ہم میں سے بیشتر انسان ذرا سی مزاج پرسی پر کرنے لگتے ہیں (اور یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کو بہت کم جواب سننے کی فکر ہوتی ہے) سیدین صاحب کو ذرا بھی پسند نہ تھا، وہ تو الٹی دوسروں کی مزاج پرسی کرتے،

ان کے بال بچوں کا احوال پوچھتے۔ ان کے کام کے بارے میں باتیں کرتے اور دوسرے سیاسی، علمی، ادبی، یا جیسا سامع ہو، اس کے ذوق کے مطابق دل چسپ موضوع زیر بحث آتے۔ پرسان حال بالکل بھول جاتا کہ وہ کسی مریض کے کمرے یا اسپتال کے وارڈ میں بیٹھا ہے، بلکہ ان کی جانفزا صحبت سے وہ لوگ جو خود مریض یا نیم مریض ہوتے، اپنے کو صحت مند اور توانا محسوس کرکے اٹھتے تھے۔

ڈاکٹروں، نرسوں اور اسپتال کے عملے سے ہمیشہ ان کے بہت اچھے تعلقات ہو جاتے تھے۔ کسی بھی ہسپتال میں وہ داخل ہوں نرسیں ان کے گرد پروانہ وار گھومتیں اور ان کا کام دل وجان سے انجام دیتیں۔ اور یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ ہمارے اسپتالوں میں نرسوں کا طرز عمل مریضوں سے عام طور پر کسی قدر رسمی بلکہ اکثر کھرا ہوتا ہے۔ سیدین صاحب ایک تو ان کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے اور کم سے کم، اپنے کام کے لیے ان کو بلاتے تھے، دوسرے ان کی خدمت اور ذاتی خوبیوں کو (جو اکثر وہ فرض بھی کر لیتے تھے) دل کھول کر سراہتے۔ کسی کی صورت کی، کسی کی آواز کی، کسی کے مزاج کی تعریف کرتے۔ ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے تھے۔ نرسوں کو ایسے مریض کہاں نصیب ہوتے ہیں؟

اور ڈاکٹروں سے تو ان کی گاڑھی دوستی ہو جاتی تھی۔ پونا اور بمبئی کے معالجوں سے لے کر، کشمیر، رام پور اور پھر دہلی کے سبھی ان کے معالج ان کے دوست تھے۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر بجاج یا ڈاکٹر چکارا یا کوئی اور ان کی بیماری سن کر محض دوستی میں ان کے گھر

دوڑے چلے آتے تھے۔ ولنگڈن اسپتال کے ڈاکٹر ہوں یا ہولی فیملی ہاسپٹل کے بیسیوں ہی لوگوں نے مختلف اوقات میں ان کی دیکھ بھال کی ہے۔ ہر معالج ان سے بے حد متاثر ہوتا اور ان سے محبت کرنے لگتا تھا۔ سنا ہے کہ یہی حال امریکہ میں تھا جہاں کبھی ان کا علاج ہوا۔ خود سیدین صاحب یوں تو ان میں سے ہر ایک کو قلبی دوست سمجھتے ان سے خلوص اور یگانگت کا برتاؤ کرتے اور دل سے ان کے شکر گذار رہتے تھے لیکن ڈاکٹر کے۔ ایل۔ وِگ سے، جو لگ بھگ پندرہ برس سے ان کا اور ان کے خاندان بھر کا علاج کرتے تھے۔ انھیں بڑی گہری محبت تھی۔ وہ صرف معالج ہی نہ تھے بلکہ بہت سی باتوں میں ان کے ہم مذاق اور ہم خیال بھی تھے۔ ڈاکٹر وِگ سے جو بے حد کم گو، کم آمیز، بڑے سنجیدہ اور باوقار شخص ہیں گھنٹوں سیدین صاحب کی علمی ادبی، سیاسی گفتگو ہوتی۔ اپنی ہر کتاب سیدین صاحب ڈاکٹر صاحب کو دیتے جس کو وہ شوق سے پڑھتے تھے۔ ذرا دیر بیماری کی باتیں ہوتیں، وہ ان کا معاینہ وغیرہ کرتے، ہدایات دیتے اور پھر دونوں میں دلچسپ باتیں ہونے لگتیں۔ مریض اور معالج کا رشتہ ختم ہوجاتا۔ اب وہ دو دلی دوست ہوتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاں دعوتوں اور تقریبوں میں شریک ہوتے۔ خوشی اور غم میں حصہ لیتے۔ ڈاکٹر وِگ سے سیدین صاحب ہی کو نہیں بلکہ ان کے خاندان بھر کو ایک گہرا لگاؤ اور ان کے علاج پر پکا عقیدہ تھا اور ہے ڈاکٹر اور مریض کے ایسے گہرے اور پرخلوص تعلقات شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئیں۔

سیدین صاحب کو اپنے نئے گھر میں آئے شاید دو مہینے ہوئے

تھے کہ ۲۰؍ اکتوبر ۷۷ء کی شام کو میں سبدین صاحب کے ساتھ گاندھی جی کی سمادھی پر گئی۔ جہاں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر انھوں نے کلام پاک کی تلاوت بھی کی اور ایک پر اثر تقریر بھی۔ واپسی تک خاصی سردی ہو گئی تھی۔ ۲۳؍ اکتوبر کی شام کو انھیں کچھ سانس کی تکلیف محسوس ہوئی اس سے پہلے سانس کی تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے حسب عادت دوسروں کو پریشان نہیں کرنا چاہا اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔ مگر رات میں تکلیف کی شدت بڑھ گئی۔ تو مجبوراً گھنٹی بجا کر تقیہ بیگم (ملازمہ) کو بلایا، انھوں نے گھبرا کر بلقیس کو جگایا، ہم لوگوں کو خبر ہوئی۔ مقامی کمپونڈر سومناتھ صاحب کو اور ایک دوست ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا۔ ڈاکٹر دگ کو ٹیلیفون کیا گیا صبح کو وہ آئے۔ دیکھا، دوائیں تجویز کیں۔ آرام کرنے کا مشورہ دیا اور الگ لے جا کر عابد صاحب سے تشویش کا اظہار کیا اور کہا کسی دوسرے ڈاکٹر کو بھی علاج میں شریک کر لیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت فوراً طبی امداد مل سکے۔ ان کے مشورے سے ہولی فیملی کے ڈاکٹر بی۔ ماتھر کو علاج میں شریک کیا گیا۔ اور ہم سب اپنی بے قراری اور پریشانی کو چھپانے کی جدوجہد کرتے، تیمارداری سے زیادہ ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ بلقیس نے گھبرا کر بمبئی فون کر کے شیریں کو بلا لیا۔ دوسرا تار اپنی اور سبدین صاحب کی مشترک امریکن دوست لوئس خاں کو (جو ان کے ہاں مہمان ٹھہری تھیں مگر اس وقت اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان گئی ہوئی تھیں) دیا۔ وہ بھی تین دن کے اندر اندر آ گئیں۔ علاوہ سبدین صاحب کو کمپنی دینے کے، ان کے لئے پرہیزی بے نمک اور بے گھی کا کھانا تیار کرنے میں خاص طور پر مددگار ثابت ہوئی۔

سیدین صاحب کو اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں "ورلڈ کانفرنس آف ریلیجن فار پیس" میں شرکت کرنے جاپان جانا تھا۔ وہ اس کے انتظامیہ کے ممبر تھے اور کئی سال سے ان کمیٹیوں میں جو اس کی تیاریوں کے سلسلے میں دنیا کے مختلف حصوں میں ہو رہی تھیں، شریک ہوتے رہے تھے۔ بیمار پڑنے کے بعد پہلے تو وہ یہی سمجھتے رہے کہ دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مگر جب اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر "آرام" کی مدت بڑھاتے جا رہے ہیں تو پریشان ہو گئے۔ بار بار انھوں نے ڈاکٹروں سے اصرار کیا کہ انھیں جاپان جانے کی اجازت دیدیں اس لئے کہ انہیں اپنی بیماری سے کہیں زیادہ اس ذمہ داری کی فکر تھی۔ مگر ڈاکٹر ان کی حالت اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس سفر کی صعوبت برداشت کر سکیں گے۔ اس لئے وہ ان کے جانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ شاید کبھی ان کو اتنا صدمہ نہ ہوا ہوگا، جیسا اس وقت ہوا۔ مگر ہر صدمہ کو برداشت کرنا ان کی فطرت تھی۔ دل بجھ سا گیا اور شاید احساس ہو گیا کہ اب وہ لمبے سفر کے قابل نہیں رہے۔ لیکن ایک دو بار سے زیادہ افسوس کا اظہار بھی نہیں کیا۔ عابد صاحب بھی اس کانفرنس میں بحیثیت ڈیلی گیٹ شریک ہونے جا رہے تھے۔ بھائی جان کی بیماری کے پیش نظر وہ اپنا جانا ملتوی کرنا چاہتے تھے۔ مگر سیدین صاحب نے بہت اصرار کر کے انہیں بھیجا۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر چیپ فرنانڈس کو بلا کر ان کو ہدایات دیں۔ ان کو بھی سیدین صاحب کے نہ جا سکنے کا بہت افسوس تھا۔ مگر سبھی کو ان کی جان زیادہ عزیز تھی۔

تین چار ہفتے آرام کرنے کے بعد بظاہر وہ تندرست ہو گئے۔

اور پھر اپنے کاموں میں لگ گئے۔ نومبر میں آگرہ یونیورسٹی میں کانووکیشن اڈریس دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ اسی حالت میں اڈریس لکھا گیا۔ اور ڈاکٹر ووگ کو ان کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں جانے کی اجازت دینی پڑی۔ اس شرط کے ساتھ کہ ایک دن میں ایک ہی سفر کریں۔ اور ایک دن آرام۔ آگرہ سے کار ان کو لینے کے لئے بھیجی گئی۔ میں اور لوئس خاں ان کے ساتھ وہاں گئے۔ رات کو ہوٹل میں آرام کیا۔ اگلے دن پہلے وہاں کے ایک ویمنز کالج کو دیکھنے گئے۔ میری زبردستی سے سیڑھیاں چڑھنے سے پرہیز کیا۔ مگر اور سارا کالج دیکھا، وہاں لنچ کھایا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ بہت سے عمائدین شہر جمع تھے۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے سیدین صاحب سے مل کر ان کو بڑی دولت مل گئی ہے۔ تیسرے پہر میں کانووکیشن تھا۔ ہم لوگ گھبرا رہے تھے کہ بھائی جان بہت "اسٹرین" کر رہے ہیں۔ ہم دونوں نے ان سے اصرار کیا تھا کہ وہ اڈریس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ میں نے وائس چانسلر صاحب سے بھی چپکے سے کہہ دیا تھا۔ مگر جب اڈریس دینے کا وقت آیا تو بھائی جان نے نظریں ہماری طرف سے پھیر لیں اور کھڑے ہو کر چالیس پینتالیس منٹ کی یہ تقریر کی۔ لوگ ان کی تقریر کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کو ذرا بھی یہ اندازہ نہ ہوا کہ وہ چند دن پہلے کیسے سخت مرض سے دوچار ہو چکے ہیں۔ میں تقریر کیا سنتی! جان ناخنوں میں تھی کہ یہ خیر سے تقریر ختم کریں۔ اس کے بعد بھی وہ نہیں مانے۔ ایٹ ہوم میں شریک ہوئے۔ لوگوں سے ملے۔ لوگ ان کے انداز بیان اور دلکش اردو کی تعریف کرتے تھکتے نہ تھے۔ دو چار بڑے بوڑھوں کو کہتے سنا "ڈاکٹر صاحب، اب تو ایسی میٹھی زبان سننے کو کان ترستے ہیں!"

بڑی مشکل سے شام کو آرام کرنے لیٹے۔ مجھے اور لوئس کو اصرار کرکے تاج دیکھنے کے لئے بھیج دیا۔ اگلے دن صبح وائس چانسلر صاحب کے ہاں ناشتہ کیا۔ دو ایک اور مداحین سے ملنے گئے۔ واپس سیدھا آنا چاہیئے تھا کہ آرام کریں۔ مگر وہ کار میں علی گڑھ جانے پر مصر تھے کہ اپنی مرحوم بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ علی گڑھ گئے۔ قبرستان جاکر فاتحہ پڑھی، چند آنسو بہائے، ساجدہ[1] کے گھر دو گھنٹے قیام کیا، کھانا کھایا، اور کچھ دوست اور پرانے شاگرد آ گئے۔ ان سے ملے۔ رات کے قریب واپس دہلی پہنچے، ایک دن آرام کیا۔ پھر حسب معمول اپنے کاموں میں لگ گئے شام کو اکثر میں اور عابد صاحب کے ساتھ چہل قدمی کے لئے جاتے تھے کہ ان کو سوا ٹہلنے کے ہر قسم کی ورزش کی ممانعت تھی۔

عابد صاحب، اور بلقیس بار بار ڈاکٹر وگ سے کہتے تھے کہ آپ انہیں زیادہ کام کرنے اور سفر کرنے سے روکئے، کہ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محنت ان کی صحت کے لئے مضر ہے۔ مگر ڈاکٹر وگ ان کے صرف معالج ہی نہیں محرم بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی زندگی کام ہے۔ کام کے بغیر وہ چند دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ کم سے کم زندگی کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ بعد میں جب زہرہ امریکہ سے آگئی تو یہی وہ بھی کہتی رہی۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ان سے صرف اتنا ہی کہا کہ آپ کام کے بیچ بیچ میں آرام کرتے رہئے اور بہت زیادہ سفر نہ کیجئے۔ یہ بھی وہ بڑی ترکیب سے کہتے تھے جیسے کوئی کسی قلب کے مریض کو نہیں بلکہ اچھے بھلے آدمی کو مشورہ دے رہا ہو۔

---

[1] ساجدہ زیدی۔ بھانجی

تیمارداروں کا بھی ان کو خیال رہتا تھا۔ میرے سامنے تو وہ اطمینان ہی کا اظہار کرتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب میرے بارے میں کہتے تھے وہ سیدین صاحب سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہے کہ حقیقت کو FACE نہیں کر سکتی۔ لیکن زہرا اور عابد صاحب کو کسی حد تک صورت حال بتا دی تھی۔ اور مجھے تو رات دن، ہر لمحہ ان کی صحت کی فکر یوں ہی کھائے جاتی تھی۔ خود سیدین صاحب جیسے ذہین آدمی کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ کہ ان کی صحت روز بروز گر رہی ہے۔ وہ بیماری کی نوعیت اور خطرے دونوں کو خوب سمجھتے تھے۔ آج سے نہیں، برسوں سے، وہ ہر وقت اپنے خالق اور رب کے بلاوے پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھے۔ مگر معذور اور مجبور ہو کر زندہ رہنے کا تصور بھی ان کے لئے کرب ناک تھا۔ جب کبھی میں یا عابد صاحب یا زہرا اور بلقیس ان کے زیادہ کام کرنے اور سفر کرنے پر احتجاج کرتے تو وہ اکثر ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیتے گویا تم کہے جاؤ اس سے کیا ہوگا، کبھی کبھی آہستگی سے کہہ دیتے "میں برخوردار بستر ہو کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

اس آخری ایک سال دو مہینے میں بار بار ان کو دل کے دورے پڑے اور ہر بار وقفہ کم اور دورہ سخت ہوتا گیا۔ بہترین علاج اور تیمارداری ہوتی رہی۔ کئی بار اسپتال میں داخل کیا گیا۔ پرہیز د احتیاط میں وہ کمی نہ کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ہر ہدایت پر عمل کرتے مگر دواؤں کا اثر کم ہوتا جا رہا تھا باہر کے ملکوں کے جانے کا سلسلہ ختم کرنا پڑا جس کا ان کو بہت دکھ تھا۔ اور پھر آخر کے چند مہینوں میں دہلی کے باہر دوسرے شہروں میں جانے پر بھی ڈاکٹروں نے پابندی لگا دی۔ مگر شہر کے اندر جلسوں میں جانا،

اپنے گھر پر میٹنگ کرنا جاری رہا۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی برابر ہوتا رہا۔ ان کو لگن تھی کہ دونوں زیر تصنیف کتابیں کسی طرح مکمل ہو جائیں۔ مگر اب لکھنے کا کام چند گھنٹے سے زیادہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ بہت تیز لکھتے تھے۔ مگر صرف کتابوں ہی کا کام تو نہ تھا۔ ریڈیو کی تقریریں بھی لکھتے، خطوط کے جواب دیتے، کتنی ہی مقامی کمیٹیوں کے کام تھے۔ کئی تعلیمی اداروں کے کاغذات وغیرہ دیکھنا سبھی کچھ تو ہوتا تھا۔

چہرہ روز بروز مرجھاتا جا رہا تھا، راتوں کی نیند بہت کم ہو گئی تھی غذا برائے نام رہ گئی تھی۔ جسم میں سکت نہ رہی تھی۔ مگر عزم و حوصلہ قائم تھا۔ چہل قدمی اب بھی ہوتی رہتی۔ میرے ہاں، زیدی صاحب کے ہاں اور کبھی کبھی مجیب صاحب کے ہاں ملنے جاتے رہتے۔ جو آتا اس سے اسی خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ ملتے۔ لوگوں کی خوشی اور غم میں شرکت کرتے مزاج پرسی کو جاتے۔ اس عرصے میں دو بار ان کی سنجھلی بیٹی ذکیہ ظہیر آ کر ان سے مل گئی۔ پانچ چھ مہینے چھوٹی لڑکی سیدہ اپنے شوہر ڈاکٹر حمید اور بچے کے ساتھ ان کے پاس آ کر رہی۔ بیٹیوں سے انہیں بے پناہ محبت تھی مگر کبھی اپنی بیماری میں انہیں نہ بلاتے تھے کہ اپنی وجہ سے بیٹیوں اور دامادوں کو تکلیف دینا گوارا نہ تھا۔ مگر جب یہ لوگ واپس گئیں تو ان کے دل پر سخت صدمہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ جب تک لوگ رہتے ان پر محبت کی برکھا ہوتی رہتی۔ ہر طرح خاطر و خیال کرتے اور ذرا بھی اپنی بیماری یا پریشانیوں کا سایہ ان پر نہ پڑنے دیتے۔

کبھی کبھار ایسا ہوا کہ ان کی بیماری کی حالت میں، آرام کے وقت ہم میں سے کسی نے، مزاج پرسی کرنے والوں سے معذرت کر لی اور انہیں اس کا

پتہ چل گیا تو بہت ناراض ہوتے اور پھر اصرار کرکے اُسے بلاتے باتیں کرتے۔ دلداری کرتے، ایک عزیزہ نے ان سے برسبیل تذکرہ کہا "میں آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ مگر مجھے آپ تک آنے نہیں دیا گیا۔" بہت خفا ہوئے اور کہا "آپ کا جب جی چاہے سیدھی میرے کمرے میں چلی آئیے۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کو روک سکے۔"

شاید نومبر کا ذکر تھا کہ طبیعت پھر خراب ہوئی۔ میں زیادہ تر ان کے پاس رہتی تھی۔ ایک بار جب کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا، بہت تامل کے ساتھ کہا۔ "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں سن سکے گی؟" میں نے عرض کیا۔ "آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں ضرور کہئے۔" میں تو چاہتی تھی کہ وہ کبھی تو دل کا حال کسی سے کہیں۔ آہستہ سے کہا "جب وقت آئے گا تو —— تو بچیوں کی مدد کرے گی نا!" میں نے زہر غم کو آنسوؤں کے ساتھ پی لیا...... "بھائی جان..... میری جان آپ کے اور بچیوں کے لئے حاضر ہے۔" اور پھر ہم دونوں ہی بولنے کے قابل نہ رہے۔

۱۶ر دسمبر ۱۷ء کی دوپہر تک باغ میں بیٹھے اپنی کتاب کا آخری باب مکمل کرتے رہے۔ شام کو آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس آنکھیں دکھانے گئے۔ جس نے کہا آپ کی آنکھوں میں پانی اترنا شروع ہو گیا ہے۔ واپسی پر دہلی پبلک لائبریری سے پڑھنے کے لئے کتابیں لیں۔ راستے میں زہرا سے کہا—"آج رات تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ضرور پاپا—" وہ تو اس عرصے میں ان کا سایہ بن گئی تھی۔ دن رات انہیں کی فکر رہتی تھی۔

اُسی رات کو آخری سخت دورا پڑا۔ رات ہی میں ہولی فیملی ہاسپٹل لے جائے گئے۔ اور ہر ممکن تدبیر ان کی جان بچانے کے لئے کی جانے لگی....

ڈاکٹر پریشان تھے۔ تیمار دار ہراساں، چاہنے والے نیم جان، دوست احباب بے قرار، مزاج پرسی کرنے والوں کا اسپتال میں دن رات ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ تین راتیں اور ڈھائی دن سخت تکلیف میں گذرے پہلے دن اور اگلی رات اور اس سے اگلی صبح وہ ہم لوگوں سے ایک دو باتیں کر لیتے، باتیں سن لیتے تھے۔ کبھی کبھی مزاج پرسی کرنے والے بھی کمرے میں آکر دو منٹ کو مل جاتے۔ زہرا اور بلقیس کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا چاہتے۔ عابد صاحب نے بلیک آؤٹ ختم ہونے کی خبر سنائی، صلح کی خبر دی، ایک حزیں سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سن لیا۔ مگر پھر کمزوری بڑھتی گئی اور دل کی حالت نازک تر ہوتی گئی۔ ڈاکٹر وگ جو بار بار ان کو دیکھنے آتے تھے انھوں نے ڈاکٹر ماتھر سے کہا "ہر قیمت پر سیدین کو بچانا ہے" تو ڈاکٹر ماتھر کسی سے یہ کہتے سنے گئے۔ "یہ ڈاکٹر کی نہیں، دوست کی آواز ہے" ڈاکٹر مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن میرے بھائی جان بہت پرسکون تھے.... دوسرے دن سے انھوں نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ شاید اس کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ اور آخر کے چوبیس گھنٹے میں تو ان کو پوری طرح یہ آگاہی ہو گئی تھی کہ اب قطرہ دریا میں جذب ہونے والا ہے! ایسا لگتا جیسے اب انھوں نے اپنا دل دنیا سے اٹھا لیا ہے۔ ہم لاکھ ضبط کر رہے تھے ان کے سامنے، مگر کیا ہماری بیقراری ان سے چھپی تھی؟ مگر اب وہ مسکرا کر کوئی فقرہ چست کر کے ڈھارس نہ بندھاتے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر آنکھوں میں پیار کی وہ چمک نہ آتی تھی جس کے ہم زندگی بھر عادی رہے تھے۔ ہونٹوں پر وہ دل کش مسکراہٹ نہیں کھیلتی تھی۔ جو ان کی شخصیت کا جز و تھی۔ چہرے پر درد و محبت کی نہ

ملی جلی کیفیت جو پہلے کی . بیماریوں میں اپنے پیاروں کو دیکھ کر ابھرتی تھی اب اس کا بھی پتہ نہ تھا ۔ کسی چیز کے پینے پر اصرار کیا جاتا تو ذرا سی ناگواری سے صرف "نو" ان کے منھ سے نکلتا ۔ گُردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا ۔ اور دل چھوڑ رہا تھا مگر وہ پوری طرح ہوش وحواس میں تھے لیکن دنیا سے دل اٹھا لیا تھا ۔ پیاروں کی محبت کی جگہ اب اپنے رب کی محبت میں ڈوب چکے تھے ۔ خالق سے لَو لگا چکے تھے ......

اور پھر — ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو تین بجے دن کے قریب انھوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ......

جامعہ نگر کی بستی میں کہرام مچ گیا ۔ ریڈیو نے خبر دی تو سارے شہر اور سارے ملک میں جہاں جہاں ان کے چاہنے والے تھے بے قرار ہو گئے ..... سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کا تانتا اپنی اس محبوب ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لگا ہوا تھا ۔ ہر آنکھ رو رہی تھی، ہر دل تڑپ رہا تھا ۔ ہر زبان ان کی تعریف میں لال تھی ۔ مگر آج وہ سب سے بے نیاز تھے ۔ اپنی بیٹیوں ، بھانجیوں ، اپنے عاشق زار بھائی اور دوست عابد ، اپنی بدنصیب جاں نثار بہن مصداق — ہر ایک کی تڑپ اور بے قراری سے بے پروا تھے ۔ وہ جو ہم سب کے ذرا سے دکھ ذرا سی پریشانی پر تڑپ اٹھتے تھے آج خاموش لیٹے تھے اور ۲۰ر دسمبر کو دن کے بارہ بجے خدا کی یہ امانت زمین کو سونپ دی گئی ۔

ان کا آخری دیدار جن ہزاروں لوگوں نے کیا ہے وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں کہ موت اس پیارے چہرے کا حُسن ، اس کی نرمی ، اس کا سکون نہیں چھین سکی ۔ وہ اب بھی اتنا ہی پاکیزہ اور دلکش تھا ۔

سچے مسلمان کے چہرے کا تقدس اس سے جھلک رہا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی.....

سچ کہا تھا شاعرِ مشرق نے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب است

خواجہ غلام السیدین

پیدائش ـــــــــ پانی پت ـــــــ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۴ء

تعلیمی کیفیت :-

بی۔اے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔فرسٹ کلاس فرسٹ ۱۹۲۳ء

ڈپلوما ان ایجوکیشن (امتیاز کے ساتھ) لیڈز یونیورسٹی انگلستان ۱۹۲۴ء

ایم۔ایڈ۔لیڈز یونیورسٹی انگلستان ۱۹۲۵ء

ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۶۲ء

زبانوں کا علم :-

اردو ، انگریزی ، فارسی ۔عربی ۔ فرانسیسی

خصوصی مہارت اور دلچسپیاں :-

نظری اور عملی فنِ تعلیم ۔سماجی ، تہذیبی اور اخلاقی مسائل ۔اسلامی تعلیمات۔

تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریاں :-

پروفیسر اور پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء تک۔

ڈائرکٹر ایجوکیشن ریاست جموں اور کشمیر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء تک۔

ایجوکیشنل اڈوائزر ریاست رام پور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک۔

ایجوکیشنل اڈوائزر ریاست بمبئی (جو آگے چل کر مہاراشٹرا اور گجرات کی ریاستوں میں تقسیم ہوئی) ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک

پہلے جائنٹ سکریٹری، پھر سکریٹری اور ایجوکیشنل اڈوائزر حکومت ہند ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک۔

مشیر تعلیم ریاست جموں اور کشمیر ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۲ء تک۔

وزٹنگ پروفیسر۔ کولمبیا یونیورسٹی۔ نیویارک ۱۹۵۸ء۔

وزٹنگ پروفیسر۔ وس کانسن یونیورسٹی (امریکہ) ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۳ء تک

فیلو۔ ایسٹ ویسٹ سنٹر۔ ہوائی (امریکہ) ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک

وزٹنگ پروفیسر سٹین فورڈ یونیورسٹی (امریکہ) ۱۹۶۴ء میں گئے۔

ممبر ایجوکیشن کمیشن حکومت ہند ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک۔

ڈائرکٹر ایشین انسٹی ٹیوٹ ایجوکیشنل پلیننگ اڈمنسٹریشن ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء تک

حکومت ہند کے مختلف تعلیمی اداروں اور کمیشنوں کے ممبر اور صدر رہے۔

یونسکو سے تعلق :-

پانچ مرتبہ یونسکو کی جنرل کانفرنس میں ہندوستانی ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ اسکے علاوہ یونسکو کی متعدد کمیٹیوں اور کمیشنوں کے ممبر اور صدر رہے۔

بین الاقوامی اور غیر ملکی اداروں کی خدمات :-

بین الاقوامی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے صدر، دس بارہ سال تک رہے۔

ورلڈ بنک کے مشیر کی حیثیت سے تعلیمی مشن پر عراق بھیجے گئے ۱۹۵۱ء۔

سوڈان میں تعلیمی تنظیم نو کے بین الاقوامی کمیشن کے صدر ۱۹۵۵ء

لندن یونیورسٹی میں ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر لیکچرز ۱۹۵۴ء

متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ راک فیلر فاؤنڈیشن کی

دعوت پر امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں لکچر زدیے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں ساکس میموریل لکچرز۔ ۱۹۵۸ء

اہم تصانیف (انگریزی):۔

۱۔ "دی اسکول آف دی فیوچر" دی انڈین پریس لمیٹڈ۔ ۱۹۳۵ء

۲۔ "دی اکٹوٹی اسکول" انڈین اڈیشن آف فیرز بک۔ کتابستان الہ آباد ۱۹۳۶ء

۳۔ "ایجوکیشن فار انٹرنیشنل انڈرسٹینڈنگ" ہند کتاب لمیٹڈ۔ ۱۹۴۷ء

۴۔ "اقبال ایجوکیشن فلاسفی" عرفات پبلی کیشن لاہور۔ ۱۹۳۸ء

دوسرا اڈیشن ۱۹۵۴ء

۵۔ "پرابلم آف ایجوکیشنل ری کنسٹرکشن" ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی ۱۹۵۰ء

دوسرا اڈیشن ۱۹۶۲ء

۶۔ "ایجوکیشن، کلچر اینڈ سوشل آرڈر" ایشیا پبلیکیشن۔ ۱۹۵۲ء

دوسرا اڈیشن ۱۹۶۳ء

۷۔ "آزاد کنٹری ہیوشن ٹو ایجوکیشن" (ساپاجی میموریل لکچرز)

۸۔ "اے نیشنل سروس اسکیم فار انڈیا" ۱۹۵۹ء

۹۔ "ایجوکیشن اینڈ دی آرٹ آف لونگ" (کولمبیا ٹیچرز کالج یونیورسٹی)

۱۰۔ "دی فیتھ آف این ایجوکیشنسٹ" ایشیا پبلی کیشن ۱۹۶۵ء

۱۱۔ "دی ہیومینسٹ ٹریڈیشن ان انڈین ایجوکیشنل تھاٹ"

ایشیا پبلی کیشن ۱۹۶۶ء

۱۲۔ "یونیورسٹیز اینڈ دی لائف آف دی مائنڈ" ایشیا پبلیکیشن ۱۹۶۵ء

۱۳۔ دی ایجوکیشنل سسٹم آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ ۱۹۴۳ء

اردو کتب:۔

۱۔ "اصول تعلیم" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۴۹ء

۲۔ "روح تہذیب" مکتبۂ جامعہ (متعدد بار)

۳۔ "علی گڑھ کی تعلیمی تحریک"

۴۔ "قومی سیرت کی تشکیل"

۵۔ "شہید وفا" نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۴ء

۶۔ "آندھی میں چراغ" انڈین اکیڈمی ۱۹۶۳ء (ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۶۴ء)

۷۔ "ذہن انسانی کا مسلسل ارتقا" نظام لکچرز۔ دہلی یونیورسٹی

۸۔ "زبان، زندگی، اور تعلیم" انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۷۱ء

۹۔ "داستانِ اشک و خون" مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی ۱۹۷۲ء

اعزاز و ایوارڈ:۔

پدما بھوشن

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ۔

ساٹھویں سالگرہ پر کمیمورشین والیوم" صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔

کولمبیا یونیورسٹی کے ٹیچرز کالج کی طرف سے تعلیم کے میدان میں ممتاز خدمات کے اعتراف میں طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔



خواجہ غلام السیدین   صالحہ عابد حسین